رہ نوردِ شوق

بشریٰ اعجاز

رہ نوردِ شوق

بُشریٰ اعجاز

1000 صفحات پر مشتمل کتاب ہونے کی وجہ سے اس کی پی-ڈی-ایف کو 2 حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ یہ دوسرا حصہ ہے۔ پہلا حصہ اگلے صفحہ پر دی گئی ویب سائیٹ یا اینڈرائیڈ اپلیکیشن یا وٹس ایپ پر آپ ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔

شام کے بعد پبلی کیشنز ۱۳-اے بہاول پور روڈ-لاہور

7237592 - 7310172 Fax: 7310115

www.QuranTafseer.net

الحمدللہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو ویڈیو بیانات کو آپکی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراسن سکیں۔ ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ ایپلیکیشن بھی موجود ہے

آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ ایپلیکیشن سرچ کر کے انسٹال کر سکتے ہیں۔

اس ویب سائیٹ اور ایپلیکیشن سے آپ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

1- مفسّر، مترجّم ومفکّرِ قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30 پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30 پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔ 2- مشکوۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔ 3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہی آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہی پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیوز دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ 4- اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبد الباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیوز سن سکتے ہیں۔ 5- حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6- ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔ 7- پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8- اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیوز وڈیوز۔ 9- سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریبا تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیوز فورا ایپلیکیشن اور ویب سائیٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔ آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائیٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میسج کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ 03235205255

الفلاح

عام خانقاہی نظام کی طرح' یہاں چندوں' ہدیوں اور تحائف کا رواج نہیں ہے بلکہ یہاں انفاق فی سبیل اللہ کو منظم کیا گیا ہے۔ دارالعرفان میں جمع ہونے والے فنڈز براہ راست عوامی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتے ہیں۔ لنگر کا کھانا۔ حضرت جی کی جیب سے پکتا ہے۔ عام دنوں میں بھی۔ اجتماع میں بھی۔ اور رمضان کے دنوں میں بھی۔ جب اعتکاف بیٹھنے والوں کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صقارہ نظام تعلیم کے تحت چلنے والے اداروں کی مالی امداد بھی حضرت جی خود فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ادارے چونکہ سراسر فلاحی مقصد کے لئے بنائے گئے ہیں ان کی فیسیں برائے نام ہیں تو اسٹاف اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کے لئے انہیں مالی امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں میری صقارہ اکیڈمی دارالعرفان کی گرلز سیکشن کی پرنسپل مس ثمینہ اعوان سے بات ہوئی۔ تو انہوں نے بتایا کہ اسکول فنڈز کا بڑا پرابلم ہے۔ تین ساڑے تین سو بچوں کے باوجود سکول بمشکل اسٹاف کی تنخواہوں کے سلسلہ میں خود کفیل ہو پاتا ہے۔ باقی تمام

ضروریات کے معاملے میں ہمیں حضرت جی سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور انہوں نے بتایا کہ میں نے حضرت جی سے اس دفعہ دس روپے فی بچہ فیس بڑھانے کی بات کی، اور کہا کہ اس طرح بچوں کی جیب پر بھی اثر نہیں پڑے گا۔ اور کچھ نہ کچھ متفرقات کی مد میں بھی نکل آئے گا' تو انہوں نے سختی سے یہ کہہ کر میری بات رد کر دی کہ اگر ہم نے ایک روپیہ بھی فیس بڑھائی تو بچوں کے والدین اس کے متحمل نہ ہو سکیں گے، اس لئے کہ لوگ پہلے ہی بمشکل بچوں کے اخراجات پورے کر رہے ہیں۔ نتیجے کے طور پر یہ ہوگا کہ وہ بچوں کا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے انہیں سکول سے نکلوالیں گے۔ اور یہ میں افورڈ نہیں کر سکتا' آپ فالتو اخراجات مجھ سے لیں اور اپنا کام چلائیں۔

اس کے علاوہ چترال اور کالاش میں انہوں نے الفلاح کے تحت بہت کام کیا ہے۔ چونکہ چترال میں آغا خانیوں نے فلاح کی آڑ میں 'لوگوں کو گمراہ کرنے کے کئی منصوبے چلا رکھے تھے' تاکہ عام ذہن ان کے مذہبی افکار قبول کر کے ان کی طرف مائل ہو جائے اور اس میں وہ بہت محنت بھی کر رہے تھے۔ جب حضرت جی کو اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے چترال اور اسکے قریب دوسرے علاقوں میں 'لوگوں کی فلاح کا کام تیزی سے شروع کر دیا۔ جس میں میڈیکل کیمپ کا قیام۔ مساجد کی تعمیر۔ سکول کا قیام' نقد امداد۔ مذہبی اور تدریسی کتب کی فراہمی۔ اجناس کی ترسیل و تقسیم گرم کپڑوں کے عطیات' ادویات اور دیگر اشیائے ضروریہ کی تقسیم شامل ہے۔ جس سے رفاہ عامہ کا اسلامی تصور عام لوگوں کے ذہن میں بیدار ہو چکا ہے۔ اسکے علاوہ اپنے علاقہ میں حضرت جی نے کئی مقامات پر پینے کے پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا ہے جس سے نہ صرف وہاں کے لوگوں کی زندگی آسان ہوئی ہے بلکہ انہیں اس ازلی مصیبت سے بھی چھٹکارا مل گیا ہے جو گندے پانی کے جوہڑوں اور تالابوں سے پینے کا

پانی حاصل کرنے کی صورت میں ان پر صدیوں سے مسلط تھی۔ جہاں ایک ہی گھاٹ پر جانور اور انسان پانی پیتے تھے' وہاں صاف اور تازہ پانی کی ٹینکیاں اور گھر گھر نلکوں کے ذریعے سے فراہمی آب اک ایسا خواب تھا' جسے وہاں رہنے والوں کی آنکھیں پوری طرح پلکوں پر اتار بھی نہیں سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کی دشوار زندگی کو آسان بنانے کے لئے وہاں سڑکیں بنوائی ہیں۔

بینکنگ سسٹم

1۔ تنظیم الاخوان کے اغراض و مقاصد اور منشور کے پیش نظر اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ اسلام کی روشنی میں اپنے نظام ہائے زندگی مرتب کرے اور اس کی کچھ نہ کچھ عملی شکل معاشرے کو پیش کرے۔ معاشی پہلو کی سب سے بڑی لعنت سودی نظام ہے۔ اس امر کی کوشش کی گئی کہ تنظیم ایک اسلامی بینک قائم کرے۔ جس کے لئے امیر تنظیم نے ایک کمیٹی قائم کی۔ ایک سال کی تگ ودو کے بعد کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ مروجہ نظام میں بینک کو 40 فی صد رقم سٹیٹ بینک کے زیر استعمال چھوڑنی ہو گی جو مروجہ سودی نظام کے مطابق استعمال ہو گی۔ لہذا اس حکومتی رکاوٹ کی وجہ سے یہ کاوش ملتوی کرنی پڑی اور اس بات پر اتفاق ہوا کہ ایک Investment-system وضع کیا جائے جو نفع نقصان کی بنیاد پر ہو۔ آغاز میں یہ سہولت صرف تنظیم کے ساتھیوں تک دی گئی ہے۔ جس کا دائرہ کار بعد میں وسیع کیا جا سکتا ہے' آگے چل کر ایک اسلامی بینک قائم کرنے کی صورت میں یہ پراجیکٹس اس بینک کا سرمایہ شراکت کی بنیاد پر استعمال کرنے کے لئے ایک مضبوط

بنیاد فراہم کریں گے۔

2۔ کیوی (CIWI) سسٹم :۔ انویسٹمنٹ سسٹم کا نام Com-)CIWI bined Investment without interest) رکھا گیا۔ ابتدا میں 89 سے 92 تک یہ کام ایڈہاک طور پر مختلف ساتھی چلاتے رہے مگر 92 میں امیر تنظیم نے اس کام کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت چلانے کے لئے ادارہ قائم کیا۔ چونکہ ابتدا میں فنڈز بہت محدود تھے وہ کوئی ایسا پراجیکٹ بنانے میں قاصر رہے، جو باقاعدہ Feasibility بنانے اور مطلوبہ فنڈز فراہم کرنے کے بعد شروع کیا جاتا۔ لہذا میسر سرمایہ کیساتھ راولپنڈی میں ایک ڈیری۔ لائیو سٹاک فارم سے اس کا آغاز کیا گیا۔ جو آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ دوسرا ڈیری لائیو سٹاک فارم سیالکوٹ میں قائم کیا گیا۔ دو تین سال کی بھرپور کوشش کے باوجود مختلف وجوہات کی بنا پر اس میں بریک تھرو نہ ہو سکا۔ راولپنڈی۔ اسلام آباد میں لگاتار دو تین برس تک خالص دودھ مہیا کیا گیا۔ اس کیساتھ بیف کی برآمد کے لئے منصوبہ بندی کی گئی۔ اس سلسلہ میں (National Agriculture Research council)NARC کے ساتھ بڑا تعاون رہا۔ انٹرنیشنل گریڈ کے مطابق گائے کے چھوٹے بچھڑے تین چار ماہ کی سپیشل Fattening کے بعد تیار کرنے میں مہارت حاصل کی گئی۔ مگر ان کی برآمد کے لئے حکومتی رکاوٹیں عبور نہ کر سکے۔ اسی دوران NARC کے لئے کئی سیمینار اور سپیشل پروگرام بھی چلائے گئے۔ جن میں مختلف ممالک کے کمرشل اٹیچی نے شمولیت کی۔ فارم انتظامیہ نے سعودی عرب، کویت، ابوظہبی، مسقط و اومان میں پاکستانی سفارتخانوں کے ذریعے برآمد کے لئے مفید رابطے کئے۔ مسقط کی طرف سے Joint-Venture کی خواہش NARC کی ریڈ ٹیپزم کی نذر ہو گئی۔ مجھے کہنے میں ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہو گی کہ ہمارے نیشنل لیول کے ادارے کسان کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ اور ان کے ہاں کوئی سسٹم نہیں

ہے۔ ادارے کے Head کے بدلنے کیساتھ پہلے سارے پراجیکٹ ختم ہو جاتے ہیں اور نئے آنے والے کیساتھ نئے پراجیکٹ شروع ہو جاتے ہیں۔ ہماری کاوش سے میٹ پروڈیوسرز Association قائم کی گئی۔ مگر حکومتی اداروں کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ ساری کاوش ٹھپ ہو گئی۔ بالآخر 94 کے آخر میں اس ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کے لئے متبادل پراجیکٹس کی طرف توجہ دی گئی۔ جن کا تعلق ٹریڈنگ سے تھا۔ 95 کے شروع میں پانچ چھ نوع کے پراجیکٹس پر کام شروع ہو گیا جو آخر سال تک کافی بہتر پوزیشن میں چلے گئے 95 سے 99 تک ان پراجیکٹس سے شرح منافع 24% سے 32% کے درمیان رہی۔ یہ منافع ہر چھ ماہ کے بعد انویسٹرز کو ادا کر دیا جاتا ہے۔ بیواؤں اور حاجتمندوں کو ماہانہ منافع ادا کر دیا جاتا ہے۔ جو چھ ماہ بعد حسابات کرنے پر ایڈجسٹ کر لیا جاتا ہے کم سے کم ایک ہزار روپے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے اوپر کوئی پابندی نہیں۔ سارا کام باہمی اعتماد پر چلتا ہے۔ اور اب یہ ایک فعال نظام کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ انویسٹمنٹ اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اس کے ساتھ مزید پراجیکٹس کی صورت میں Cope up کرنا محال ہو رہا ہے۔ اس وقت کل چھوٹے بڑے پراجیکٹس سات ہیں۔ یہ پراجیکٹ سب تنظیم کے ساتھی چلا رہے ہیں جہاں ساتھی شراکت کی بنیاد پر اپنا روپیہ لگا کر حلال منافع کما رہے ہیں وہاں ساتھیوں کے لئے یہ معقول روزگار بھی فراہم کرتا ہے۔ بہت کم دیکھ بھال کے باوجود نتائج بہت اچھے ہیں۔ اس کی وجہ دیانتداری اور وہ جذبہ ہے جو احباب تنظیم کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان پراجیکٹس کو Vertically اور laterally کیا جا رہا ہے اور اب یہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ آج اگر حکومتی رکاوٹیں دور ہو جائیں اور اسلامی بینک کھولا جائے تو اسکا دو سے تین روپیہ یہ پراجیکٹس استعمال کر سکتے ہیں۔ پورے ملک میں اس نظام کو رائج کیا جا سکتا ہے اور موجودہ بینکنگ سسٹم اس پر آسانی سے لایا جا سکتا ہے بشرطیکہ ریکوری کے لئے ایک مربوط لیگل بیک اپ دی

جائے۔اس طرح نہ صرف اللہ کی خوشنودی حاصل ہو گی بلکہ عام آدمی کی معاشی حالت بہت بہتر ہو جائے گی۔

کرنل بشیر احمد چوہدری

بابِ قلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد الله الذى لا اله الا هو والصلوة والسلام على من فاق على العالمين سيد المرسلين و خاتم النبين وعلى أصحابه اجمعين واهل بيته الطاهرين.

چشمۂ ہدایت

قرآن کریم بنی نوع انسان کی ہدایت کا ابدی منبع ہے۔ بھٹکتی انسانیت قیامت تک اس چشمۂ ہدایت سے سیراب ہو کر راہِ حق پر گامزن ہو سکتی ہے اور اسی کے پیغامِ ھدایت میں انسان کی دنیوی سعادت اور اخروی فلاح مضمر ہے۔ قرآن کے پیغامِ ہدایت کو نزولِ قرآن سے لے کر آج تک علماء نے واضح کرنے کی سعی پیہم کی اور یوں یہ سلسلہ وضاحت اور تفسیر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ جاری اور ساری رہے گا اور قرآنی ھدایت کے مختلف گوشوں کی وضاحت اور تفسیر ہوتی رہے گی۔ اسی کاوش کے نتیجہ میں آج تک قرآن کریم کی تفاسیر مختلف زمانوں میں، مختلف اندازِ فکر اور مختلف پیرایوں میں معرض وجود میں آچکی ہیں' ہر تفسیر میں مفسر نے اپنی بساط کے مطابق اپنے نکتۂ نظر کی روشنی میں قرآنِ کریم کی ہدایت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی کوئی کاوش بھی' چاہے کتنی ہی تگ ودو اور محنت و جانفشانی سے کیوں نہ کی جائے' کامل اور حرفِ آخر نہیں ہو سکتی اور یوں انسانی کوشش کے تسلسل میں خوب سے خوب تر کا معرضِ وجود میں آنا ایک فطری امر ہے۔

تفسیر ''اسرار التنزیل'' اسی سلسلہ کی ایک مثالی کاوش ہے۔ تفسیر کا عنوان خود تفسیر کی جامعیت اور اس کے مضامین محتویات (Contents) کے تنوع کی نشاندھی کرتا ہے۔ قلتِ فرصت اور کثرتِ مشاغل کی وجہ سے اگر چہ مجھے پورے مسودۂ تفسیر پر نظر ڈالنے کا موقع نہیں ملا لیکن جتنا کچھ بھی دیکھ سکا اس کی روشنی میں بے تکلف کہا جا

سکتا ہے کہ فاضل مؤلف نے بڑی محنت اور کاوش سے یہ خدمت سر انجام دی اور مضامین قرآن کریم پر موضوعاتی انداز میں سیر حاصل بحث کی یوں تو عام تفسیروں میں بھی قرآنی موضوعات پر تفصیلی بحثیں موجود ہیں لیکن فاضل مؤلف نے اس تفسیر میں کمر ہمت باندھ کر اس میدان میں قدم رکھا اور تحقیق کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی' میری نظر میں یہ تفسیر اپنے رنگ کی پہلی اردو تفسیر ہے جس میں قرآن کے عام مفہوم کے ساتھ ساتھ قرآنی موضوعات کی تفسیر نہایت سلیقے اور سہل اسلوب میں پیش کی گئی۔ تفسیر کے مختلف مقامات پڑھتے وقت یوں محسوس ہوا کہ کتاب الٰہی مجھ سے ہم کلام ہو کر میرے دل و دماغ میں ایک نئی فکر' نیا عزم' نیا جذبہ اور ایک نئی روح پھونک رہی ہے' مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے اندر ایک خلا ہے۔ اور تفسیر کا ایک ایک لفظ اس خلا کو پورا کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اور ہر جملہ میری روح کی تشنگی کو سیراب کر رہا ہے۔ یوں تو ہر تفسیر قرآنی آیات میں مذکورہ احکام' واقعات رموز اور اسرار کو بیان کرنے کی کوشش ہوتی ہے لیکن کسی تفسیر کی خوبی یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی روح کو آخرت کی سوچ دے دے اور اس کی قلبی کیفیات میں ہیجان پیدا کر دے اور یوں تفسیر پڑھنے والے کے دل پر قرآن اترنا شروع ہو جائے'

"اسرار التنزیل' میں قرآن کریم کی تشریح و تفسیر میں اسی اسلوب کو اختیار کیا گیا' تشریح کرتے وقت عام روایتی تفسیری انداز سے ہٹ کر معلومات کے ساتھ ساتھ قلبی کیفیات پیدا کرنے پر خاص توجہ دی گئی' تفسیر میں قرآن کریم کو ایک تحریک کی صورت میں پیش کیا گیا ایک ایسی تحریک جو نزول سے لے کر قیامت تک بنی نوع انسان کے مردہ دلوں میں نئی روح پھونکتی ہے' تفسیر کے مطالعہ سے قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ قرآنی ہدایت دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے اور یوں پڑھنے والے کے دل و دماغ میں قرآن ایک تحریک پیدا کرتا ہے۔

مولانا محمد اکرم اعوان امیر تنظیم الاخوان پاکستان کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں' آپ اور آپ کے رفقائے کار کی شب و روزان تھک' بے لوث اور للہیت سے لبریز کوششوں کا واحد مقصد یہ ہے کہ گمراہی میں بھٹکتی انسانیت کو کتاب

الٰہی کی ھدایت سے راہِ راست پر گامزن کیا جائے، ان کے مردہ دلوں میں اس ہدایت ربانی سے ایک تحریک پیدا کی جائے 'ایک ایسی تحریک جس کا محور کتابِ الٰہی ہو اور جو بھٹکتی انسانیت کے مردہ دلوں کو حیاتِ جاوداں بخشتے ہوئے ان کو ذاتِ الٰہی سے ملا دے اور یوں ان کی قلبی کیفیات کی آب یاری ہوتی رہے۔ زیرِ نظر تفسیر اس مقصد کی طرف ایک بہت بڑا اقدم ہے۔ تفسیر کی روشنی میں بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ فاضل مفسر اس مقصد کے حصول میں کامیاب رہا۔ تفسیر "اسرار التنزیل" میں اردو اور انگریزی ترجمہ کی سلاست کے ساتھ ساتھ قرآنی مضامین کا منطقی تسلسل اور افکار کا ایسا ربط پیش کیا گیا کہ تفسیر پڑھنے والے کو ہر دوسرا مضمون پہلے کی تکمیل اور ہر دوسری پیش کردہ فکر پہلی فکر کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ مضامین میں بے پناہ جامعیت ہے۔ قرآن کے پیش کردہ تاریخی حقائق کو غیر مبہم پیرائے میں پیش کرتے ہوئے ان واقعات کے پس منظر میں عبرت اور سبق آموزی کے پہلو کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ تفسیر میں صاحب قرآن اور آپؐ کے جانثار صحابہ کرامؓ کی شان اور محبت کو مرکزی حیثیت دی گئی۔ شرعی احکام کی وضاحت کے ساتھ ساتھ تزکیہ نفس 'روح' سلوک و تصوف پر سیر حاصل بحث کی گئی اور بتایا گیا کہ شریعت اور تصوف ایک دوسرے کے مقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام (اوامر و نواھی) کی پوری پابندی اور اطاعت کا نام شریعت ہے 'انتہائی خلوص' نیک نیتی 'خوفِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی سچی محبت کی روح سے اپنے اعمال کو بھر دینے کا نام تصوف ہے۔ شریعت اور تصوف دونوں اسلام کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسلام کا تعلق ظاہر سے بھی ہے اور باطن سے بھی۔ احکامِ الٰہی جن کا تعلق ہماری ظاہری عبادات اور معاملات سے ہے اس کی مکمل تفصیل شریعت ہے 'باطن یعنی دل و دماغ کا تقویٰ جس کا تعلق ذکرِ قلبی اور فکرِ حق سے ہے اس کی مکمل تفصیل تصوف ہے۔ شریعت بغیر تصوف کے اور تصوف بغیر شریعت کے نامکمل ہے۔ شریعت اور تصوف دونوں مل کر اسلام کی عمارت کو مکمل کرتے ہیں اور انسان ان دونوں کو ساتھ لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکتا ہے جو کہ اس کی تخلیق اور عبادات کا اصل مقصد ہے۔ شریعت ایک دائرہ کا محیط ہے جو ہماری

زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس دائرہ شریعت کا مرکز رضائے حق جو کہ تصوف کا منتہی اور مقصود ہے 'شریعت اور تصوف دونوں پر کاربند رہ کر انسان رضائے حق حاصل کر سکتا ہے۔ صاحبِ قرآن نے اپنے جانثار صحابہ کرام کی تربیت قرآنی هدایت سے اسی انداز میں کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے رضائے حق کی قرآنی سند حاصل کرلی۔ "رضی اللہ عنهم و رضوٰعنه" یہ رضائے حق ہر مسلمان کو حاصل ہو سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کا پابند رہتے ہوئے اپنے باطن کو اللہ تعالیٰ کے خوف اور تقویٰ سے بھر دے۔ "ذلك لمن خشى ربه"

تفسیر 'اسرار التنزیل' اسی پیغام کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ تفسیر کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اس کے مختلف گوشوں پر زیادہ تفصیل سے بحث کی جاتی لیکن پھر بھی عجلت میں جن اہم نکات کی طرف اشارہ کیا گیا اس سے تفسیر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فاضل مؤلف مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کی ان مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت بخشے اور قارئین کو اس چشمۂ فیض سے سیراب کرتے ہوئے قرآنی پیغام کو ان کے دلوں میں اتار دے اور یوں ان دلوں میں قرآن کی تحریک پیدا ہو جس کے لیے یہ تفسیر لکھی گئی۔ آمین برحم اللہ عبدا یقول آمین۔

ڈاکٹر ضیاء الحق یوسف زئی

صدر شعبہ عربی
نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز

تبدیلی نظام.........ضرورت اور مراد

روزنامہ اساس ۱۸ فروری ۱۹۹۹ء

محمد اکرم اعوان

برصغیر پر مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو راجاؤں کا قبضہ تھا متعدد ریاستیں تھیں اور طاقت کی حکمرانی تھی۔ جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے تو مسلمانوں کی آمد سے قبل تو یہاں کسی کو کپڑے سینے اور لباس بنانے تک کی خبر نہ تھی یہ مسلمان تھے جو برصغیر میں آئے تو اپنے ساتھ جدید تہذیب بھی لائے وہ تہذیب جو نہ صرف نئی تھی بلکہ دائمی اور ابدی تھی گویا اسکے اصول ایسے لازوال تھے کہ زمانے کی روش انہیں کبھی گہنا نہیں سکے گی وہ کبھی فرسودہ اور قدیم نہ ہوں گے۔ ان میں معاشرت کا ایسا نظام ہے کہ ملک کا ہر شہری ملکی وسائل سے مستفید ہو سکے' نظام عدل ایسا کہ شاہ و گدا قانون کی نظر میں ایک ہوں فوری اور حقیقی انصاف جو مومن و کافر ہر ایک کو عدل فراہم کرے برصغیر جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا مسلمان اپنے ساتھ ایسا تعلیمی نظام لائے جس نے لاکھوں دلوں کو روشن اور سینوں کو منور کر دیا۔ مسلمانوں کی آمد سے برصغیر اسلامی فلاحی ریاست بنا لوگ علم سے آشنا ہو کر حق سے آگاہ ہوئے اور جدید

تہذیب نے جنم لیا جو عادلانہ بھی فلاحی اور غریب پرور تھی اسلئے کہ اسلامی تھی اور اسقدر مضبوط بنیادوں پر استوار تھی کہ اگر درمیان میں ایسے لوگ بھی آئے جو نام سے تو مسلمان تھے مگر کردار کے اعتبار سے بہت سی کمزوریوں کا شکار۔ مگر اسلامی تہذیب کا کچھ نہ بگڑا اور مسلسل آٹھ سو سال بر صغیر پر وہی نظام، حکومت کی ذمہ داریاں بحسن و خوبی پوری کرتا رہا۔

تاریخ انسانی میں کسی بھی تہذیب کسی بھی طرز حیات کے لئے یہ طویل ترین عمر ہے مگر کیا اسکے بعد یہ نظام دم توڑ گیا ہرگز نہیں بلکہ رہا زندہ اور انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا ہاں مسلمانوں پہ زوال آیا جو یقیناً مسلمانوں ہی کی کمزوریوں کے سبب آیا اور غیر ملکی لادینی طاقت ملک پر قابض ہوگئی یہ طویل جنگوں فتح و شکست اور سازشوں کی ایک داستان ہے جو کم و بیش اپنی ابتداء سے تکمیل تک صدی بھر کا عرصہ لے گئی اس میں اختلاف رائے بھی ہے اور واقعات میں تضاد بھی مگر یہ حقیقت ہے کہ بالآخر یہ غیر ملکی قوت بر صغیر پر قابض ہوگئی اور اہل ہند کو فتح کر کے اپنا غلام بنالیا ہندوستان تاج برطانیہ کی نو آبادی ٹھہرا اور برٹش انڈیا کہلایا۔ چنانچہ یہاں کا حکومتی نظام بنایا گیا جو تاج برطانیہ نے برٹش انڈیا کے لئے بنایا جو اسکی کالونی تھی جس کے سارے باسی اس کے غلام تھے ایک لامحالہ ایسا معاشی ڈھانچہ بنایا گیا کہ محنت غلاموں کے حصے میں اور مفادات مالک یا حکمران کے لئے۔ اسلامی معاشی نظام کو ختم کر کے سودی نظام رائج ہوا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ غریب اور کمزور کا خون نچوڑنا اور طاقتور کو غذا مہیا کرنا اور اسی طرح مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کے باعث اس دور میں ہنٹنگ کی رپورٹ کے مطابق جو آج انڈیا آفس لائبریری انگلینڈ میں موجود ہے مسلمانوں میں چوراسی فیصد پڑھے لکھے لوگ تھے جو غالباً اس زمانے کی منفرد حقیقت تھی، ختم کر کے ایسا تعلیمی نظام دیا جو خدا بیزار، شعور سے بیگانہ اور محض دفتری لوگ پیدا کرنے کا کام کرے۔ سیاسی نظام میں

آزادی رائے اور حقوق انسانی کا ڈھنڈورا تو پیٹا گیا مگر نظام وہ دیا جو انگریز کو آقا اور اہل ہند کو غلام ظاہر کرے۔

مسلمان وہ واحد قوم تھی جو وقتی طور پر شکست تو کھا چکی تھی مگر اس نے ہار قبول نہ کی اور مسلسل انگریزی استعمار سے برسرپیکار رہی کبھی جنگ آزادی کی صورت میں جسے انگریز نے بغاوت کا نام دیا، کبھی کسی عالم دین کی رہنمائی میں کبھی کسی بزرگ اور صوفی کے زیراثر اور مختلف جہادی' سیاسی تنظیموں کے حوالے سے اور کبھی اکیلا اکیلا مسلمان بھی لڑتا رہا۔ علماء حق کا کردار اس تاریک ترین دور میں مژدہ سحر تھا اور نوید نور رہا انگریز نے مدارس ختم کئے تو محنت کر کے دینی مدارس قائم کر لئے اور بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ سلسلہ جاری رکھا جب کہا جاتا تھا کہ انگریز کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تب اس سے برسرپیکار رہے اور بالآخر آزادی کا سورج طلوع ہوا اور ایک خطہ زمین مسلمانوں کو نصیب ہوا کہ جہاں وہ اس ظالمانہ نظام سے نجات حاصل کر کے پھر سے ایک عادلانہ اور آزاد نظام لا کر ایک خوبصورت زندگی کا آغاز کر سکیں۔ مگر اسکی بہت ہی زیادہ قیمت چکانا پڑی۔ لاکھوں جانوں کا نذرانہ اور لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے کتنی آبروئیں قربان ہوئیں کوئی شمار نہ کر سکا ان سب کیساتھ واہگہ سے کلکتہ تک اور ہمالہ سے دکن تک کا علاقہ بھی پاکستان کی قیمت کے طور پر ہندو کی نذر ہوا مگر یہ سب اس لئے کہ ایک آزاد خطہ زمین جس پر ہم اپنے آزاد نظام کے زیرسایہ آزادی سے دم لیں گے اور آنے والی نسلوں کو صرف اللہ کا خوف ہو گا کوئی فرعون ان کی گردنوں پر سوار نہ ہو گا جس کی تصویر فیض احمد فیض نے یوں کھینچی تھی۔

اجنبی دیس کے مضبوط گراں ڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے در خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے میرے مجبور وطن کی گلیاں

جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم

یہ سب اس ظالمانہ نظام کا نتیجہ تھا جو انگریز نے بنایا اور برٹش انڈیا کے لئے بنایا اور ایک صدی تک کامیابی سے چلایا اگرچہ مسلمان اسکے خلاف سینہ سپر رہے مگر ہر شخص کو علم تھا کہ وہ غلام ہے اپنی آزادی ہار چکا ہے انگریز آقا ہے جو بھی عطا کر دے اسکی مہربانی سمجھنا چاہئے اور اسی ظلم کے خلاف جہاد نے پاکستان کو جنم دیا مگر شومئی قسمت گزشتہ نصف صدی سے وہی ظالمانہ نظام ہماری گردنوں پہ سوار ہے نہ صرف خود بلکہ انگریز آقاؤں کی جگہ دیسی مالکوں نے اور گورا صاحب کی جگہ کالا صاحب نے لے لی۔ جبکہ لوگ اب خود کو غلام نہیں مانتے وہ آزاد ہوئے ہیں انہوں نے آزادی کی قیمت دی تقسیم کے وقت اور ملکی تحفظ کی جنگوں میں وہ حقوق کی بات ہی نہیں کرتے حقوق حاصل کرنا اور ان سے مستفید ہونا چاہتے ہیں وہ موجودہ حکمران طبقے کو چاہے وہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو" گورا صاحب" ماننے کو تیار نہیں ہیں جبکہ حکمران طبقہ آپس کی کشمکش کے باوجود اسی نظام کو برقرار رکھنے پہ مصر ہے جو اسے "گورا صاحب" اور اہل وطن کو غلام بنا کر رکھے مگر یہ نظام برٹش انڈیا کے لئے تھا جو ختم ہو گیا پاکستان اور بھارت بنے اب بنگلہ دیش بن گیا اب نہ برٹش رہا نہ انڈیا تو برٹش انڈیا کا نظام کیسے چل سکتا ہے لہذا اس کی ناکامی کا ثبوت یہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں میں زیادہ عرصہ مارشل لاؤں کی نذر ہوا آخر کیوں صرف اس لئے تاکہ یہ نظام چل نہیں سکتا تھا اور آج پھر فوجی عدالتیں اور واپڈا میں فوج یا ریلوے میں فوج کی ضرورت یہ سب باتیں یہی ثابت کرتی ہیں کہ یہ نظام بری طرح ناکام ہو چکا ہے اور اسے تبدیل ہونا چاہئے۔

اب رہی یہ بات کہ تبدیل ہو تو متبادل نظام کیا ہو۔ بنیاد معیشت ہے۔ جس کو اسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ جو ملک کے شہری تک ملکی وسائل کا حصہ پہنچائے جو اس سودی نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ لایا جائے جس میں شراکت کا تصور ہو اور بیت المال کی

صورت ہو جس پر ملک کے ہر شہری کا حق ہو جو محنت کا پھل اسکو دے جو محنت کرے۔ جو امراء سے لے کر غربا کو دیتا ہو جسے ہر شہری کی ضروریات زندگی کی فکر ہو ظاہر ہے اسے قائم رکھنے کے لئے ایسا عدالتی نظام چاہیے ہوگا جو صد فی صد عادلانہ ہو تا کہ کوئی شخص دوسرے کے حصے کے وسائل چھین نہ سکے اور کوئی طاقتور اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہ ہو۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی کمزور نہ ہو حق لینے کے لئے حق جاننا بھی تو شرط ہے یہ تو جانے کہ اسکا حق ہے کتنا اور اسکے حصول کا طریقہ اور سلیقہ کیا ہے یہ سب علم کا محتاج ہے لہذا ایسا تعلیمی نظام جو انگریز کے اس طبقاتی اور خود غرض نظام کی جگہ لے اور ایک ملک ایک قوم کے لوگوں کے لئے ایک معیار تعلیم ایک نصاب تعلیم اور ایک طریق تعلیم ہو۔ شاہ سے گدا تک سب کے بچے برابر استفادہ کر سکیں۔ ایک آزاد سیاسی نظام جو محض دولت یا دھونس اور دھاندلی سے نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو اقتدار تک لے جائے جو اس کے اہل ہوں اور وہ ہمارا اپنا ہو۔ ہمیں نہ صرف ہمارا حق دے بلکہ ہمیں سیاسی شناخت بھی دے اور وہ صرف اور صرف اسلامی نظام ہے یہاں میں صرف دو چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو امریکہ سے در آمد شدہ ہیں چونکہ آج کل امریکی سکہ چلتا ہے تو شاید یہ وضاحت زیادہ بہتر لگے۔ امریکہ عدالت میں جب بحث سے تھک کر وکیل نے گزارش کی کہ مائی لارڈ میری درخواست صرف اور صرف انصاف کے لئے ہے مجھے اور کچھ نہیں چاہئے تو جج نے کہا افسوس میں تمہیں انصاف مہیا نہیں کر سکتا کہ میرا منصب قانون کے مطابق فیصلہ کرنا ہے یعنی اگر قانون میں انصاف ہے تو مل سکے گا ورنہ نہیں اور دوسری بات چند پیشہ ور بد معاشوں کی ہے جو امریکی تھے اور ایک جیل میں چلا گیا دوسرا ملنے کو آیا تو اسے جب تسلی دینے لگا تو اس نے کہا کہ میں نے قانون کی بہت زیادہ خلاف ورزی کی ہے اور قانون سے نہیں بچ سکوں گا تو دوسرے نے کہا کہ اس قدر متفکر ہونے کی

ضرورت نہیں کہ قانون بھی تو Man made (انسانوں کا بنایا ہوا) ہے گویا جو چیز انسان خود بناتا ہے اسے توڑ بھی سکتا ہے اور تبدیل بھی کر سکتا ہے تو پھر وہی نظام چاہیئے جس میں واقعی عدل ہو اور جو انسانوں کا نہیں انسانوں کے خالق کا بنایا ہوا ہو اور وہ اسلام ہے۔ یہی ہماری ضرورت ہے اور ہمارے مسائل کا حل بھی۔

کیوں کچھ ہونے والا ہے؟

امیر تنظیم الاخوان پاکستان امیر محمد اکرم اعوان کا اظہار خیال

30 اپریل 1998ء

اللہ جل شانہ کا اپنا ایک نظام ہے جو اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ انسان اللہ کی وہ مخلوق ہے جسے اللہ نے یہ شعور عطا فرمایا ہے کہ وہ خود اللہ کی ذات کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ سب سے بڑا غیب خود اللہ کی ذات ہے جس کی نہ کوئی مثال ہے' نہ حد' نہ خیال میں سا سکتا ہے نہ نظر اسکی متحمل ہو سکتی ہے' نہ مثال دی جا سکتی ہے لیکن انسانی شعور اور فکر کی کمال ہے کہ اسے جب نور نبوت سے جلا ملتی ہے تو وہ ذات باری کو پا لیتا ہے' پہچان لیتا ہے۔ جو مخلوق اللہ کو پہچان سکتی ہے نظام کائنات کے مختلف رازوں کو پالینا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظام دو طرح کی چیزوں پر استوار ہے۔ ایک مادی ہے اور دوسری روحانی۔ (Physical Sceinces) فزیکل سائنسز اور (Normative Sceinces) نارمیٹو

سائنسز۔ مادے کا تعلق عقل سے ہے۔ مادے کی پہچان عقل سے ہوتی ہے کیونکہ عقل بھی مادی ہے۔ اسی لئے مادی چیزوں کے راز پانے کے لئے ایمان شرط نہیں۔ کافر بھی پا لیتا ہے۔ یہ جو روزمرہ ہمارے سامنے ایجادات آتی ہیں ان میں کوئی بندہ کوئی شے تخلیق نہیں کرتا۔

ہم روز دیکھتے ہیں نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں۔ کبھی سائیکل ایجاد ہوا تھا تو یہ بھی عجیب چیز تھی۔ آج ایک عام آدمی جہاز پہ سفر کرتا ہے وہ اسے عجیب نہیں لگتا۔ بے شمار ایجادات آئیں ان میں کوئی چیز انسان نے تخلیق نہیں کی پیدا نہیں کی۔ قدرت کی پیدا کردہ چیزوں کو مختلف تناسب سے آپس میں ملایا گیا۔ ایک نئی چیز ایجاد ہو گئی۔ اس کا مطلب ہے وہ چیزیں بھی موجود تھیں۔ ان میں وہ خصوصیات بھی موجود تھیں انسانی عقل تلاش کرتی کرتی اس کلیے تک پہنچ گئی۔ اس نے جوڑ کر بنالی۔

لیکن جب ہم اس نظام کی طرف آتے ہیں جس کا تعلق روحانیت سے ہے تو بغیر نور بصیرت کے کام نہیں بنتا۔ بغیر ایمان کے کام نہیں بنتا۔ چونکہ اس سارے نظام کو روح دیکھ سکتی ہے، قلب دیکھ سکتا ہے اور قلب و روح کی حیات کا مدار ایمان پر ہے۔ ایمان سے اسے زندگی عطا ہوتی ہے اور اتباع رسالتؐ سے اس میں قوت آتی ہے اللہ کریم کا روحانی نظام مادی کردار سے متاثر ہوتا ہے مادی یا دنیوی معاملات میں جب شیطنیت بڑھ جاتی ہے۔ جیسے گزشتہ ادوار میں جہاں جہاں برائی بڑھتی اللہ کریم نئے نبی مبعوث فرمادیتا۔ ایک نئی روحانی قوت میدان میں آجاتی پھر مقابلہ ہوتا۔ حق غالب آتا باطل فنا ہو جاتا۔ پھر انسانی مزاج ہے رفتہ رفتہ سستیاں آتیں، کمزوریاں آتیں، تاریکی بڑھ جاتی۔ کوئی نیا نبی آجاتا پھر ایکدفعہ ایسا ہوا کہ پورا جہان ہی تاریکی میں ڈوب گیا تو رب کریم نے آقائے نامدار محمد رسول اللہ ﷺ کو سارے جہان کے لئے اور ہمیشہ کے لئے مبعوث فرمادیا۔ اب اس بعثت کی قوت روحانی تھی۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے پاس نہ

دولت تھی نہ افراد' نہ اسلحہ تھا نہ کسی حکومت کی پشت پناہی۔ نہ کسی جماعت یا طبقے کی پشت پناہی' کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں روحانی قوت وہ تھی جو ساری قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس زمانے کے مخالفین کی بھی رائے یہ تھی کہ اگر ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں تو پوری دنیا کے مقابلے ایک آدمی کی آواز ہے۔ جب تک وہ رہے گا بات کرتا رہے گا۔ جب دنیا سے اٹھ جائے گا بات ختم ہو جائے گی۔ مادی اعتبار سے یہ کلیہ بالکل ٹھیک تھا انہوں نے غلط نہیں سوچا لیکن وہ یہ بھول رہے تھے کہ یہ مادی قوت کی بنیاد پر بلند نہیں کی جا رہی اس کے پیچھے روحانی قوت ہے۔ اس کے پیچھے در نبوت ہے اس کے پیچھے اللہ کی تائید ہے یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی تو چشم فلک نے دیکھا۔

اذا جاء الحق و ذهق الباطل ان الباطل كان ذهوقا۔

حق آیا اور باطل کو بھاگنا پڑا اس لئے کہ باطل کا مقدر ہی بھاگنا اور شکست ہے۔

اب اس عظیم واقعہ کو گزرے ۱۴۰۰ سال گزر گئے پندرھویں صدی جا رہی ہے۔ ان چودہ سو سالوں کی تاریخ پہ جب ہم نظر کرتے ہیں تو روئے زمین پر ہمیں بے شمار زیروبم نظر آتے ہیں۔ جب بھی ظلمت بڑھی اس قوت نے انگڑائی لی۔ پھر کچھ دلوں کو گرمایا' کچھ دلوں کو منور کیا اور پھر سے تبدیلی آئی اور ایسی آئی کہ وہ پورے عالم کو متاثر کر گئی۔ فطرت کا ایک عجیب اصول ہے۔ فطرت کفر کو برداشت کر لیتی ہے۔ ظلم کو برداشت نہیں کرتی۔ چونکہ کفر کا معاملہ ہوتا ہے بندے اور خالق کے ساتھ، ظلم کا معاملہ ہوتا ہے طاقتور کا کمزور کے ساتھ تو اللہ اپنی مخلوق کے ساتھ ہونے والے ظلم کو گوارا نہیں کرتا لہذا چودہ صدیوں کے انقلاب کو اگر ہم دیکھیں تو بڑے بڑے ظالم اٹھے اور عجیب حادثاتی طور پر تباہ ہو گئے۔ نشان تک مٹ گئے۔ دین برحق کے انقلابات کو اگر ہم دیکھیں تو جہاں جہاں مسلمانوں کی ریاستیں تھیں جب وہ عملی زندگی سے دور ہوئے۔ اتباع رسالتؐ کو بھولے اللہ نے کسی ایسی ہستی' ایسے عارف ربانی کو پیدا فرما دیا

جس نے ان کی اصلاح کر دی۔ پھر صدی ڈیڑھ صدی کام چلتا رہا۔

آج جس موڑ پہ انسانیت کھڑی ہے آج کی تبدیلی' آج کا انقلاب کسی ایک ملک یا قوم کا نہیں ہو گا اس لئے کہ اس پندرھویں صدی میں آکر زمانے نے وہ روش اپنائی ہے جو بعثت نبوی علیہ الصلوۃ والسلام کے وقت تھی۔ یہ نہیں ہے کہ صرف مسلمان سے اتباع رسالت ؐ چھوٹ گیا ہے' اس میں کمزوری آگئی ہے بلکہ کافر نے بھی ظلم ہی اختیار کر لیا ہے اور ظلم اس زمانے کا ایک کامیاب ترین سیاسی حربہ بن گیا ہے دنیا کے کسی ملک میں دیکھ لیں حصول اقتدار کا طریقہ ظلم ہے۔ اقتدار پر قائم رہنے کے لئے لوگوں کو مغلوب رکھنے کے لئے ظلم کیا جاتا ہے یعنی پھر ایک بار وحشت و بربریت روئے زمین پر چھا گئی ہے۔ وہ یورپی اقوام ہیں' امریکن ہیں یا جاپانی۔ وہ افریقہ والے ہیں' ایشیا کے ہیں یا آسٹریلیا کے باسی یعنی ظلماً کسی کی جان لے لینا' کسی کی عزت لوٹ لینا' کسی کا مال چھین لینا اس پر کسی کو کوئی شرمندگی نہیں ہوتی بلکہ اس پر فخر کیا جاتا ہے اور اسے اپنا کمال سمجھا جاتا ہے۔ ہم جو نام نہاد مسلمان ہیں ہماری اپنی حالت قابل رحم ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں کم و بیش چھپن کے قریب ممالک ہیں جن کی معیشت سود پر استوار ہے۔ تمام ممالک میں حصول اقتدار کا طریقہ ظالمانہ ہے اور اس کی بقاء کا طریقہ ظالمانہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں کافرانہ قوانین رائج ہیں جو کمزور کے لئے بڑے سخت ہیں اور طاقتور کے لئے ان میں باہر نکل جانے کے بڑے ہی دروازے ہیں ان ممالک میں کچھ لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں' عبادت کرتے ہیں' روزے رکھتے ہیں لیکن عمومی طور پر طبقے دو ہو گئے ایک ظالم اور ایک مظلوم۔

آج پوری دنیا کو دیکھ لیں روئے زمین پر پھر دو طبقے نظر آتے ہیں ایک ظالم ہے دوسرا مظلوم۔ یہی حال نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی بعثت کے وقت تھا۔ دنیا دو حصوں میں بٹ گئی ہے ایک ظالم اور دوسرا مظلوم۔ اللہ نے انسان کو جو شعور دیا ہے جس طرح وہ

آمیزہ بنا کر نئی چیز بنالیتا ہے اسی طرح اسے اب یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جب کوئی قوم کوئی طبقہ کوئی ملک دو حصوں میں بٹ جاتا ہے درمیان کوئی نہیں بچتا جو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات رکھتا ہو تو پھر قدرت کا نظام حرکت میں آتا ہے ظالم اپنے ظلم سمیت نابود ہو جاتا ہے اور مظلوموں کی قدرت کاملہ دست گیری فرماتی ہے۔ کوئی بندہ پیدا کر دیتی ہے کوئی حکمران پیدا کر دیتی ہے۔ کوئی فوج بھیج دیتی ہے۔ اس کے اپنے طریقے اپنے قاعدے ہیں جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے لیکن اب ایک جگہ تو نہیں ہے بنگلہ دیش، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، مشرق وسطیٰ، یورپ، سکنڈے نیویا، امریکہ، جاپان، چین، روس، افریقہ کو دیکھیں اب پھر پوری دنیا میں ظالم اور مظلوم دو طبقے بن گئے ہیں۔ عقل سلیم یہ کہتی ہے اور اللہ کا دیا ہوا قلبی علم اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب جو دھماکہ ہو گا وہ کسی ایک ملک ایک قوم، ایک علاقہ کے لئے نہیں ہو گا، وہ بین الاقوامی فضاء کو متاثر کرے گا کیونکہ پوری دنیا میں دو طبقے بن گئے ہیں ظالم اور مظلوم۔ اب من جانب اللہ جب ظالم کے خلاف کوئی قوت اٹھے گی تو پھر جہاں تک ظلم ہے وہاں تک اسکا تعاقب کرے گی۔ بڑا عجیب معاملہ ہے میں آپ سے جو کچھ عرض کر رہا ہوں یہ نہ سمجھیں کہ میں کوئی پیشگوئی کر رہا ہوں یہ سائنٹیفک بات ہے اور مغرب کا کافر اس پر یقین رکھتا ہے اور اسے سمجھ چکا ہے۔ یہ جو چھوٹی چھوٹی اسلامی تحریکیں چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستوں کے بننے میں مغرب آڑے آرہا ہے اور الجزائر، افغانستان، پاکستان میں مخالفت کر رہا ہے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اہل مغرب کو یہ ڈر ہے کہ ان میں سے کسی ملک میں اگر اسلامی ریاست بن گئی تو وہ امریکہ اور یورپ کو فتح کر لے گا ایسا تو ممکن نہیں انہیں ڈر اس بات کا ہے کہ جہاں بھی یہ دھماکہ (Blast) ہو گا اس کی لہر پوری دنیا پر جائے گی ہر ملک کا مظلوم اٹھتا چلا جائے گا۔ یہاں سے کسی کو جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اگر کوئی ایسی فلاسفی، کوئی ایسا نظام حیات، کوئی ایسا آئین و دستور کسی چھوٹے سے خطے

میں بھی غالب آگیا اور دنیا کے مظلوموں نے دیکھا کہ وہ نظام حیات ظالم کا پنجہ مروڑتا ہے اور مظلوم کی دستگیری کرتا ہے تو وہ اپنی جگہ بیٹھے اس نظام کو قبول کرتے چلے جائیں گے اور یوں ایک طوفان اٹھے گا۔ ایک لہر اٹھے گی جو روئے زمین کے ظلم کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جائے گی۔

آج یہاں میں بات کر رہا ہوں لوگ کہیں گے یہ پیشگوئی کرتا ہے یہ پیشگوئی نہیں ہے۔ یہ بات کافر نے بھی سمجھ لی ہے اور قوانین فطرت کے اشارے بتا رہے ہیں۔ جو کچھ آج تک ہوتا چلا آیا ہے جہاں تک انسان کی تاریخ ہے وہ بتا رہی ہے۔ تو مغرب جس لئے کمربستہ ہے کہ انقلاب نہ آئے وہ اس لئے نہیں کہ پاکستان میں میاں نواز شریف اور بے نظیر کی حکومت نہ آجائے اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں یا پاکستان میں قاضی صاحب حکمران بن جائیں یا عبدالستار نیازی صاحب۔ اسے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ مغرب کو تو اپنی بقاء سے دلچسپی ہے وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اب جب تبدیلی آئے گی تو نہ قاضی حکمران بنے گا اور نہ نیازی، نہ بے نظیر ہو گی، نہ نواز شریف۔ اب حکومت اللہ کی اور اللہ کے دین کی ہو گی کسی مولانا، کسی پیر صاحب یا کسی سیاستدان کی حکمرانی نہیں ہو گی۔ وہ حکمرانی حق کی ہو گی، انصاف کی ہو گی، عدل کی ہو گی اور دنیا کے کسی چھوٹے سے ملک پر بھی عدل اسلامی، جو انسان کو عزت دیتا ہے، حقوق دیتا ہے، احترام دیتا ہے اگر نصیب ہو گیا تو دنیا کا ہر مظلوم کلمہ پڑھ لے گا وہی بات قیصر روم نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ میرے پاس نبی علیہ الصلوۃ کا جو گرامی نامہ آیا ہے۔ ہم مانیں یا نہ مانیں اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جہاں میرا تخت بچھا ہوا ہے وہاں وہ لوگ اپنے گھوڑے باندھیں گے۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں وہ نجومی تھا۔ ہو گا لیکن خط کی عبارت اسے بتا رہی تھی کہ اس میں ہر مظلوم کی دستگیری ہے اور جب مظلوموں کو کوئی شفقت بھرا ہاتھ ملے گا تو اسے تھام لیں گے اور ظالم تو چند ہوتے ہیں۔ اکثریت تو مظلوموں

کی ہوتی ہے۔ برصغیر میں دیکھ لو تین ساڑھے تین ہزار کی فوج لے کر مسلمان وارد ہوئے اور پھر کبھی انہوں نے اپنے ملک سے فوج نہیں منگوائی۔ جو زمین کا خطہ فتح ہوتا اور لوگوں کو احترام' آزادی رائے' عزت و آبرو اور اپنے حقوق ملتے تو وہ کہتے ہم کہاں پھنسے رہے زندگی کا مزا تو اس دین میں ہے وہ مسلمان ہوتے چلے گئے اور یہیں سے فوج بنتی گئی۔ جن نے سارا برصغیر فتح کر ڈالا۔

اب بات پھر وہاں آگئی ہے۔ میں نہیں جانتا یہ اللہ کی اپنی مرضی شاید آج شروع کر دے' دس دنوں میں شروع کر دے' مہینے میں شروع کر دے لیکن اب جب اس انقلاب کی ابتدا ہو گی تو یہ انشاء اللہ ناکام نہیں ہو گا کامیاب ہو گا اور اس کا اثر بین الاقوامی ہو گا۔ کسی ایک ملک میں نہیں ہو گا۔ روئے زمین سے ظلم کو مٹنا پڑے گا' بھاگنا پڑے گا اور پھر رب کی دھرتی پر حق کا غلبہ ہو گا اسلام کا غلبہ ہو گا اور دین برحق کے غلبے کا لمحہ آپہنچا ہے۔ جسے نہیں سمجھ آتی نہ آئے اس لئے کہ ہم اتنے کند ہو چکے ہیں کہ جو بات کافر بھی سمجھ چکا ہے ہمیں وہ بھی سمجھ نہیں آتی۔ لیکن اللہ اپنے کام کے لئے محتاج نہیں ہے۔ فیقول لہ اسی کو کہتا ہے کن ہو جا وہ کائنات میں کہیں نہیں ہوتی لیکن اس کی بارگاہ میں وہ بھی حاضر ہوتی ہے اس کا حکم وہ بھی سنتی ہے جو وجود میں نہیں آئی۔ تو حضرات اب جلسوں سے' تقریروں سے' وعظوں سے بات گزر چکی ہے۔ اب انشاء اللہ عمل کی گھڑی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ پتہ ہمارے حکمرانوں کو بھی ہے۔ اپوزیشن کے علم میں بھی یہ بات ہے۔ حکومت کے بھی جب بہت قریبی لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کچھ ہونے والا ہے۔ حالات جس طرح ہیں اس طرح اب چل نہیں سکیں گے۔ حکومت کے مخالفین جب ملتے ہیں تو کہتے ہیں کچھ ہونے والا ہے۔ بھئی تم کر رہے ہو کہتے ہیں نہیں نہیں ہم نہیں کر رہے۔ تو سمجھ ہی نہیں آرہی کیا ہونے والا ہے اسکا مطلب ہے کہ انقلاب کی آہٹ ہر بندہ سن رہا ہے' انقلاب کے

قدموں کی چاپ اپوزیشن سے لے کر ایوان سلطنت تک سنائی دے رہی ہے۔ حیرت مجھے اس بات پر ہو رہی ہے کہ یہ توبہ کیوں نہیں کرتے اللہ انہیں توفیق نہیں دیتا یہ لوگ باز کیوں نہیں آتے۔ کیوں ان کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں۔ خدمت کمیٹی کے نام پر ایک دروازہ کھول دیا کہ چند لوگ مفادات لے سکتے ہیں ساری قوم ادھر بھاگ گئی۔ بلدیاتی الیکشن کے نام پر ایک ہڈی ڈال دی سارے ادھر بھاگ نکلے اور دیکھ رہے ہیں وہ بھی کہتے ہیں پتہ نہیں الیکشن ہو گا یا نہیں اتنی دیر حکومت چلے گی یا نہیں اگر حکومت رہی تو ہمیں ووٹ دیجئے گا۔ ارے لعنت ہو تمہاری اس سوچ پر کہ جو کشتی ڈوب رہی ہے کہتے ہو اس میں ہمیں بٹھا دیجئے گا۔ یہ بدنصیبی کی علامت ہے' بدبختی کی علامت ہے اور شاید ہمارے گناہ اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ ہمیں توبہ کی توفیق بھی نہیں دے رہا۔ ورنہ ہر بندہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے اگر اس سے زیادہ نہیں سمجھ آرہا تو یہ سمجھ ضرور آتی ہے کہ کچھ ہو کے رہے گا۔ جیسے چل رہا ہے ایسے نہیں چلے گا۔ یہ کوئی پیشگوئی نہیں ہے۔ یہ جس طرح دو جمع دو چار ہوتے ہیں جن لوگوں کی نظر میں اقوام عالم کی تاریخ ہے' زمانے کے نشیب و فراز ہیں اور جن لوگوں کو تجزیہ کرنے کی اللہ نے استعداد دی ہے وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اب معاملہ اس جگہ ہے جہاں دھماکہ ہو گا۔ کسی چیز کو آپ پریشر دیتے جائیں یہ سارے 'پسٹن انجن' ڈیزل انجن اسی اصول پر چلتے ہیں کہ پسٹن پریشرائز کرتا چلا جاتا ہے اور ایک جگہ پر جا کے دھماکہ ہو جاتا ہے۔ تو یہ BLAST ہونے والا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم خود کو بھی اور مسلمانوں کو بھی اس طرف لے جائیں جو اللہ کی جماعت ہو' جو تبدیلی لانے والی جماعت ہو' جو حق کی حمایت میں ہو۔ جو ظلم کے خلاف لڑنے والی جماعت ہو اور اس تباہی سے ہم لوگوں کو چالیں جو ظلم کی حمایت میں کھڑا ہو کر انہیں بھگتنا پڑے گی۔ یہ میں کروں گا تو ہو گا' آپ کریں گے تو ہو گا' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اب ہو گا

اللہ جسے توفیق دے گا وہ اس میں شامل ہو جائے گا۔ تو میرے بھائی کوشش کیجئے فطرت کا بڑا سادہ سا اصول ہے خود سمجھیئے اس کا تجزیہ کیجئے اس پر غور فرمائیے جسے سمجھا سکیں اسے سمجھائیں اور میری دعا ہے اللہ ان لوگوں میں شامل فرمائے جن کو وہ غلبہ حق کے لئے قبول فرما چکا ہے اور اس طبقے میں کھڑا نہ کرے جو حق کے خلاف لڑ کے ذلیل و رسوا ہونے کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں۔ (آمین)

انقلاب کون لائے گا

کیم نومبر 1996ء روزنامہ وفاق۔ لاہور

مولانا محمد اکرم اعوان

پچھلے تقریباً ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں کم وبیش سوڈیڑھ سو کے درمیان اجلاسوں سے مخاطب ہونے کی توفیق نصیب ہوئی۔ عجیب بات ہے الیکشن نہیں ہو رہے، انتخابات کی بات نہیں، جلسوں کا موسم نہیں کوئی تقریروں کی رت نہیں۔ ہر بات کا ایک موسم ہوتا ہے۔ انتخابات، الیکشن، حکومت کی تبدیلی۔ اس کے آثار ہوتے ہیں۔ یا جلسوں کا سیزن ہوتا ہے موسم ہوتا ہے تقریروں کے شور شرابے کا اور لوگ تنبو قناتیں لگاتے ہیں، سپیکر لگاتے ہیں، لوگوں کو اپنی طرف بلاتے ہیں تم اب یہ بے موسم کی راگنی الاپنے نکل پڑے ہو کیوں؟ اسکا سبب کیا ہے۔ ایک سوال جس کا مختصر سا جواب دیتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو ایک پیغام یاد دلا رہے ہیں کہ اپنے اپنے نظریئے اپنے عقیدے اپنے ایمان کے مطابق اپنی زندگی کے اسلوب کو حضور کی سیرت کے مطابق کرلیں۔

ان سارے جلسوں کا حاصل آج جو میرے پاس ہے۔ وہ ایک سوال ہے۔ اس

سوال میں عام آدمی سے لے کر بڑے پڑھے لکھے اور قوم کے بڑے لیڈنگ قسم کے لوگ وکلاء حضرات، صحافی، ادیب' دانشور اور علمائے کرام بھی شامل ہیں۔ یہ سوال ساری قوم کا ہے میرے پاس، کہ آخر یہ کون کرے گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں اسلام نافذ ہو یہ جو آپ لکھتے ہیں کہ غیر اسلامی نظام ختم ہو کہ حق و انصاف کا راج ہو۔ یہ زمین پاکستان کے نام سے موسوم ہے اس پر پاک نظام ہی رائج ہو۔ یہ کون کرے گا۔ وہ کون کرے گا؟ اللہ کریم مجھے توفیق دے کہ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ آج کی مجلس میں' میں اس کا جواب دیتا جاؤں۔ حضرات میرے سامنے تاریخ اسلام بھی ہے کہ مورخ ہمیں کیا بتاتا ہے میرے خیال میں ارشادات محمدؐ بھی ہے الحمد اللہ، میرے اور آپ کے سامنے اللہ کا قرآن اور کلام بھی ہے۔ آیئے ہم ان تینوں حوالوں سے اپنے سوال کا جواب تلاش کریں جب حضور نبی کریمؐ نے اعلان نبوت فرمایا۔ روئے زمین پر کفر اور شرک کا فرانہ نظام سلطنت اور کافرانہ حکومتیں کافرانہ انداز اور کافرانہ ادائیں مسلط تھیں' آپؐ کے ذات والا صفات کے پاس دنیوی وسائل نہیں تھے نہ سیاسی طاقت تھی نہ معاشی طاقت تھی نہ کوئی فوجی قوت تھی نہ کوئی حکومت و سلطنت ملک میں تھی لیکن جس مسلمان نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا۔ اس کی سیرت کو دیکھئے آخری سانس تک اسکی کوشش یہ رہی کہ جو نبیؐ فرماتا ہے وہ میں کر دکھاؤں یہ اسلام تھا۔ مجھے سیرت صحابہؓ سے تلاش کر کے کوئی دکھادے کسی صحابیؓ نے یہ سوال پوچھا ہو کہ یا رسول اللہؐ یہ آپ فرما رہے ہیں یہ بات تو حق ہے پر یہ کرے گا کون؟ کوئی تاریخ...... قرآن سے نہیں حدیث پاک سے نہیں تاریخ میں ساری باتیں صحیح نہیں ہوتی تاریخ کا مصدر کیا ہے کسی نے فرمایا تھا لوگوں کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں سے تاریخ مدون ہوتی ہے۔ تاریخ کو میں وہاں تک صحیح مانتا ہوں جب وہ قرآن و حدیث کے مطابق بات کرتی ہے۔ جہاں سے تاریخ الگ رائے دیتی ہے میں تاریخ کو غلط کہتا ہوں اور ارشادت باری اور ارشادات رسولؐ کو حق مانتا ہوں لیکن تاریخ نے جس میں غلطی کا امکان موجود ہے جس میں غلط

باتیں موجود ہیں یار مجھے تاریخ سے نکال کر یہ سوال دکھاؤ کہ کسی خادم نے یہ کہا ہو کہ آقا قیصر بیٹھا ہے کسریٰ بیٹھا ہے ابو جہل زندہ ہے وادی بطحا پہ کفر چھایا ہوا ہے۔ مشرکوں کی حکومت ہے یار سول اللہ یہ اسلام کون اپنائے گا ہے کوئی سوال کسی کے پاس؟ جس نے لا الہ اللہ محمد رسول اللہ کہا اور اس نے یہ عہد کر لیا کہ اب یہ جسم کٹ تو سکتا ہے آقا کے پیغام سے ہٹ نہیں سکتا۔ لوگو کیا کیا ہوا اور کیا کیا کر گئے وہ لوگ شاید نہ میں اندازہ کر سکتا ہوں نہ میں آپ کو اندازہ کرا سکتا ہوں۔ مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا۔ محمد رسول اللہ کو ہجرت کرنا پڑی۔ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مشرکین مکہ کا خیال یہ تھا کہ یہ مکے کے چند (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ) پاگلوں نے یہ بات مان لی ہے چند بیوقوفوں نے یہ بات مان لی ہے یہ جب مکے سے باہر نکلیں گے تو یہ تحریک از خود ختم ہو جائے گی لیکن عبد اللہ ابن ابی نے آکر بتایا او مکے والو تم تو دھوکے میں آگئے تمہارا خیال تھا کہ مدینہ منورہ جائیں گے مقامی، مہاجر کی لڑائی ہو گی یہ آپس میں کٹ مریں گے وہاں تو محمد رسول اللہؐ نے مقامی و مہاجر کو اخوان اخوان بنا دیا۔ بھائی بھائی بنا دیا ہے مقامیوں نے جائیدادیں بانٹ کر آدھی مہاجر بھائیوں کو دے دی ہیں وہاں جا کر دیکھیں کس بات کا انتظار کر رہے ہو وہ تو ایک طاقت بن رہی ہے۔ مکے والوں نے ایک قافلہ تیار کیا جس کے لئے سارے مکے سے سرمایہ جمع کیا گیا۔ حاصل یہ تھا کہ یہ تجارتی قافلہ جو کچھ کما کر لائے گا وہ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جنگ پر صرف کیا جائے گا۔ یہ وہ قافلہ تھا جو پلٹ رہا تھا اور جس کا راستہ روکنے کا ارادہ ظاہر فرمایا رسولؐ اللہ نے۔ اللہ ایسا قادر ہے کہ اس نے قافلے کے بجائے اہل مکہ کو سامنے کر دیا مکے اطلاع پہنچی کہ مسلمان قافلے کا راستہ روکیں گے سارا مکہ اُمڈ پڑا ایک ہزار کا لشکر جرار لے کر سرداران قریش کروفر کے ساتھ چمکتی تلواروں کھڑکتے ہوئے اسلحہ کے ساتھ ہنہناتے ہوئے گھوڑوں اور اونٹوں کی لمبی قطاروں کے ساتھ بدر میں آوارد ہوئے مدینہ منورہ سے اللہ کا حبیبؐ راہی بدر ہو رہا ہے بھرتیاں ہو رہی ہیں بدر جانے کے لئے دو نو عمر بچے بھرتی کے

لئے کھڑے ہیں کہ اللہ کا رسولؐ ہمیں قبول فرمالے۔ آپؐ نے ایک بچے کا ذرا قد نکلتا ہوا دیکھا اور اسے اس قابل سمجھا کہ میدان جنگ میں جا سکتا ہے آپؐ نے اسے قبول کر لیا دوسرا ذرا چھوٹے قد کا تھا کمزور تھا آپؐ نے کہا بیٹا میں سمجھتا ہوں تم ابھی رہنے دو وہ کہنے لگا یارسول اللہ میں تو اس سے تگڑا ہوں میں کشتی میں اس کو گرا لیتا ہوں اسکو آپؐ نے رکھ لیا اور اجازت دے دی میدان جنگ میں جانے کی مگر مجھے آپؐ اجازت نہیں عطا فرمارہے حالانکہ میں اس سے تگڑا ہوں اس کو میں گرا سکتا ہوں آپؐ نے تبسم فرمایا اور کہا اچھا اس سے کشتی کر کے دکھا۔ کشتی کرنے لگا تو اس کے کان میں کہا خدا کے لئے گر جانا کیوں مجھے محروم کرتے ہو...... یہ کریں گے اسلام نافذ۔ ان کے باپ جا رہے تھے ان کے چچا جا رہے تھے ان کے دادا جا رہے تھے ان کے بزرگ جا رہے تھے۔ یہ دونوں ننھے مجاہد بھی میدان جنگ میں پہنچے۔ میدان بدر میں ایک صحابیؓ بیان فرماتے ہیں میرے ارد گرد کھڑے ہو گئے دو چھوٹے چھوٹے بچے میری کمر کے نیچے ان کا قد تھا۔ ایک کہتا ہے چچا دوسرا کہتا ہے۔ میں نے کہا ارے کیا بات ہے لڑکو کیا کہتے ہو کہنے لگے چچا ہمیں ابو جہل دکھا دو۔ ابو جہل کو کیا کہو گے تم؟" سنا ہے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی شان میں سب سے زیادہ گستاخی وہی کرتا ہے" ہاں ٹھیک سنا ہے تم نے۔ کہا میدان سے یا ہم واپس جائیں گے یا وہ واپس جائے گا۔ اور یہ تاریخ کا حصہ ہے یہ کہا تھا دونوں نونہالوں نے' اس نے حیران ہو کر ان سے کہا بیٹا وہ ہے۔ وہ جو جھنڈے کے ساتھ۔ گھوڑے کے ساتھ جھنڈا ہے اس نے خود کے اوپر پگڑی باندھ رکھی ہے اوپر کلغی لگی ہوئی ہے نظر آ رہا ہے تمہیں۔ کہا آ رہا ہے تو وہ ابو جہل ہے۔ وہ کہتے ہیں میری بات ختم نہیں ہوئی کہ وہ ایسے جھپٹے جیسے شاہین شکار پر جھپٹتا ہے۔ مقابلے میں ایک کو تلوار لگی جو کندھے پر پڑی اور کندھا کٹ گیا ایک تسمہ' ایک پٹھا اڑا ہوا رہ گیا تھا ہڈی اور گوشت الگ ہو کر اس طرح جھول رہا تھا وہ کہتا ہے میں دیکھ رہا تھا اس ننھے مجاہد نے اپنا ہاتھ اپنے پاؤں کے نیچے رکھ کر جھٹکا اور توڑ کے پھینک دیا۔ یہ ہاتھ رکاوٹ بن رہا تھا

ابو جہل کو گھوڑے سے گرا کر ریت پر خاک و خون میں غلطاں کر دیا ان کمسنوں نے، ارے ان کی جرأت نہیں تھی ان کا خلوص تھا اللہ نے ان کے خلوص کے سامنے اسے گرا دیا کیا آج کلمہ گووں میں کوئی ایسا نہیں جو کسی ابو جہل کو گرا سکے مجھ سے پوچھتے ہو کون کرے گا؟ یہ کیسا سوال ہے جو مسلمان کرتا ہے مسلمان ایک شہری سے لے کر سربراہ تک 'ایک پڑھے لکھے سے لے کر ان پڑھ تک۔ ایک وکیل سے لے کر عالم تک یہ سوال کرتے ہو کون کرے گا۔ وہ کرے گا جس کا رشتہ اللہ سے ہے اللہ کے رسولؐ سے ہے مجھے نام نہیں آتے لیکن جس کا رشتہ ہے وہ کرے گا وہ سر میدان آئے گا۔ اور اللہ ابو جہل کو خاک و خون میں غلطاں کرے گا۔ ایک بوڑھا، عمرو بن الجبوعؓ بوڑھا بھی ہے اور ایک ٹانگ سے معذور بھی۔ کفار مکہ چڑھ دوڑے ہیں۔ فیصلہ تھا باہر جا کر میدان میں مقابلہ کیا جائے گا۔ احد کے جہاد میں چاروں بھائیوں نے حاضر ہو کر کہا یا رسول اللہؐ ہمارا باپ بوڑھا بھی ہے ایک ٹانگ سے معذور بھی ہے ہم نے اس کی منت کی ہے ابا جی آپ گھر رہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال کریں آپ بہوؤں کو سودا سلف بازار سے لا دیں۔ ہم آپ کے لئے چار جانیں پیش کریں گے احد میں مگر یہ بابا جی مانتے نہیں حضورؐ نے بلالیا عمرو بوڑھے ہو آرام کرو گھر کی نگہداشت کرو" یا رسول اللہ بیویاں ان کی بچے ان کے یہ جہاد میں حصہ لیں اور میں سودا ڈھوتا رہوں" "آپ نہیں چاہتے کہ میں اس ٹانگ کو جنت میں گھسیٹتا چلوں یا رسول اللہ مجھے منع نہیں فرمایئے" چار بیٹوں کا بوڑھا باپ احد میں معذور ٹانگ کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہو گیا اور وہ شخص سبب بن گیا شہدائے احد کے مدفن کا۔

دوست کے ہمراہ

عہد جوانی

انقلاب کون لائے گا

۲نومبر۱۹۹۶ء روزنامہ وفاق۔لاہور

مولانا محمد اکرم اعوان

جب شہداء کے مقدس وجود اٹھا کر مدینہ بھیجے جارہے تھے اس کے بیٹے حاضر ہوئے بارگاہ نبوی ؐ میں عرض کیا" یارسول اللہ ؐ ہمارا بوڑھا باپ شہید ہو چکا ہے اس کا وجود اونٹ پر لادتے ہیں اونٹ اٹھنے سے انکار کر دیتا ہے آپ نے فرمایا اس نے کوئی دعا کی ہو گی اسکے ساتھ کون تھا" یارسول اللہ فلاں بزرگ تھے"" انہیں بلاؤ...... تمہیں کوئی پتہ ہے عمرو نے کوئی دعا کی تھی یارسول اللہ میں نے بھی کی تھی اس نے بھی کی تھی۔ کیا کی تھی یا رسول اللہ ؐ میں نے دعا کی تھی کہ میں کسی نامور کافر کو قتل کروں۔ اس کی زرہ اتاروں اس کی تلوار چھینوں اور زندگی بھر میں فخر کرتا رہوں گا کہ میں نے احد میں فلاں نامور مشرک کو مارا تھا اور یہ میں نے اس کی زرہ پہنی ہوئی ہے اور یہ میرے پاس اسکی تلوار ہے عمرو نے آمین کہا۔ پھر اسنے کہا تھا میں دعا کرتا ہوں تم آمین کہو۔ پھر اس نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے صبح شہادت دے دے اور میرے بدن کے پرخچے اڑادے۔ لیکن جہاں میں گروں وہاں میرا مدفن بھی ہو جاوے۔ میں قیامت کو اپنا خون آلود بدن لے کر اسی

میدان جنگ سے اٹھنا چاہتا ہوں آپؐ نے فرمایا اس کو لے کوئی نہیں جائے گا اس کو یہیں دفن کرو اور سب بن گیا شہداء کے قبرستان کا جس کی آج آپ زیارت کرتے ہیں عمرو ابن الجموعؓ آج بھی نافذ کرے گا اسلام کو اگر کوئی پیدا ہو گیا تو اور ننھے مجاہد...... اللہ نے کسی کو وہ تعلق دے دیا محمد رسول اللہ کے ساتھ تو وہ ایک ایک بندہ وقت کے ایک ایک فرعون کو ناکوں چنے چبوا دے گا۔

میرے بھائی تاریخ حرمین میں دیکھیں ایک حکمران کے پر اس نیت سے چڑھ دوڑا کہ اس شہر کی عظمت ہے حکومت ہمارے پاس ریاست ہمارے پاس سلطنت ہمارے پاس ہمارے دار الخلافے کو کوئی نہیں پوچھتا حملہ آور ہوا۔ اہل مکہ کی طاقت سے باہر تھا کہ اس کا دفاع کرتے۔ سارے اہل مکہ کو قیدی بنالیا لیکن اس فتح کے ساتھ اسے ایک مرض شروع ہو گیا اسکے منہ سے بدبو دار پانی بہنا شروع ہو گیا جو رکتا بھی نہیں تھا اور بدبو کسی دوسرے آدمی کو کمرے میں داخل بھی نہیں ہونے دیتی تھی شاہی اطباء عاجز آگئے علاج سے، علماء سے رجوع ہوا انہوں نے کہا کہ اس شہر کی حرمت ہے اللہ کے نزدیک اس گھر کی حرمت ہے اور یہ شہر بھی رہے گا اس کی عزت بھی رہے گی اور یہاں اللہ کا آخری رسولؐ پیدا ہوگا۔ یہ پیشین گوئیاں موجود ہیں کتب سابقہ میں تم نے زیادتی کی اس شہر کے ساتھ اس شہر والوں کے ساتھ۔ یہ بیماری نہیں یہ اللہ کا علاج ہے۔ علاج؟ اسکا علاج توبہ ہے۔ اس نے خلوص دل سے توبہ کی اور حکم دیا کہ چھ مہینے تک ان شہریوں کے کھانے کا اہتمام شاہی خرچ پر کیا جائے۔ چھ مہینے۔۔ چھ دن تم قید رہے ہو چھ مہینے سارا شہر میرا مہمان رہے گا اس نے کہا تحقیق کر کے مجھے بتاؤ۔ علماء نے بتایا کہ نبی یہاں پیدا ہو گا۔ یہ قوم اسکی مخالفت کرے گی انہیں شہر سے نکالے گی۔ یہاں سے وہ یثرب جائیں گے۔ یثرب تب وہ وادی تھی جہاں کوئی نہیں بستا تھا۔ یثرب بیماری کی علامت تھی ایسی جھاڑیاں تھیں جن میں ایسے مکھیاں اور مچھر ہوتے

تھے کہ جو وہاں ٹھہر تا اسے بخار گھیر لیتا اسلئے اب مدینہ منورہ کو یثرب کہنا درست نہیں ہے۔ جب سے مدینہ الرسول ہنا پھر مدینہ ہے یثرب نہیں ہے۔ وہ جگہ آباد ہو گی وہ نبیؐ وہاں ہجرت کر کے تشریف لیجائے گا اور اسکے بعد چار دانگ عالم میں اسلام کی عظمت کے جھنڈے گڑ جائیں گے وہ شخص اس وقت ایمان لایا جب نبی کریمؐ پیدا نہیں ہوئے تھے اس نے سب سے پہلے جھاڑ جھنکار صاف کروا کر مدینہ کی آبادی کی بنیاد رکھی۔ یہ تاریخ مدینہ ہے اپنے معتبر علماء کو وہاں آباد کیا اور خود چٹھی لکھی محمد رسول اللہؐ کے نام کہ میں آپ کی رسالت آپ کی نبوت آپ کی امامت پر ایمان لاتا ہوں اسے کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کو خادموں کی ضرورت پیش آئے گی میں آپ پر اپنے آپ کو قربان کروں میں آپؐ کے پاؤں دھو کر پیا کروں اس نے قصیدے میں لکھا ہے جس کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ہے (ترجمہ) اگر مجھے زندگی مہلت دے کہ میں آپ کی بعثت تک زندہ رہوں تو میں شہنشاہت چھوڑ کر آپ کا خادم ہوں۔ اور میں آپ کی قوت بازو ہونے کا ثبوت دوں۔ یہ ہوتا ہے نفاذ اسلام نبی مبعوث نہیں ہوا صدیوں کا فاصلہ ہے وہ کہہ رہا ہے میں کروں گا اگر مجھے اللہ کے نبی کی رفاقت مل گئی تو یہ چٹھی اس نے دی۔ مدینے منورہ میں ہر فوت ہونے والا بزرگ اپنی اولاد کو دیتا گیا۔ جب حضورؐ ہجرت کر کے تشریف لائے اہل مدینہ میں ہر کوئی اصرار کر رہا تھا مجھ پر کرم ہو میرے گھر کو رونق بخشئے آپؐ نے فرمایا میری سانڈنی معمور ہے اللہ کی طرف سے اسے چھوڑ دو اسے پتہ ہے اسے رب نے بتا دیا ہے یہ حکم دے دیا کہ کس گھر جانا ہے وہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر پہنچی اور اب ایوب انصاریؓ وہ بندے تھے جن کے پاس نسلاً بعد نسلاً وہ خط موجود تھا وہ خط حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ واحد مکان تھا مدینہ منورہ کا جس میں حضورؐ نے قیام فرمایا اور اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک نیچے تھا۔ آپؐ نے نیچے رہنا پسند فرمایا حضرت ابو ایوبؓ اور ان کی اہلیہ اوپر رہے رات کو پانی کا مٹکا ٹوٹ

گیا۔ سردیوں کا موسم تھا مدینہ منورہ ٹھنڈی جگہ ہے۔ پانی کا مٹکا ٹوٹ گیا بستر کے جو دو لحاف میاں بیوی کے تھے وہ انہوں نے پانی کے اوپر ڈال دیئے کہ ایسا نہ ہو چھت ٹپکے اور حضور کو ایذا ہو اور ساری رات اوپر بیٹھے سردی میں ٹھٹھرتے رہے۔ لحاف تو وہی دونوں تھے جو پانی میں بھیگ گئے۔ نبی علیہ السلام کو صبح خبر ہوئی تو فرمایا میں اوپر ٹھہروں گا تم نیچے آجاؤ۔ اس ابو ایوب انصاریؓ کو تلاش کر و وہ کہاں ہے۔ کمر خمیدہ تھی بوڑھے ہو چکے تھے اور یار وہ مکان جو مدینۃ النبیؐ میں ہے اور وہ مکان جس میں نبیؐ نے آکر قیام کیا اور وہ مکان جس میں جانے کا اونٹنی کو اللہ نے حکم دیا وہ کوئی چھوڑنے کے لائق تھا وہیں فوت ہوتے۔ وہیں دفن ہوتے اسی مکان کے اندر مدفن ہوتا لیکن نہیں جہاد میں فاتح قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے لشکر کے ساتھ تھے میدان جہاد میں موت کا وقت آگیا تو وصیت کی کہ مسلمانوں میری میت کو جنازہ پڑھنے کے بعد اٹھالینا اور شمشیر بکف لڑتے ہوئے جتنے دشمن ملک کے اندر لے جا سکو اتنے لے جا کر دفن کرنا۔۔۔۔۔ ایسے لوگ نافذ کرتے ہیں اسلام۔ کتنا سرمایہ تھا ابو ایوب انصاریؓ کے پاس وہ مکان۔ وہ گھر۔ وہ۔ صحن۔ وہ زمین۔ وہ لمحے وہ جوار رسولؐ۔ وہ گنبد خضرا کے سامنے۔ آج بھی دیکھو قسطنطنیہ کی دیوار کے ساتھ مدفن ابو ایوب انصاری ہے۔ کہاں مدینۃ النبیؐ اور کہاں قسطنطنیہ۔ لیکن نفاذ اسلام عزیز تھا اور پتہ تھا پاس یا پڑوس دفن ہونے کی بات نہیں ہے بات اسلام کی خدمات کی ہے۔ ارے ہم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں محبت کرنے والوں کے انداز جدا ہوتے ہیں دیکھو سیدنا ابو بکر صدیقؓ کو وصال نبویؐ کے بعد آپ کا یہ حال ہو گیا تھا کہ سانس لیتے تھے تو کباب کی بو آتی تھی۔ گوشت کے جلنے کی بو آتی تھی بہت طبیب اکٹھے ہوئے آخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ آتش ہجر ہے اور اس کی دوا وصال ہے۔ یہ تاریخ کا حصہ ہے وہ جس نے جان دے کر بھی دروازہ کھٹکھٹایا نہیں وصیت کی تھی کہ میرا جنازہ روضہ اطہر پر رکھ دینا اور آواز دینا یا رسول اللہ ابو بکرؓ حاضر ہے اگر دروازہ کھل جائے مجھے

اندر دفن کر دینا۔ تاریخ میں موجود ہے کہ صرف دروازہ ہی نہیں کھلا تھا ہاتف نے آواز دی تھی "اد خل الحبیب الی الحبیب" کہاں بستے ہو تم؟ کیا سوال کرتے ہوئے؟ اللہ اکبر! یار ایک کام کرو اللہ کو الحمد اللہ تو آپ مانتے ہو۔ الحمد للہ۔ آپ نبی کو نبیؐ تو مانتے ہو الحمد اللہ۔ دین کو دین تو مانتے ہو۔ اللہ قائم رکھے لیکن نبیؐ سے تھوڑی سی یاری، ہنالو اس کے بغیر بات نہیں بنے گی میں نے بدمعاشوں کو۔ چوروں کو دیکھا ہے یاری پر جان دیتے ہوئے مر جاتے ہیں یہ نہیں پیچھے ہٹتے میرا ایک ڈرائیور ہوا کرتا تھا غریب آدمی۔ اس کے ایک دوست کا قتل میں چالان ہو گیا اسکے پاس تھوڑی سی زمین تھی اس نے ۲۲ ہزار کی بیچ کر اسکے مقدمے میں لگا دی خود بارہ سو کی نوکری کرتا تھا میں نے کہا تو پاگل ہے کہنے لگا مولانا میری اسکے ساتھ یاری ہے۔ او یاری لاؤ رسول اللہؐ نال لگدی ہے تاں "اگر بدمعاش اتنی یاری نباہ سکتا ہے میں نے بدمعاشوں کو مرتے دیکھا مجھے وہ تاریخ یاد ہے۔ ہمارے چکوال میں لڑائی ہوئی لوگ مارے گئے وہ بندے جو قاتل تھے دونوں کہتے تھے میں نے قتل کیا۔ کیا مصیبت تھی کورٹ کو پولیس کو ایک کہتا تھا یہ جھوٹ بولتا ہے میں نے قتل کئے ہیں دوسرا کہتا ہے یہ جھوٹا ہے میں نے کئے ہیں بعض لوگ کہتے تھے یاری ہے یار پر جان دیں گے۔ مسلمان یہ پوچھتا ہے نبیؐ کا فرمان کون نافذ کرے گا میں اسے مسلمان تو ضرور مانتا ہوں میری کیا جرأت ہے کہ میں نہ مانوں لیکن مجھے یہ شبہ پڑ جاتا ہے کہ شاید اس کی یاری نہیں ہے میں آپ کو اسلام کی تبلیغ نہیں کروں گا اللہ نے آپ کو علم دیا ہے مجھ سے بہتر جانتے ہیں یہ ضرور کہوں گا "یاری لاؤ رب نال تے رب دے نبیؐ نال تے جے یاری نہ لگی تو کجھ نہیں جے ہونا" جہاں یاری نہیں ہے پوچھتے ہیں لوگ کہتے ہیں اسلام نافذ کون کرے گا مجھے چھوڑ کر دوسروں پر۔ جو بندہ کہتا ہے اسلام نافذ کرو! اپنا تا کیوں نہیں۔ عالم فاضل جاہل ان پڑھ وکیل سفیر آجر مہاجر سارے کہتے ہیں بہت اچھی بات ہے۔ خود اسلام کو اپنے گھر کے پاس نہیں گزرنے

دیتے کیوں ؟یاری نہیں۔اسلام پر ایمان ہے۔ عقیدے سے اعتبار ہے۔یاری نہیں ہے جب تک وہ یاری نہ لگے گی کہ۔۔

میں نے بعض بندوں کو اس بات پر چڑتے دیکھا ہے کسی نے کہا علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ایک کروڑ مرتبہ درود شریف پڑھا تو ایک بندہ اٹھا بولا اس نے کیوں پڑھا تھا میں نے کہا یار تو دو کروڑ مرتبہ پڑھ چڑتا کیوں ہے تو اتنا Posessive کیوں ہے تجھے اس نے روکا تو نہیں تھا۔یہ محبوب تو ایسا ہے جس کے کروڑوں عاشق ہیں چڑتے کیوں ہو۔وہ ٹوٹلی اللہ کے رسول کو اون (own) کئے بیٹھا تھا کہ سارے میرے ہیں جا قلندر' جا اپنی جرأت دیکھ ان کی قدر و منزلت دیکھ۔ تجھے تو صدیوں کے بعد کا ایک رکھا ہوا زرہ مل جائے تو سنبھال نہیں سکتا۔ سینہ پھٹنے لگے گا اسکے نور سے حوصلہ کر تو بھی پڑھ۔ یاری تو اسطرح کے تماشے دکھاتی ہے۔آپ سے کیا کیا کہوں۔درختوں نے پتھروں نے جانوروں نے اللہ کے حبیبؐ سے یاری لگائی حضورؐ فرماتے ہیں مجھے مکے کے وہ پتھر یاد ہیں کافر انکار کرتے تھے تو وہ پتھر مجھ پر سلام پڑھتے تھے مجھے وہ درخت یاد ہیں جنہوں نے میری رسالت کا اقرار کیا ابو جہل نے کہا بتاؤ میری مٹھی میں کیا ہے تو پتھروں نے کہا اشھدان لاالہ الااللہ واشھدان محمد رسول اللہ۔کیوں بتائیں مٹھی میں کیا ہے ہم بتاتے ہیں یہ کون ہیں نہیں۔یار اس پتھر جتنا درد بھی کسی مسلمان میں نہیں رہا جو یہ کہہ دے کہ میں نافذ کروں گا اللہ کا دین اللہ کے حبیب کا دین یار مجھے بیو توفوں کی ضرورت ہے پاگلوں کی ضرورت ہے مجنوں چاہئیں تھک گئے ہیں' ان دانشمندوں سے دیکھ لیا عقلمندوں کو ۵۰ برس ہو گئے پڑھے لکھوں کے پیچھے گھومتے ہوئے یار خدا کے لئے اب پاگلوں اور بیو توفوں کی باری ہے خود نبی علیہ الصلوۃ اسلام فرماتے ہیں اسطرح سے اللہ کیساتھ رشتہ لگاؤ اتنا اللہ کا ذکر کر حتی یقولون انہ المجنون "لوگ کہیں کہ پاگل ہو گیا ہے پاگل نافذ کریں گے اسلام کو۔ جسے کفر پاگل کہے گا اور اللہ کا حبیبؐ اسے اپنا خادم

قبول کرے گا جسے عقل والے نادان کہیں گے اور اللہ ۔۔۔۔۔

میں ایک گناہ گار ہوں ایک خطاکار ہوں ایک عام انسان جس کے پاس سوائے خطاؤں کے کچھ نہیں' میرا کمال صرف یہ ہے کہ مجھ پر میرے آقا نے اتنا اعتبار ضرور کیا ہے کہ مجھے اپنے کام پر لگا دیا ہے۔ میرا یہی سرمایہ ہے یہی باعث افتخار ہے اور الحمد اللہ مجھے دو جہان کی حکمرانی سے یہ زیادہ عزیز ہے مجھے ساری دنیا کی کوئی حکومت دے دے اور اسکے بدلے میں یہ لینا چاہے میں اسے جوتی کی نوک پر بھی نہیں لکھتا دنیا کی حکومت کیا چیز ہے۔ مجھے اقتدار نہیں چاہئے میں آپ کے پاس ووٹوں کے لئے کبھی نہیں آؤں گا اور نہ کبھی میں آپ سے چندہ مانگوں گا نہ مجھے آپ سے واہ واہ کی اور نعروں کی ضرورت ہے میں ایک خادم ہوں بارگاہ نبوت کا اور آپ کو آپ کے نبی کا پیغام پہنچا رہا ہوں آپ جانیں اور آپ کا رسول۔ آپ جانیں اور آپ کا پروردگار۔ انقلاب آئے نہ آئے۔ مخلوق جانے خالق جانے۔ ملک جانے اسکے بنانے والا جانیں۔ بندے جانیں اور اسکا ملک جانے میں تو اپنی ڈگڈگی بجا رہا ہوں جو حکم مجھے ملا اسے سنا رہا ہوں اور انشاء اللہ العزیز دنیا کی کوئی طاقت جب تک دم میں دم ہے مجھے اس کام سے نہیں روک سکی ہے اور نہ روک سکے گی مجھے کسی زر والے کسی حکمران سے کسی امیر سے کسی جاگیر دار سے کچھ نہیں چاہئے۔ اسلئے کہ میرے پاس دولت ہے جس کو یہ ترستے ہیں مجھے یہ احساس ہے کہ اس بارگاہ کی غلامی کتنی سلطنتوں پر بھاری ہے میں یہ جانتا ہوں کہ امور مصطفیٰ کی لذتیں کیا ہیں دربار نبویؐ سے کیسے انوار تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ مجھے اللہ نے بتایا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ دل اس کے نام پر کیسے دھڑکتے ہیں میں یہ جانتا ہوں کہ راتیں دنوں سے قیمتی کس طرح ہو جاتی ہیں میں مشت غبار ہوں ایک گنہگار انسان ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ عشق کیا ہوتا ہے کس سے کیا جاتا ہے اس کے لوازمات کیا ہیں اس کے اثرات کیا ہیں اسکے نتائج کیا ہیں؟ اگر چاہو تو میں آپ کے دل کو ایک ٹھوکر لگا سکتا ہوں کسی کو خواہش

ہو تو وہ بھی آجائے اسے میں بتاؤں گا عشق کیا ہوتا کیسے کیا جاتا ہے اور ہو کیسے جاتا ہے ارے تم تو مومن ہو ہم نے کافروں کو عشقِ نبیؐ میں مبتلا کر کے دیکھا ہے ہمارے قافو تو جو کافر آگیا وہ بھی اللہ اللہ کرتا چلا گیا یہ تاریخ ہے اس زمانے کی جب ہم نہیں ہوں گے تو یہ باتیں جمع ہوں گی اور پھر دانشور تھیس (thesis) لکھیں گے کہ بڑا بندہ تھا ۔بندہ بڑا نہیں ہوتا بڑا اللہ ہوتا ہے بندہ' بندہ ہی ہوتا جب وقت ہوتا ہے اس وقت اگر کوئی اس سے فائدہ لے سکتا ہے تو لے جب مر جائے تو قبر پر چراغ جلاؤ گے اور غلاف چڑھاؤ گے کیا فائدہ ؟جو زندوں سے مستفید نہیں ہو سکتا۔

لوگو اپنے دلوں کے دروازے کھولو اور یہ سوال اپنے سے کرو مجھ سے نہیں میں اپنے سب دوستوں کو کہہ رہا ہوں۔ اس بات کے حوالے سے۔ اسٹیج کے حوالے سے اس ویڈیو کیمرے کے حوالے سے۔ اس کیسٹ کے حوالے سے۔ اے اللہ یہ آواز سب تک پہنچا جنہوں نے مجھ سے پوچھا تھا اسلام کون نافذ کرے گا؟ اپنا سینہ کھول کر اپنے دل سے پوچھو اگر وہ کہتا ہے میں کروں گا تو تمہاری بات بن گئی اسلام کو نافذ کرنا نہ کرنا اس کا اپنا کام ہے اور اگر یہ کہتا ہے مجھے رہنے دو کوئی اور کرے تب اپنی فکر کرو۔ اللہ کے فرشتے آج بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔ کاش ہمارے دلوں میں بھی وہ جنون پیدا ہو جائے کہ ہم بھی ایڑیاں اٹھا اٹھا کر کہیں ،جی میرا قد پورا ہو گیا ہے مجھے جہاد پر جانے دیں اللہ کریم ہمیں توفیقِ عمل دے۔ ہمیں دردِ دل دے ہمیں عشقِ مصطفیٰ دے یا اللہ "خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں میرے مولا مجھے صاحب جنون کر۔ ایک کروڑ مرتبہ درود شریف پڑھ کر کیا حاصل ہوا تھا علامہ مرحوم کو۔۔ یہی نہ کہ خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر پاگل ہو کام ہو جائے گا۔(عقل نال نہیں جے ہوتا)

یہ ملک اللہ کی امانت ہے۔ یہ نرا اعلان نہیں ہے اسکے حقوق ہیں۔ ہمارے فرائض ہیں اس خطہ زمین پر لاکھوں جانیں قربان ہوئی ہیں لاکھوں عزتیں لٹی ہیں لاکھوں گھر

جل گئے ہیں اتنی بھاری قربانی کہ ابھی تک مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے کشمیر کی وادیوں میں بچے بوڑھے ذبح ہو رہے ہیں اس ملک کو اسلام کے نظام کا مرکز بنانے کے لئے کوئی ہے جو اس خون کی لاج کی حیا کرے۔ کوئی ہے جسے ماؤں 'بہنوں' بیٹیوں کی عزت کا پاس ہو۔ جو اس بات پر پاگل ہو جائے اور کہے اب یہاں صرف اسلام ہی ہوگا۔ ایسے پاگلوں سے نافذ ہوگا اسلام۔ مجھے امید ہے میں اس سوال کا جواب دے چکا ہوں اب اللہ سے توفیق عمل چاہئے کہ اس جنون میں ہمیں بھی مبتلا کرے۔

و آخر دعونا الحمدلله رب العالمین

عشق خانہ خراب کی باتیں

مولانا محمد اکرم اعوان

(مولانا محمد اکرم اعوان کا تعلق منارہ ضلع چکوال سے ہے۔ آپ ان بزرگان دین سے ہیں جنہوں نے مذہب کو مصلّی اور مسجد تک محدود نہیں رکھا۔ آپ کی دینی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مولانا کی دینی تحریریں اور تقریریں تو ہیں ہی بے مثال آپ کی ادبی تخلیقات بھی کچھ کم بلند پایہ نہیں اور آپ کا ذوق مزاح تو یکسر دلربا حیران کن ہے۔"اردو پنچ" کے لئے مولانا کی تحریر باعث مسرت ہی نہیں باعث برکت بھی ہے) ادارہ۔

عشق بھی بڑی عجیب شے ہے اچھے بھلے شریف آدمی کو تماشہ بنا دیتا ہے اور بڑے بڑے اونچے سر والوں کی پگڑی سر بازار اچھال دیتا ہے۔ غالباً اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ عشق جو ہو جاتا ہے اور دوسری قسم جو کیا جاتا ہے۔ جو ہو جاتا ہے اس کے بارے میں

تو وہی جانے جس کو ہو جائے اور بس۔ یار لوگوں کے صرف اندازے ہیں کہ ایسے لوگوں کو بعض حالتوں کی تعبیر اپنے طور پر کرتے رہتے ہیں مگر خود جن کو ہو جاتا ہے وہ اس کی بات نہیں کرتے کرنے کا ہوش نہیں رکھتے۔ اگر کرتے ہیں تو محبوب کی باتیں اور کر سکتے ہیں تو صرف محبوب ہی کا تذکرہ۔ ہماری بحث دوسری قسم کے عشق سے ہے جو کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی مختلف اقسام ہیں۔ جو انسانوں کی اقدار اور استعداد سے متاثر ہو کر بنتی ہیں۔ مثلاً پڑھے لکھے لوگوں کا عشق اور طرح کا ہوگا۔ اور اجڈ اور گنوار آدمی کا دوسری طرح کا۔ شہری بابو کا عشق اپنی طرز کا ہوگا اور دیہاتی کے رنگ اپنے ہوں گے۔ یہی فرق مشرق و مغرب میں ہونا چاہئیے امیر اور غریب کے عشق کرنے میں بھی یقیناً بہت فاصلہ ہوگا۔ کچھ یہی حال رنگ وروپ سے بھی ہوتا ہوگا۔ پھر کبھی کوئی شخص خوش رنگ تو ہوتا ہے مگر 'ہلکی جیب' رنگ کی اہمیت کو گھٹا دیتی ہے بعض اوقات رنگ کی میلاہٹ یا میلے پن پر جیب کا وزن پڑتا ہے تو اس میں چمک سی آجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح یہ کئے جانے والا عشق مذہب سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ عیسائیوں کا اپنا انداز ہے تو یہودیوں کے اطوار اپنے ہیں، ہندو اپنے طریقے سے کرتا ہے تو مسلمان اپنی طرز پر۔ یہاں جو واقعہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں یہ سکھوں کے عشق کرنے کی داستان ہے اور حرف بحرف سچی۔ راوی زندہ موجود نہایت ثقہ اول برٹش آرمی کا میجر اور پھر پاک آدمی کا کرنیل ڈیرہ دون اکیڈمی کا تربیت یافتہ جس نے 31 دسمبر 1940 کو کمیشن حاصل کیا اور مئی 1963ء میں ریٹائر ہو کر ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں اقامت اختیار کی جسے تادم تحریر نبھا رہے ہیں۔ غالباً ان کا پی اے نمبر 129 تھا اور نام نامی کرنل محبوب خان حسن اتفاق ملاحظہ ہو۔ محبوب کا قصہ اور راوی بھی محبوب خان تو یہ بزرگ خان صاحب بہت مزے کے آدمی ہیں۔ نیک خدا یاد اور حلیئے سے پیر فقیر تو دکھائی دیتے ہیں کرنیل ہرگز نہیں مگر چال اور بول پتہ دیتے ہیں کہ عمارت عجیب تھی بات میں کرنیلی تحکم اور

چال میں افسرانہ شان ضرور موجود ہے ایک روز چترال کی بات چلی کہ مجھے بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا تو فرمانے لگے بھئی میں نے ملازمت چترال سے شروع کی تھی حیثیت لفٹیننٹ جب میں فوج میں داخل ہوا تو مجھے 2/3 پنجاب میں پوسٹ کیا گیا جو دروش میں تھی دروش چترال سے ذرا پہلے ایک قصبہ ہے اور بہت پرانا قلعہ ہے جہاں اس وقت یہ یونٹ مقیم تھی۔ دیر سے پیدل چلنا ہوتا تھا اور مشہور لواری ٹاپ عبور کر کے رات زیارت میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ یہ لواری درہ ہے جس کی بلندی 10200 فٹ ہے۔ اور پھر 31 دسمبر کو تو وہاں گزوں کے حساب سے برف ہوتی ہے آج کل بھی یہ درہ عموماً نومبر کے آخر میں برف سے اٹ جاتا ہے اور مسلسل کئی مہینے راستہ بند رہتا ہے چترال صرف ہوائی جہاز جاتا ہے وہ بھی کبھی کبھار۔ لہٰذا میں نے مزدور لیا جس کو دیر سے زیارت تک سامان اٹھا کر ساتھ جانا تھا ساڑھے چھ روپے میں معاملہ طے ہوا۔ کہ فاصلہ بھی بہت زیادہ تھا اور راستہ بھی مشکل ترین۔ سو برف سے گزر کر زیارت پہنچے تو صبح یونٹ سے دو گھوڑے آ گئے جو نائک کرتار سنگھ لایا تھا۔ ایک اپنی سواری کے لئے اور دوسرا صاحب کے لئے چنانچہ وہاں سے سوار ہو کر دروش پہنچے دوپہر کے تقریباً تین بج رہے تھے اور دیکھا تو وہاں پریڈ ہو رہی تھی جس میں تین مجرموں کو سزا سنائی جانی تھی۔ انگریز ایجوٹنٹ مسٹر آف لیں......of lyn۔ سزا سنانے لگا۔ مجرم تین تھے اور تینوں سکھ چنانچہ صورت حال کچھ اس طرح سے تھی۔

ا۔ سپاہی بھاگ سنگھ 'جرم سرکاری ہتھیار لے کر بھاگنا' قصوروار ٹھہرایا گیا۔ سزا دس سال قید سخت۔

بھاگ سنگھ نے زور سے نعرہ لگایا۔ ست سری اکال پھر خالص سکھوں والی گالیوں کا طوفان ابل پڑا۔ جس کا نشانہ بھی ایک سکھ صدبیدار تھا۔ موٹا اور بھدا سا بد صورت تیجا سنگھ آخری بات جو بھاگ سنگھ نے کہی وہ یہ تھی "تیجا سنگھ میں قیدوں آواں گا تیری دھی

نوں لے کے جاواں گا۔" حیرت کی انتہا نہ رہی۔ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے سکھ ہی مجرم' اور جرم ہتھیار چرانا گالیاں صوبیدار کو دے رہا ہے۔ صدا انگریز کو دے رہا ہے۔ سزا انگریز نے سنائی ہے پھر یہ اس کی بیٹی کا ذکر کہاں سے آ ٹپکا کہ اتنے میں دوسرے مجرم کو سزا سنائی جانے لگی۔ سپاہی ہرنام سنگھ جرم سرکاری ہتھیار لے کر بھاگنا قصوروار پایا گیا۔ سزا سات سال قید سخت۔ وہی کچھ ہوا جو پہلے ہو چکا تھا ست سری اکال سے شروع ہو کر ساری گردان پہلے والے سے سخت انداز میں دہراتا ہوا آخر نتیجہ تیجا سنگھ دھی تیری نیں چھڈنی' اور سپاہی کھینچتے ہوئے دور لے گئے۔ تیسرے کا نمبر آ گیا سپاہی گرچن سنگھ جرم سرکاری ہتھیار لے کر بھاگنا قصوروار پایا گیا۔ سزا 5 سال قید سخت' بس جناب زور سے نعرہ گونجا ست سری اکال۔ پھر مغلظات کا طوفان جو سکھ منہ سے یوں نکل رہا تھا جیسے گھنی جھاڑیوں سے سؤروں کا ریوڑ اور آخر کار "تیجا سنگھ پہلے جہل چوں میں آواں گا۔ دس دے دیوندر کور نوں گھوڑی تے لے جاواں گا۔" اور یوں ہمیں حیرت زدہ چھوڑ کر پریڈ آف ہو گئی ہم نے بھی ڈیرہ جمایا اور سب سے پہلے اس کریدنی میں لگ گئے۔ بات کیا تھی پتہ چلا کہ سب آفت عشق کی لائی ہوئی ہے۔ یہ تینوں سکھ دوست تھے اور 2/8 پنجاب کی سکھ کمپنی میں تھے۔ یہاں دور دراز جنگل میں کیا کرتے زندگی بے کیف سی تھی تو مل کر مشورہ کیا کہ کچھ ہونا چاہئے یوں عمر ضائع ہو رہی ہے اور جوانی برباد فیصلہ ہوا کہ آپاں عشق کریئے بھئی کس سے کریں کہ دروش اس زمانے میں تو صرف قلعہ ہی تھا۔ اور دور نیچے چند کچے گھروندے تھے قریب کوئی آبادی نہ تھی اور وہ بھی مسلمانوں کے۔ صوبیدار تیجا سنگھ نے بچے ساتھ رکھے ہوئے تھے دیوندر کور اس کی جوان بیٹی تھی قرعہ اسی کے نام پڑا اور یوں تین سکھوں نے ایک ہی محبوب چنا یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہاں یہ جنس نایاب تھی اب اگلا مرحلہ اظہار عشق کا تھا سو پہلے بھاگ سنگھ کو موقع ملا کہ وہ سنئیر تھا۔ شام کے چھٹ پٹے میں صوبیدار کے کوارٹر کے باہر جا

کر ہلی جائی (منہ کے آگے الٹا ہاتھ رکھ کر زور سے آواز نکالتے اور ہاتھ کی حرکت سے اس میں ریروہم پیدا کرتے تھے اسے ہلی بلانا کہتے ہیں۔ سکھ جب لہر میں آتے تو ایسا کرتے تھے سواس نے بھی ہلی جائی)۔ پھر کچھ بولیاں کہیں (ایک خاص انداز میں فحش فقرے بلند آواز سے کہے جسے بولی کہتے ہیں) اور آخر کار نام لے لے کر پکارا۔ ''دیوندر کورے باہر آجا نہیں نے عاشقاں نے بوہے اتے مرجانا ایں۔'' غرض جو بن سکا کیا اور تھک ہار کر آ گیا۔ صبح ہوئی تو صوبیدار نے رپورٹ کر دی۔ پیشی ہوئی اور 28 دن قید۔ چلو کوئی بات نہیں عشق میں ایسے مقام تو آتے ہی ہیں۔ اب دوسرے نمبر پر ہرنام سنگھ کی باری تھی چند روز بعد اس نے ہلی جادی اور تیجا سنگھ کو کنبے سمیت سونے نہ دیا اگلے روز پھر پیشی اور 28 روز قید چند روز کا وقفہ دے کر گورچن سنگھ نے قسمت آزمائی۔ انداز اس کے بھی وہی تھے چنانچہ نتیجہ بھی وہی نکلا اور محبوب کی جگہ 28 روز قید سے واسطہ پڑا۔ جب باہر آئے تو عشق کسی قدر پختہ ہو چکا تھا پہلے ہی سکھ تھے اب قید بھی کاٹی اور بدنامی بھی ہوئی۔ ذرا زیادہ ہی بھوت گئے۔ مگر کر بھی کیا سکتے تھے رات کو اکٹھے ہی کوارٹر کے باہر پہنچ گئے اور لگے شور مچانے ہلی بھی لگاتے اور ساتھ آواز بھی لگاتے۔ دیوندر کورے باہر آجا آپاں تیرے لئی سر بھی کٹادینا' آپاں تیرے قدماں وچ دولت داڈھیر لا دنیا۔ آپاں تیرے لئی یہ کر دینا وہ کر دینا صبح وہی کام پھر شروع رپورٹ پیشی اور اٹھایا یعنی 28'28 دن کو اٹر گارڈ۔

بڑے خفا ہوئے کہ یہ تیجا سنگھ بڑا جالم اے ایہہ نے سگو نوکری نہیں کرن دینی۔ جوں توں کر کے قید کٹی ایک سکھ گھر سے چھٹی کاٹ کر آیا اور گھی کا ٹین ساتھ لایا ان تینوں نے مشورہ کیا کہ اب ملازمت تو مشکل ہے اور بہت رسوائی ہو چکی۔ ریکارڈ بھی تباہ ہو گیا ہن آپاں نس چلیے ہندوقاں لے کر پنجاب ڈاکے ماراں گے بھینی کس طرف سے جائیں ایک یہی راستہ ہے جس پر پکڑے جائیں گے۔ واہ آپاں پہاڑی ٹپ جاواں

گے۔ خیر سے پہلے ہی سکھ تھے پھر عشق کی مصیبت ہے وہ پہاڑی کہتے ہیں۔ وہ ہمالیہ کا سلسلہ کوہ ہے جو تقریباً نا قابل عبور ہے اور پنجاب وہاں سے کوئی دو سو میل دور، مگر یہاں اتنا ہوش کسے تھا۔ وہ گھی کا ٹین لے لیا اور پنجیری، نالی اور ایک ٹین بھر لیا کہ راستے میں کھائیں گے اب آخری مرحلہ تھا کہ بھاگیں گے کس طرح' سو وہ بھی حل ہو گیا حوالدار میجر سے ملے کہ ہماری گارڈ ڈیوٹی لگا دو۔ منت کر کے سب نے اکٹھی گارڈ لگوالی۔ جب آدھی رات ہوئی تو تین بندوقیں اور ایک بکس ایمونیشن کا لے کر بھاگے اور سیدھا پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ رات اندھیرا سردی اور راستے کا نام و نشان نہیں بالکل سیدھا کھڑا' ہوا پہاڑ اور پیچھے پکڑے جانے کا خوف مرتے کیا نہ کرتے۔ ساری رات آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ صبح تک کافی بلندی پر تھے۔ وہاں کے پہاڑ بھی عجیب نوعیت کے ہیں۔ نیچے سے چوٹی نظر آتی ہے اگر وہاں پہنچیں تو پتہ چلتا ہے کہ چوٹی تو سامنے ہے یہ تو محض راستے کا ابھار سا تھا اسی طرح تہہ در تہہ چوٹیاں ختم ہونے کو نہیں آتیں صبح دم جا کر کے ادھر پیچھے پتہ چل چکا تھا ادھر انہیں بھوک لگی بھاگ سنگھ نے للکارا۔ ہرنام سنگھا لے آیا پنجیری کھائیے تو پتہ چلا کہ وہ تو سب لانا ہی بھول گئے بڑا اودھم مچا' گالیوں کا تبادلہ ہوا مگر ہرنام سنگھ نے کہا کہ سنیئر بھاگ سنگھ ہے' ذمہ داری اس کی تھی خود لاتا یا ہم دونوں میں سے کسی کو حکم دیتا۔ یہ سب اس کا قصور ہے اور بھاگ سنگھ نے خود کو واقعی افسر سمجھ لیا کہنے لگا کوئی بات نہیں بندوقاں آیاں دے پاس آ سگو مسلے لبھ جان گے تو اوناں دے مرغے مار کے کھاواں گے واہ کیا خوب صورت تجویز تھی جو کوئی سکھ عاشق ہی سوچ سکتا ہے چنانچہ چرواہوں کے گھر تلاش کر لئے اب مرغوں پر لگی گولیاں برسنے بھلا تھری ناٹ تھری کی بندوق سے مرغے کا نشانہ اور پھر سکھ وہ بھی عشق کا مارا ہوا۔ دم پھولے ہوئے تھے۔ آگے آگے مرغ تھے اور پیچھے زن زن گولیاں برس رہی تھیں وہ مارا اب گرا مگر کچھ نہ ہوا مرغ بھاگ گئے نہ صرف مرغ

بلکہ چرواہے بھی جاگ اٹھے تھے اور عاشق بیٹھے ہوئے ان کی بے وقوفی پر قہقہے لگا رہے تھے مگر مسلیاں نوں ایناں وی نہیں پتہ کہ آپاں مرغاں تے پھیر کر رہے آں۔ سالے ڈر کے نس گئے نیں چرواہے مقامی لوگ تھے اور اتزائی بھی تھی وہ فوراً دوش پہنچ گئے کہ تین مسلح سکھ ہیں اور ہم پر فائر کر رہے ہیں چلو یہاں مصیبت ختم ہوئی فوراً سکھ کمپنی کو حکم ملا کہ گرفتار کر کے لاؤ کمپنی کمانڈر انگریز تھا یہ ابھی مسلوں کی نادانی پہ تبصرے کر رہے تھے کہ کمپنی نے آکر گھیرا ڈال دیا اور پکارا کہ ہتھیار ڈال دو اب سمجھے کہ یہ مسلے کہاں بھاگ گئے تھے۔ مگر اب تو دیر ہو چکی تھی سو بولے تیجا سنگھ دیوندر کورنوں لے آپاں ہتھیار سٹ دیواں گے غرض اس طرح کی بک بکا کے بعد آخر بولے میجر صاحب آوے تے ہتھیار سٹاں گے وہ بھی ساتھ تھا انگریز میجر سامنے آیا تو یہ واپس آئے یہ انہیں کو سزا سنائی جا رہی تھی جس کا ذمہ دار وہ صوبیدار تیجا سنگھ کو سمجھ کر اسے گالیاں بک رہے تھے ورنہ انہوں نے تو سیدھا سادا عشق کیا تھا یا عشق کرنے کی کوشش کی تھی۔ نہ یہ ظالم صوبیدار ظالم سماج کا روپ دھارتا اور نہ یوں رسوائیاں ہوتیں نہ قید کاٹنا پڑتی مگر یہ دنیا ہی ظالم ہے کب کسی کو دیکھ سکی ہے ہمیشہ لوگوں کے رنگ میں بھنگ ڈال کر خوش ہوتی ہے۔

شہنشاہوں اور فاتحین کی جولانگاہیں

یہ چند سطور میرے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں اور خالصتاً میری ذاتی رائے کی عکاسی کرتی ہیں۔لہذا قاری ماننے پر مجبور نہیں کہ ہر انسان کو آزاد رائے رکھنے کا حق ہے۔

عنوان سے تو پتہ چلتا ہے کہ میں کسی عہد رفتہ کی کہانی کہنے چلا ہوں۔ مگر ایسا ہرگز نہیں میرا مقصد آپ کو دور حاضر کے فاتحین اور شہنشاہوں' نیز داتاؤں اور مشکل کشاؤں کے ان حالات سے روشناس کرانا ہے جس کا تجربہ ناچیز کو برطانیہ' امریکہ' کینیڈا' ڈنمارک اور ناروے جیسے ممالک میں ہوا۔میرے اندازے کے مطابق ملک میں بہت کم لوگ ان حقائق سے واقف ہوں گے۔بغیر کسی پر طنز کئے اور بلا تنقید جو دیکھا وہ عرض کروں گا اور یہ اجازت چاہوں گا کہ اس صورت حال کے بارے اپنی رائے بھی پیش کروں :وما توفیقی الا باللہ۔

میں گزشتہ ماہ یعنی جولائی ۱۹۸۸ء کی پانچ تاریخ کو لندن پہنچا وہاں سے بریڈ فورڈ گیا آسٹر انڈر لین جمعہ پڑھایا۔گلاسکو جانا ہوا اور پھر لندن سے نیویارک چلا

گیا۔ میرا مختصر قیام ۵ سے ۱۳ جولائی تک تھا۔ وہاں علماء و پیران عظام سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اور مسلمانوں کو کس قسم کی تربیت یا برکات حاصل ہو رہی ہیں۔ یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ اکثر و بیشتر علماء نے برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ جن میں کچھ تو اسلام کے نام پر سیاسی کام بھی کرتے ہیں اور کچھ بغیر سیاست کے صرف مذہب کے نام پر لوگوں کو ایک دوسرے سے متنفر کرتے ہیں۔ اور مساجد کے اندر ایک دوسرے کو ختم کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں مساجد میں لڑائی ہوتی ہے ایک دوسری کی داڑھیاں نوچی جاتی ہیں ڈنڈوں سے سر کھل جاتے ہیں تب برطانوی پولیس مداخلت کرتی ہے اور بیچ بچاؤ کراتی ہے تو کئی بزرگوں کے سر سے خون ٹپک رہا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں دوسرے مسلمان کی داڑھی کے بال ہوتے ہیں اور احتجاج کر رہے ہوتے ہیں کہ پولیس جوتے پہن کر مسجد میں داخل ہو گئی اور مسجد کی توہین کر رہی ہے۔

بے چارے کس قدر سادہ ہیں کوئی ان سے پوچھے جو داڑھی آپ نے نوچی ہے بھلا کس کی سنت تھی۔ کیا یہ توہین نہیں۔ اور پولیس کو مسجد میں کون لایا؟ نبی رحمت ﷺ کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے والدین کو گالی مت دو۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ کوئی بدبخت والدین کو گالی بھی دے گا؟ فرمایا جو کسی کو گالی دیتا ہے اور جواباً وہ اس کے والدین کو گالی دیتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ خود اس نے گالی دی۔ اب سوچئے اس حدیث پاک سے صاف واضح ہے کہ لڑائی کرنے والے پولیس کو مسجد میں لانے کے ذمہ دار ہیں یا نہیں مگر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک مولانا خود کو موحد اور دوسروں کو مشرک قرار دے کر اپنے معتقدین یا اپنے مقتدیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان مشرکوں کو مسجد سے نکال دو۔ اللہ تم سے تب راضی ہو گا۔ ورنہ تمہاری عبادت قبول نہ ہو گی ادھر دوسری طرف کے مولانا کا فتویٰ ہوتا ہے کہ یہ گستاخان رسالت

ہیں۔ ظاہر ہے ایسا شخص مسلمان تو نہ رہے گا پھر حکم ہو تا ہے۔ جب تک ان کو مساجد سے نکال کر باہر نہیں کرتے ہو تمہارا صلوٰۃ و سلام بھی قبولیت سے مشرف نہ ہوگا۔ بس جھڑپ ہو جاتی ہے مساجد کو تالے لگتے ہیں۔ مقدمہ عدالت میں جاتا ہے اور جو پارٹی جیت جاتی ہے۔ اس کا مولوی فاتح کہلاتا ہے۔

میں یہاں ایک فاتح اعظم صاحب کی ادھوری داستان ضرور سناتا چاہوں گا جو کبھی سرگودھا میں ہوا کرتے تھے اور ایک بہت بڑی مسجد کی بنیاد رکھی تھی جو آج بھی بفضل اللہ پوری شان و شوکت سے ایستادہ ہے۔ جہاں کبھی کمپنی باغ ہوا کرتا تھا۔ لاکھوں روپے جمع ہوئے' بنیادیں بھری گئیں' چند فٹ دیواریں بھی اٹھیں اور پھر لڑائی ہو گئی کس کس میں ہوئی؟ مولانا اور ان کی کمیٹی کے ارکان میں غالباً' چندے پہ ہی بات بڑھی تھی جو اس وقت لاکھوں میں تھا۔ جب پاکستان میں لاکھوں کی بات کرنا آسان نہ تھا۔ مسجد بند ہو گئی مقدمہ عدالت میں زیر ساعت رہا۔ مدتوں کیس چلا مگر وہ چندہ پھر مسجد کو نہیں ملا جو جس کے پاس تھا اسی کا ہو گیا۔ مسجد محکمہ اوقاف نے لے لی کہ ساتھ دکانیں بہت تھیں مولوی صاحب برطانیہ چلے گئے۔ خوش الحان بھی تھے 'شعر بھی اچھے ازبر تھے 'لوگوں کو پسند آئے' ٹھہرا لئے گئے۔ اب سوال اٹھا کہ بچے منگوائے جائیں۔ ویزہ لینا چاہا تو حکومت برطانیہ نے شرط عائد کر دی کہ آمدن کم از کم ۱۷۰ (ایک صد ستر) پونڈ ہونی چاہئے تاکہ اپنے کنبے کی کفالت کر سکے اور غالباً وہاں آمدن ہفتہ وار شمار ہوتی ہے۔ یہ کوئی پانچ ہزار کے قریب روپے بنتے ہیں۔ اتنی تنخواہ مولوی صاحب کو کون دے سکتا تھا۔ آخر طے پایا کہ مسجد کمیٹی لکھ کر دے دے کہ ۱۷۰ پونڈ تنخواہ دے گی۔ چاہے دیتی وہی رہے جو پہلے سے مقرر ہے' جو بہت کم تھی۔ مگر قانونی تقاضے پورے ہو جائیں گے۔ لہذا یہ سب کچھ ہو گیا اور حضرت کے بچے بھی چلے گئے۔ اگلا قدم گیارہویں شریف سے شروع ہوا جن لوگوں

نے چندے میں پونڈ نہ دیئے وہ وہابی کر کے نکالے گئے اور یوں پہلی مرتبہ اس قصبے میں مسلمانوں میں باہم جھگڑے کی بنیاد پڑی جو اب تک بدستور چل رہی ہے۔

اب سولہ سال بعد مولوی صاحب نے جی بھر کر لوٹنے کے بعد مسجد کمیٹی پر دعویٰ کر دیا ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھ کر دیا تھا اسکے مطابق تنخواہ نہیں دی بلکہ پچاس ساٹھ پونڈ دیتے رہے مجھے سولہ سال کا بقایا دلوایا جائے اور خود امریکہ تشریف لے گئے نیو جرسی کی مسجد میں تشریف فرما تھے کہ راقم کو حاضری نصیب ہوئی تو آٹھ یا دس مسلمان جمع ہوئے ہوں گے جنہیں مولانا خطاب فرما رہے تھے۔"او! نبی کو اپنے جیسا بشر سمجھنے والو"۔اور اشتہار لگا ہوا تھا۔"شہنشاہ خطابت فاتح اعظم"۔واقعی بہت بڑے فاتح ہیں کہ پاکستان سے شروع ہو کر امریکہ تک سینکڑوں مسجدیں فتح کر لیں۔یہاں آکر پتہ چلانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ سرگودھا والی مسجد کے پہلو میں اوقاف کی ملی بھگت سے جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور فتح کے مال غنیمت سے بہت شاندار مارکیٹ بنا رہے ہیں۔

یہ ایک نمونہ ہے ورنہ ہر فاتح کسی نہ کسی مسجد کا فاتح ہے اور شہنشاہ باتوں کا شہنشاہ ہے۔رہی سہی کسر پیران عظام پوری فرما رہے ہیں۔صرف دولت پر بس نہیں کرتے بلکہ عزت و آبرو بھی ان کا کھلونا ہے۔گلاسکو سے ایک پیر صاحب مرید کی بیوی لے کر پاکستان چلے آئے تو سادہ لوح مسلمان نے لکھا۔مجھے پتہ ہے کہ آپ نے یہ حیلہ اس لئے کیا ہے کہ ہم آپ کا دامن چھوڑ دیں' مگر ہم نہ چھوڑیں گے ورنہ پھر ہماری مشکلات کا حل کہاں سے آئے گا اور مصائب میں کس کی پناہ لیں گے آپ اگلے سال بھی حسب سابق ضرور آئیے" چنانچہ سال بعد تشریف لے گئے اور عقیدت مند کی اہلیہ محترمہ کو بھی واپس ساتھ لے گئے۔

یہ ایک پہلو ہے۔دوسرا پہلوان لوگوں کا ہے جو دیندار ہیں۔نیک ہیں مگر یہ

برداشت نہیں کرسکتے کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا بھی اس نیک کام میں ان کا ہاتھ بٹائے غالباً انانیت کا شکار ہو چکے ہیں اور سادہ ہیں۔ نہ حالات کی خبر ہے نہ تجزیہ کرنے کا شعور۔ راقم کو مین ہٹن۔ میں ایک مسجد کے خطیب نے دعوت دی وہاں تبلیغی جماعت کے اکثر دوست تشریف لے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مولوی صاحب گئے ہوئے تھے وہ بروک لین میں مقیم تھے۔ انہیں پتہ چلا تو فوراً پہنچے مگر انگریزی سے نابلد تھے۔ لہذا کوئنز سے مترجم منگوایا اور جیسے نماز ختم ہوئی نوافل چھوڑ کر کھڑے ہوئے' عشاء تک دم نہ لیا' مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی اور نہ بیان کر سکے۔ اپنا کیا ہے ہم تو انہیں کو سنتے رہے مگر دکھ ضرور ہوا اس بات کا نہیں کہ مجھے بولنے کا موقع کیوں نہیں دیا بلکہ اس بات کا کہ انہیں بولنا نہ آتا تھا۔ وہ پہلے مسلمان ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اسلام کا نام نہیں سنا چنانچہ اب بھی وہ یہاں سے مسائل کا حل طلب کیا کرتے ہیں۔ اس بار ناروے سے پتہ کروایا تو ان پیران عظام میں سے ایک بہت بڑی شخصیت تشریف فرما تھی اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کے علاوہ مشائخ نے اٹھانوے تنظیمیں وہاں رجسٹرڈ کروا رکھی ہیں۔ جنہیں وہاں کی حکومت سالانہ امداد مہیا کرتی ہے۔ جن میں سے ایک مولوی صاحب جو ذرا کم حصہ پاتے ہیں پاکستانی سکے کے اعتبار سے چار لاکھ روپے سالانہ وصول کرتے ہیں۔ مگر نہ وہاں اللہ کا نام لیتے ہیں اور نہ یہاں کسی پر ظاہر ہونے دیتے ہیں۔ میں تو یہ سوچتا رہا کہ جب یہ بوڑھے مر جائیں گے۔ نئے لوگ مغرب کی تہذیب میں جذب ہو جائیں گے تو ان کی خدمت کون کرے گا۔ اللہ کے لئے نہ سہی دین کے لئے نہ سہی کچھ اپنی ضرورت کے لئے سہی مگر ان حضرات کو بھی سوچنا چاہئے۔ میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ میرا یہ یقین ہی نہیں عقیدہ ہے کہ علماء و مشائخ میں ہی ایسے عالی ہمت' عالی نسب لوگ موجود ہیں۔ اور رہیں گے جو تعلیمات نبویؐ اور

برکات نبویؐ کے امین ہیں۔ اور وہی رہنمائی کر سکتے ہیں لیکن میدان میں اکثریت ان احباب کی ہے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے جو بار بار صرف مساجد کو فتح کرتے ہیں۔ جو دوسروں کو گیارہویں شریف دینے کے فضائل بتاتے ہیں مگر خود صرف لیتے ہیں۔ زندگی بھر دینے کی نیکی کبھی نہیں کرتے جو کوئی کام کئے بغیر ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ لوگوں کو رزق حلال کی تلقین کے ساتھ خود کبھی حلال کمانے کا تکلف نہیں کرتے۔

اسلام ایک عالمگیر حقیقت کا نام ہے جو ہر مسلمان کو پوری زندگی کا نصاب عطا فرماتا ہے۔ ہمیں خود اسلام کو پڑھنا اور سمجھنا ہوگا۔ ہمیں خود اس کو اپنانا ہوگا کہ یہ صرف مولوی کا مذہب نہیں' صرف پیر کا مذہب نہیں' یہ میرا' آپ کا اور ہم سب کا مذہب ہے اور ہم سب پر اس کی حفاظت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

علماء کی فضیلت مسلم مگر اس وقت جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے ہمیں بہرہ ور فرمائیں مشائخ کی عظمت بسر و چشم قبول مگر اس وقت جب وہ برکات نبویؐ سے ہمارے سینے روشن کریں۔

اگر ان حضرات سے یہ فیوضات حاصل نہ ہوں تو دوسرا کوئی فائدہ ان کی ذات سے وابستہ کرنا اسلام نہ ہوگا بلکہ عین ممکن ہے خلاف اسلام کوئی قدم یا عقیدہ قرار پالے۔

ہماری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ نیک اور دیندار طبقہ نے معاشرے کی بے راہ روی سے منہ موڑ کر عزلت کی زندگی اختیار کرلی ہے۔ مگر کیا یہ معاشرے کی خرابی کا علاج ہے؟ یا اسے مزید کھل کر کھیلنے کا موقع دینے کے مترادف ہے؟ لہذا عام مسلمانوں سے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ صرف اسلام کو اپنائیں' خالص اور کھرا اسلام' تمام رسومات اور اوہام سے پاک اسلام' ایسے لوگوں کی مجلس اختیار کریں جہاں سے

علم کا نور میسر ہو، قلبی روشنی حاصل ہو اگر کہیں سے یہ دونوں نعمتیں یکجا ملیں تو بقول عارف رومی۔

چنیں مردے کہ یابی خاک اوشو
اسیر حلقہ فتراک اوشو

اللہ کریم ہماری عاجزانہ کوششوں کو قبول فرمائے،
(آمین)

فقیر محمد اکرم عفی عنہ
دار العرفان۔ ۸۸'۱۰'۱۱

سیاحت

کون نہیں جانتا کہ جہاں گردی اہل اللہ کا ایک خاص وصف رہی ہے۔ جہاں بینی میں ہی انہیں حق شناسی کا اصل ادراک ملا ہے۔ خلق خدا کے وسیلے سے خدا کی پہچان تک کا راستہ' دراصل اپنی پہچان کا راستہ ہوتا ہے جس پر چل کر اہل اللہ محبوب کی صفوں تک جا پہنچتے ہیں۔ سیاحت' خود شناسی اور حق شناسی کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے ہر دور میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے' خدا کے بندوں نے سیاحت کے ذریعے ہی خدا کی کائنات میں بکھرے ہوئے رازوں کو پایا ہے' وہ بھید جو کسی پر نہیں کھلتا' حق شناسوں کی اک نظر کا محتاج ہوتا ہے' ملک محمد اکرم اعوان نے بھی انہی بھیدوں' کو اپنی چشم بصیرت کے سائے سائے کھلتے دیکھا ہے اور خوب دیکھا ہے ان کی سیاحت دراصل حق شناسی کا وہ سفر ہے' جو ظاہر میں تو خوبصورت ہوتا ہی ہے۔ مگر درحقیقت باطن میں بھی اس کے اسرار اور اختیار کی کوئی حد نہیں ہوتی' کیونکہ وہاں وہ حسن لازوال بیٹھا ہے' جو حسن تمامی کا باعث ہے' مجھے ملک محمد اکرم اعوان کے

سفر ناموں غبار راہ اول، غبارہ راہ دوم اور دیار حبیب میں چند روز کے ذریعے ان کی جہاں بینی کا علم ہوا، انھوں نے خدا کے بندوں کو خدا کی کائنات میں کیسے کیسے رنگوں میں دیکھا ہے اس کا پورا اور اک تو یہ خوبصورت سفر نامے پڑھ کر ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو میں تبرکاً ان سفر ناموں کے چند حصے پیش کر رہی ہوں۔ ان کے وجودی، روحانی، نظریاتی اور فکری سفر کے حوالے سے۔ ایک صوفی دنیا کو کن زاویوں سے دیکھتا اور سوچتا ہے، شاید پڑھنے والوں کو کچھ اندازہ ہو جائے۔ زبان کی شگفتگی، سوچ کی گہرائی اور تحریر کی روانی کے اندر چھپی انسانیت کے لیے دردمندی، ان کی تحریروں کا خاص وصف ہے، میں نے سیاحت کے باب میں، بجائے ان سے بات چیت کرنے کے، ان کی یہ زندہ تحریریں صرف اس لیے شامل کتاب کی ہیں کہ میری طرح دوسرے پڑھنے والے بھی ان کی شخصیت کے اس زندہ پہلو سے واقف ہو سکیں جو بلا شبہ کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا: ان سفر ناموں کی ایک سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک یہ ہے کہ تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و تمدن اور حقائق کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان میں کہی گئی کسی بات کا تعلق بھی حکایت یا مفروضے سے ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ ہر بات کا ایک مستند معتبر حوالہ اور ہر واقعے کا ایک زندہ تر پہلو ان کے ہاں پورا پورا موجود ہے۔

غبارہ راہ۔ امریکہ ایک بار پھر۔ ایک اقتباس

ہرن کی موت

راولپنڈی فون کیا تو علی احمد صاحب نے ہرن کی موت کی خبر دی ہاں موت کی خبر ایک بے لوث محبت کرنے والے کی موت۔ میں نے عمر شکار اور جنگلی حیات کے مطالعہ میں بسر کی ہے۔ جس میں ایک اصول ہے کہ اڑیال پالا جائے تو بے پناہ محبت کرتا ہے مگر ہرن پالا جائے تو وہ محبت نہیں کرتا مانوس تک نہیں ہوتا جب کھول دو گے بھاگ جائے گا میں نے اڑیال بھی پالا تھا اور اس نے مجھ سے محبت بھی کی تھی کس حد تک اس کا اندازہ لگائیں کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور کبھی کھل جاتا تو محلے میں طوفان بپا ہو جاتا چنانچہ میں نے چاہا کہ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کو قربانی کے لئے پیش کردوں جیپ میں ڈالا اور لے گیا تھا۔ بہت خوبصورت انہیں بھی پسند آیا ورذبح کرنے کی جائے رکھ لیا اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا فرماتے تھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ وجہ کیا ہے ایک روز ٹیپ پر آپؒ کے گھر کسی نے میری تقریر لگائی تو وہ سن کر چونکا اور دیر تک آواز سنتا رہا پھر اس نے چرنا بھی شروع کر دیا اور یوں اسے روز ٹیپ سنائی جانے لگی۔ تو

وہ سنبھل گیا۔ پھر ایک روز طے ہوا کہ ٹیپ نہ سنایا جائے کہ پاس کے لوگوں سے بھی
بل جائے۔ دو روز ٹیپ نہ سنایا گیا تو بے حال ہو کر گر گیا چنانچہ ذبح کر دیا گیا۔ حضرتؒ
نے خود مجھے بتایا کہ عجیب بات ہے جب سینہ کھول کر دل نکالا گیا تو اس میں بال آ گیا
ہوا تھا یعنی ایک طرف سے پھٹ گیا تھا اللہ یہ محبت 'ایک جانور کو بھی اس قدر شدید
محبت ہو سکتی ہے ؟ پھر ہرن سے دوستی کی تو یہ اس سے بھی بڑھ کر دیوانہ نکلا
خوبصورت آنکھوں سے تکا کرتا تھا اگر میں کھڑکی کھولنا بھول جاتا تو آواز سن کر باہر
سے کھڑکی پیٹا کرتا۔ کبھی میں چھت پر سے دیکھنے جاتا تو اچھل اچھل کر اوپر آنے کی
ناکام کوشش کرتا پچھلے دنوں بہت موٹا ہو گیا تھا تو کسی نے کہا کر ہرن تو بانکا ہی
خوبصورت لگتا ہے یہ موٹا ہو گیا میں لندن چلا آیا کوئی تین ہفتے بعد پلٹا تو آدھا رہ گیا
تھا۔ دو ہفتے پھر اس سے ملاقات رہی کہ امریکہ چلا آیا اور اب میرے بعد وہ ہجر و وصال
کی جھنجھٹ سے آزاد ہو گیا اللہ۔ کیا خوبصورت دوست تھا زندگی کا ایک بہت تاریک
موڑ موت ہے' ہر ایک کو یہاں سے گزرنا ہے اور ایک طرح سے اچھا ہوا۔ وہ
بے چارہ اب جدائی برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ پھر کوئی توان صبر آزما لمحوں کی قید تلخ
سے چھوٹا' مگر یہاں دور دراز بھی اس کی موت کا سن کر آنسو ٹپک پڑے۔ یہ محبت بھی
ایک انوکھی مصیبت ہے۔ "کیوں ٹپکے تیرے آنسو کہاں چوٹ پڑی ہے"۔

O-----O-----O

دیس اندر پردیس!!

چترال کے شمال مغرب میں یہ تین وادیاں کافرستان کہلاتی ہیں۔ جن کے نام، رنبور، بمبوریت اور بریر ہیں۔ تینوں وادیوں کے درمیان بلند پہاڑ ہیں۔ مگر مقامی لوگ انہیں عبور کرتے رہتے ہیں بلکہ گرمیوں میں ان پر ریوڑ اور مویشی چراتے ہیں تو اکٹھے رہتے ہیں، آپس میں رشتہ داریاں بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ کالے کافر کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے قدرتی رنگ سرخ و سپید ہیں مگر کپڑا کالا کپڑا پہنتے ہیں، خصوصاً خواتین اور بچیاں سیاہ کپڑے کا ایک لمبا کرتا پہنتی ہیں، جن کے شانوں اور گلے پر کڑھائی کا کام کیا ہوتا ہے بس یہی کرتہ ان کا سارا لباس ہے۔ کنار دریا جب دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیں تو بڑی بے تکلفی سے بدن کو دھوپ دکھایا کرتی ہیں لہذا دریا پر دور سے اگر کسی چٹان پر سیاہ کرتا پھیلا ہوا نظر آئے تو اسکا معنی یہ ہے کہ قریب ہی کوئی پری وش بال سکھا رہی ہو گی لہذا احتیاط لازم ہے کہ ان کے پاس دوسرا لباس نہیں ہوتا۔ سر پر کوڑیوں کا تاج سا پہنتی ہیں جو پیچھے تک لمبا ہوتا ہے۔ آج کل بہار

ہے پھول اور پھل کثرت سے ہیں ساتھ کام کی زیادتی بھی ہے۔ فصلیں تیار ہیں اور سارے چترال میں گندم مکئی جسے یہ جوار کہتے ہیں اور کنگنی جسے یہ باجرے کا نام دیتے ہیں ایک ساتھ تیار کھڑی ہیں۔اخروٹ درختوں سے اتارتے ہیں۔زمین سے آلو حاصل کرتے ہیں اور اسکے ساتھ اکثر جوان لڑکے اور لڑکیاں مویشی اور ریوڑ لے کر پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں اور دو تین مہینے وہیں گزارتے ہیں۔یوں افرادی قوت بھی مٹ جاتی ہے مگر اس سب کے باوجود یہاں بدکاری نہیں ہوتی نہ کوئی اس طرح سوچتا ہے اگر کوئی چاہے تو ان کی آپس میں شادی کر دی جاتی ہے جس میں عموماً دولہا کو چند بکریاں دینا پڑتی ہیں۔ پھر بیٹی والے نہ صرف اپنی جائیداد اور زمین سے حصہ دیتے ہیں' بلکہ گھر بھی بنا کر دیتے ہیں اور پوری پوری مدد کرتے ہیں۔

یہاں کبھی لڑائی بھڑائی نہیں ہوتی' قتل کرنے کا تصور ہی نہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان ٹیلی ویژن پر بالائی چترال کے بارے ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے۔ ہر ڈرامے میں ایک قتل ہوتا تھا اور وہاں حقیقی زندگی میں اس کا کوئی تصور تک نہیں' شائد ہمارا ٹی۔وی انھیں اس راہ پر ڈالنا چاہتا ہوگا۔شادی سے زیادہ ان کی رسومات کسی کی موت پر ہوتی ہیں۔ جتنا بڑا آدمی ہو اتنا بڑا جشن اور اتنے زیادہ دن رہتا ہے خوب شراب چلتی ہے جوان کی اپنی بنائی ہوئی ہوتی ہے مردے کو اچھا لباس' نئے جوتے وغیرہ پہنا کر دو آدمی بغلوں سے ہاتھ دے کر اپنے ساتھ نچاتے ہیں اور سب حاضرین ناچتے ہیں پھر کوئی اور دو آجاتے ہیں اسی طرح تین تین دن جشن جاری رہتا ہے۔ڈھول کی تھاپ اور ٹھرے کے گھونٹ پہ رقص۔ بکریاں ذبح ہوتی ہیں اور لذت کام و دہن کے کام آتی رہتی ہیں پھر مردے کو اچھی سی چارپائی پہ ڈال کر قبرستان لے جاتے ہیں کہ اب یہ خوش ہے اور چلا جائے گا۔قبرستان بھی نرالا ہے لکڑی کے تختوں کے بکس ہیں'ایک نیا بکس بنا کر مردہ کو اس میں رکھا اور اوپر تختہ رکھ

کر چارپائی بھی چھوڑ کر بھاگ آتے ہیں کہ اسکی روح چمٹ نہ جائے۔اب وہ جنگلی لومڑیوں ،بھیڑوں اور جانوروں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے کہ ٹھنڈ کے باعث خراب تو ہوتا نہیں'یوں بھنوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔

مکان اکثر لکڑی کے ہیں اور پہاڑوں کے ساتھ اوپر نیچے ،مگر دھوئیں سے وہ بھی سیاہ ہو رہے ہیں۔ بعض عورتوں نے ایک سیاہ لیپ سا سارے چہرے پہ لگا رکھا ہوتا ہے۔ہر وادی میں برفانی نالہ بہتا ہے مگر دور سے پانی باندھ کر گاؤں کے اوپر لے جاتے ہیں اور پھر ہر گھر سے پانی کی نالی گزار دی جاتی ہے جو رات دن رواں دواں نظر آتی ہے ۔الہڑ دوشیزائیں غضب کی بانسری جاتی ہیں جو اس فسوں کا رماحول میں طلسماتی اثر رکھتی ہے۔ عجیب بات ہے بانسری کی لے میں نہ صرف درد'بلکہ ایک پاکیزہ سے جذبے کا احساس ہوتا ہے اور آنکھیں بند کر کے سنتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔

کمال ہے یہ ساری باتیں آپ کو کھڑے کھڑے سنا رہا ہوں۔ چلئے!وادی کے اندر چلتے ہیں۔ یہ وادی درمیان میں ہے اور پھر اس کے درمیان میں کندیسار گاؤں میں دار العرفان تعمیر ہو رہا ہے الحمد للہ! یہاں احباب ذکر کی محفلیں جماتے ہیں اور دین کی تبلیغ بھی کرتے ہیں'نو مسلم افراد کی حوصلہ افزائی کا اہتمام بھی ہے۔ سال میں دوبار میڈیکل ٹیم دورہ کرتی ہے جو دار العرفان کی طرف سے آتی ہے اور دوائیں بھی ساتھ لاتی ہے۔اس وادی میں ہسپتال بھی ہے جس میں آج تک صرف ڈسپنسر تھا مگر اب ایک ڈاکٹر صاحب متعین ہوئے ہیں جو چترال کے ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں'یوں ان لوگوں کو بہت مدد ملی ہے۔

ہم احباب کے ساتھ جا کر ٹھہرے۔دوسرے روز جمعہ تھا اور گاؤں کی مسجد میں تبلیغی جماعت کے احباب بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بھی روئے زمین پہ پھرتے تو ہیں' نتیجہ اللہ کریم کے دست قدرت میں ہے۔بہر حال ایک بہت بڑی

دینی محنت ہو رہی ہے۔ الحمدللہ!

وادی کے گرد پہاڑوں پر ہر طرح کے درندے بھی ہیں اور ہرن کی مختلف اقسام بھی' خوبصورت پرندے اور باز بھی یہاں پائے جاتے ہیں' درندوں میں چیتا اور ریچھ خاص طور پر اس لئے مشہور ہیں کہ سردیوں میں جب ہر طرف برف ہی برف ہوتی ہے تو یہ نالے میں آبادیوں کے قریب اتر آتے ہیں۔ چیتا گاؤں کے کتے پکڑتا ہے اور ریچھ نالے سے مچھلیاں۔ عجیب بات ہے یہ ریچھ' قطبی ریچھوں کی طرح گوشت خور ہیں اور بیلوں کو مار کر کھا جاتے ہیں مارنے کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ بڑا سا ٹہنا اٹھا کر پیچھے لپکتے ہیں اور اس سے مار مار کر گرا لیتے ہیں۔ ایک شکاری بتا رہا تھا کہ ایسے ہی ریچھ کا تعاقب کیا تو دیکھا کہ ایک چیتے کے ساتھ اس کی لڑائی ہو رہی ہے چھپ کر دیکھنے لگا کچھ دیر بعد محسوس ہوا کہ چیتے نے ریچھ کو تھکا دیا ہے اور ست سا ہو گیا ہے تو میں نے ریچھ کے سینے پہ فائر کر دیا۔ گولی لگنے سے ریچھ نے جھٹکا کھایا مگر اس نے سمجھا چیتے نے شرارت کی ہے' دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر چیتے کو غصے سے اٹھایا اور چٹان پر پٹخ دیا۔ دوسری بار پٹخا تو چیتا مر گیا مگر ریچھ بھی اس کے اوپر ڈھیر ہو گیا۔ یہ ریچھ بہت قد آور ہوتا ہے۔ پچھلے پاؤں پہ کھڑا ہو تو چھ فٹ تک بلند ہو جاتا ہے اور بہت قوی الجثہ بھی ہوتا ہے۔ سردیوں کی راتوں میں کوئی گھروں سے باہر نہیں جھانکتا' ریچھوں اور دوسرے درندوں کو آزادی ہوتی ہے۔

جمعہ کا بیان تو سارا یاد نہیں کہ عرصہ بیت گیا اور ریکارڈ ہوا نہ تھا ہاں! برکات معیت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام کا بیان تھا کہ جن لوگوں کو معیت نبوت نصیب ہوتی ہے وہ کفر کے لئے شدید ترین ثابت ہوتے ہیں۔ کفر ان پر کیا مسلط ہو گا انہیں کیا راغب کرے گا ان کی ضرب سے یہ ظلمت کافور ہوتی چلی جاتی ہے اور آپس میں مسلمانوں کے لئے اسلام کے لئے' نیکی کے لئے سراپا محبت ان

جاتے ہیں ان کا ہر کام خلوص کے ساتھ اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ نیز دنیا میں صرف یہی لوگ ہیں جن کی پیشانیوں پہ تجلیات باری رقصاں ہوتی ہیں۔ یہ ایک آئینہ ہے جو ہمیں ہمارا حال بتاتا ہے کہ ہم کہاں ہیں؟ یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہماری محبت ونفرت کس کے ساتھ ہے اور کس وجہ سے ہے؟ ہمارا کردار اور عملی زندگی میں طرز حیات کیا ہے؟ مگر افسوس! کہ ہم تو عملی زندگی ہی سے فرار کی راہ اختیار کئے بیٹھے ہیں۔ اکثر احباب جو دینی علم حاصل کرتے ہیں وہ پھر عملی زندگی میں قدم نہیں رکھتے حالانکہ حصول کا مقصد عملی زندگی کے لئے راہنمائی حاصل کرنا ہی تو ہے۔ اور یہ بے عملی ہمیں ڈبونے کے لئے بھاری پتھر کا کردار ادا کرتی ہے۔

اللہ کریم ہمیں توفیق عمل دے۔

نماز کے بعد وادی میں آگے تک چلے گئے۔ دوسرے گاؤں دیکھے' ڈاکٹر صاحب نے مریضوں کو دوائیں دیں۔ کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کیلاشوں کے ہر گاؤں کے باہر زچہ خانہ' ایک چھوٹا سا کمرہ دریا کنارے بنا ہوا ہوتا ہے۔ جب کسی خاتون کو تکلیف شروع ہوتی ہے تو یہ فوراً اسے وہاں پہنچا دیتے ہیں' وہیں بچہ پیدا ہوتا ہے اور پھر چالیس روز اسے وہیں رہنا ہوتا ہے گھر کا کوئی فرد صبح شام روٹی لا کر دور رکھ دیتا ہے۔ جو وہ اٹھالیتی ہے اور یوں اپنے نفاس کے چالیس روز وہاں گزارتی ہے یہ اسکے قریب جانے سے ڈرتے ہیں۔ ہاں! اگر کوئی عورت وہاں اور بھی ہو تو الگ بات ہے اور عموماً وہاں چند عورتیں جمع رہتی ہیں۔ وادی کے آخر میں شیخان دہ ہے۔ شیخ مسلمان کو کہتے ہیں اور شیخان دہ سے مراد مسلمانوں کا گاؤں ہے۔ اور عجیب بات ہے تینوں وادیوں کے سروں پر آخری گاؤں اسی نام کا ہے یعنی کبھی یہاں بھی مسلمان آباد ہو کر تبلیغ کرتے رہے جس کا اثر وادی میں نور ایمان کی صورت میں نظر آتا ہے لیکن مرور زمانہ سے اب ان لوگوں کی اپنی اولاد کا یہ حال ہے کہ ایک کیلاش مسلمان کہہ رہا

تھا۔ شیخان دہ کے بزرگوں نے ہمیں مسلمان بنایا تھا مگر ان کی موجودہ اولاد ہمیں کافر بنانے پہ تلی ہوئی ہے۔ یہ مقولہ ان کے موجودہ کردار کے باعث درست نظر آتا ہے۔

بہر حال تینوں وادیوں کے آخری گاؤں کا نام یہی ہے اور وہاں آبادی بھی مسلمانوں کی ہے۔ آگے افغانستان کی سرحد ہے کبھی آگے تک کافرستان تھا اور یہاں سے آگے پہاڑی درے ہیں جن کی دوسری طرف بسنے والے سرخ کافر کہلاتے تھے اور سرخ لباس بھی استعمال کرتے تھے مگر امیر عبدالرحمٰن والی کابل نے حملہ کر کے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور سب کو مسلمان بنا کر علاقے کا نام نورستان رکھ دیا۔ اب وہ موجودہ کابل حکومت کا حصہ ہے۔

شیخان دہ میں ٹراؤٹ مچھلی کا فارم ہے۔ یہ دنیا کی لذیز ترین اور مشہور ترین مچھلی ہے جو انتہائی سرد پانیوں میں پائی جاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں ہوتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جدھر سے پانی آ رہا ہو' ادھر کو جاتی ہے۔

کراکال ایک بہت بڑا گاؤں ہے جو بنیادی طور پر تو کیلاشوں کا ہے مگر اب کچھ نو مسلم بھی وہاں ہیں اور بتدریج لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ وہاں گئے کچھ کیلاشوں سے ملاقات ہوئی' نو مسلموں سے ملے۔ ڈاکٹر اور ڈرائیور قبرستان دیکھنے چلے گئے کہ جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں یہاں یہ بھی ایک عجوبہ ہے وہاں سے پلٹے تو راستہ میں ایک ہوٹل پڑتا تھا جس میں غیر ملکی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے وہ ایک آدمی غالباً اسلئے عیسائی کہلاتا ہے کہ یہ لوگ اسکے پاس آکر رہیں۔ وہاں ایک عیسائی نے جنریٹر لگا کر اسے بجلی بھی مہیا کر دی ہے چھوٹی سی واٹر فال (Water Fall) کے سامنے لگا ہے جو ایک گاؤں کو بجلی مہیا کر سکتا ہے۔ اگر حکومت چاہے تو ان سب وادیوں میں اور

دریائے چترال پر جگہ جگہ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے جو سارے ملک کو پہنچائی جاسکتی ہے۔

ہم دریا کنارے چلتے کیلاشوں کے دوسرے گاؤں پہنچے تو عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ واقف تو سب تھے کہ ڈاکٹر سب میں دوا بانٹتا ہے۔ مگر ایک خاندان سے ذرا زیادہ بے تکلفی تھی لہذا ان کے ہاں آکر دالان میں عصر ادا کی' قہوہ پیا' مکئی کے کھلے کھائے۔ انہوں نے تازہ انگور توڑ کر پیش کئے اور ایک نو مسلم خاتون سے ملاقات ہو گئی جو پچھلے سال تو مسلمان نہ تھی مگر اس بار اللہ نے اسے اور اسکے خاوند کو نور ایمان بخشا تھا۔ بہت خوش تھی' کچھ دین کے بارے باتیں ہوتیں رہیں۔ وہ بھائی کے ساتھ رہتی تھی جو مسلمان نہ تھا مگر یہ لوگ فراخ دل ہیں' برا نہیں مناتے۔ مسلمان ہو گئی' کوئی حرج نہیں۔ اس کو اسلام پسند آیا ہو گا اور بس! وہ بتانے لگا کہ میری ایک اور بہن بھی مسلمان ہو گئی ہے اور اس نے ایک راج سے شادی کر لی ہے' اسے اسکے راج ہونے پہ اعتراض نہ تھا حالانکہ وہ خود بڑا زمیندار تھا' یہ تو ایک فن ہے۔ بس آدمی معقول ہونا چاہئے۔ اور مجھے شیخان دہ کے اپنے مولانا یاد آرہے تھے' جو اسی گاؤں میں رہتے تھے۔ بتا رہے تھے کہ میں نے اٹھارہ سال سے بیوی کو بھائیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ کتنی عجیب بات ہے جو حال ایک مومن کے دل کا ہونا چاہئے وہ کافر کو نصیب ہے اور جو تنگی کافر کے دل میں ہونی چاہئے اس نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ اللہ کریم ہمیں معاف فرمائے!

یوں ہم مغرب کے وقت مکان پہ پہنچے۔ ایک بزرگ ساتھی کے مکان پہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ احباب جمع ہو گئے' ذکر کیا' عشاء پڑھ کے کھانا کھایا اور آرام کیا۔ صبح ۹ تاریخ کو روانگی تھی مگر تا حال دارالعرفان کے لئے ضروری چیزوں کی فہرست مرتب کرنا تھی۔ لہذا ناشتے کے فوراً بعد وہاں مستری صاحب کو بھی بلوایا تھا خود بھی حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ تعمیراتی کمیٹی کے مقامی بزرگ حضرات بھی

تھے۔ سب نے مل کر طے کر لیا۔ اشیائے ضرورت کی فہرست ہوائی جو ہمیں راولپنڈی سے بھجوانی تھیں اور واپس روانہ ہوئے' واپس سے مراد اس وادی سے واپسی ہے گھر کو نہیں کہ ابھی تو سفر شروع ہوا تھا اور یہ ایک لمبے دشوار گذار اور مشکل سفر کی ابتدا تھی۔

ان وادیوں میں بھی مقامی طور پر چترال میں بھی اور بالائی چترال میں بھی آپ کو ہر جگہ آغا خان فاؤنڈیشن کا بورڈ نظر آتا ہے۔ یہ ان سب علاقوں میں بہت فعال ہے اس کا حال ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ فی الحال یہاں سے چلئے کہ ساتھ دوسری وادی کا راستہ اس سے مشکل ہے۔ اس وادی میں سڑک نسبتاً آسان تھی۔

جب ہم دوسری وادی میں داخل ہوئے تو وہ سڑک زیادہ ہی تنگ دامن تھی اور زمین پر تھی نہ آسمان پر بلکہ پہاڑی چٹانوں کو درمیان سے کاٹا گیا تھا اور صرف اس قدر جس میں سے جیپ بمشکل گزر سکتی تھی۔ موڑ کاٹتے وقت آگے صرف دو سوتر فاصلہ چھوڑ کر نکلتے تو بھی پچھلا پہیہ کم از کم ایک چوتھائی سڑک سے باہر یعنی ہوا میں سے گزرتا تھا اور لطف کی بات یہ کہ گرنے کا ایک ہی موقع' آخری موقع تھا۔ ان لوگوں کا کمال یہ ہے کہ چھ چھ گیلیاں' جن میں سے ہر ایک میں سے اندازاً چار چار شہتیر نکل سکتے ہیں' جیپ پر لاد کر ان سڑکوں سے نکل جاتے تھے' گرتے بھی ہیں اور جو گر گیا بس گر گیا اور کھیل ختم۔

ہم نالے کے ساتھ ساتھ رنبور گاؤں پہنچے۔ قدرتی حسن ندیوں' نالوں پھولوں' پھلوں' آبشاروں اور سبزہ زاروں یا پہاڑوں کی بلندیوں، برف پوش چوٹیوں اور گہری حسین وادیوں میں بکھرا پڑا ہے مگر قدرت کا سب سے بڑا شاہکار یعنی انسان اپنی بے بسی اور کسمپرسی کی انتہا کو چھو رہا ہے۔ روحانی تشنگی کا یہ حال کہ لوگ سینکڑوں برس قبل از مسیح کی رسومات پر کاربند ہیں۔ اور جسمانی اعتبار سے نہ غذا

کھیت نظر آئے جن میں مکی بہار دکھا رہی تھی۔ ایک سفید ریش مسلمان بزرگ راستے میں کھڑے تھے ہاتھ میں کمان گاڑی سے اتر کر پوچھا علیک سلیک کے بعد پشتو میں بتایا کہ اس کمان سے چھوٹا سا پتھر مارا جاتا ہے اور میں پرندہ شکار کر لیتا ہوں۔ میں نے کہا۔ مجھے دے دیں بچوں کو دوں گا' آپ اور بنا لیں۔ تو خوشی سے دے دی۔ یہاں مسلمان عموماً پشتو بولنے والے ہیں۔ میں نے ایک صد روپے دیئے تو یوں خوش ہو گیا جیسے کوئی پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ شکریہ بھی ادا نہ کر سکا اور بچوں کی طرح اچھلتا ہوا بھاگ گیا۔ سبحان اللہ! غریبی بھی کیا نعمت ہے گناہ کے مواقع کم' دل میں تکبر کے بجائے عجز و انکسار اور خوشیاں اتنی سستی کہ ایک سو روپے کی خوشی پاگل کر دے۔ بہت عجیب شے ہے مگر ہم اس کی قدر سے آشنا نہیں رہے۔

ہم چلتے رہے۔ آخر گاؤں آ ہی گیا۔ گاؤں کا نام بیر یر ہے اور یہاں کیلاشوں کا سردار رہتا ہے ان کا بڑا مندر یا معبد بھی اسی گاؤں میں ہے اور سب سے بڑا میلہ بھی اسی گاؤں میں دسمبر میں لگتا ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے میلے' ایک گرمیوں میں اور ایک بہار میں گزر جاتے ہیں۔ دسمبر میں سالانہ اور سب سے بڑا میلہ ہوتا ہے جس میں تینوں وادیوں کے کیلاش مرد عورتیں شریک ہوتے ہیں۔ تین دن رات' اظہار مسرت کے سارے جتن آزمائے جاتے ہیں۔ تاریخوں کا فیصلہ سردار ہی کرتا ہے۔ یہ گاؤں بھی دوسروں کی طرح اوپر تلے بنے ہوئے گھروں کا چھتہ ہے۔

ڈاکٹر گاؤں میں چلا گیا کچھ مریض دیکھے' ہم کھلی جگہ رک گئے۔ شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ تن آور درختوں کے نیچے جوان لڑکیاں بُنائی کر رہی تھیں۔ وضو کیا اور ظہر ادا کی چائے پی۔ بچے جمع ہو گئے۔ کچھ بسکٹ انہیں دیئے۔ کچھ لڑکیوں کو دے دیئے۔ ڈاکٹر صاحب آئے تو مریضوں کا ہجوم ساتھ لائے۔ انہیں دوائیں بانٹتے رہے۔

پوری ہے نہ دوا کا اہتمام' نہ لباس ہے نہ کوئی اور سہولت' حکومت تو سرے سے پوچھتی ہی نہیں۔ہاں مخیّر ادارے کسی حد تک کام کر رہے ہیں۔یہاں اگرچہ مڈل سکول ہے مگر تعداد بہت کم' کہ لوگوں کے لئے پہنچنا آسان کام نہیں۔ایک خوبصورت مسجد صدیقی ٹرسٹ کراچی اور دعوت القرآن کے تعاون سے بنی ہے جس میں قاری سعید احمد صاحب' جو چترال ہی کے نواح کے رہنے والے ہیں چند بچوں کو تجوید سے حروف تہجی کی مشق کروا رہے تھے۔ان بچوں سے کچھ آیات سن کر یوں لگا جیسے صحرا میں چند خوبصورت کلیاں پھول بننے کو بے قرار ہوں۔

ڈاکٹر صاحب مریض دیکھنے اور دوائی بانٹنے لگے' چائے کا کپ پیا جو گاڑی میں موجود تھی۔اساتذہ سے ملاقات کی بہت اچھے لوگ تھے۔اس سے آگے چند گاؤں تو تھے مگر راستہ جیپ کا نہیں تھا اور پیدل جانے کے لئے وقت نہیں تھا لہذا وہاں سے واپس ہوئے اور پھر پہلی وادی کے داخلے والی جگہ پر پہنچے جہاں سے راستہ واپس چترال کو جاتا تھا۔یہ بھی ایسا ہی نالہ درمیان میں چھوٹا سا دریا اور پہاڑی کاٹ کر جیپ کا راستہ بنا ہوا ہے۔

چترال سے پہلے دریا کنارے ایک گاؤں آتا ہے جس کا نام ایون ہے وہاں سے ہم چترال بھی جا سکتے تھے اور کافرستان کی تیسری وادی میں بھی ابھی دن کا ایک حصہ رہا تھا لہذا گاڑی وادی کو موڑ دی اور یوں ہم بیریر وادی میں داخل ہو گئے۔اللہ کی شان! یہ بہت ہی تنگ وادی تھی اور اسی نسبت سے سڑک کا دامن اور بھی تنگ تھا بلکہ مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ ہم اس راستے پر سے کیسے گزر گئے جہاں اترائی آئی تو ایک دم اترنا پڑتا اور پھر اسی طرح سے ایک دم اوپر چڑھنا پڑتا۔بڑے سخت موڑ اور پہاڑ سے مسلسل گرتے ہوئے پتھر' پھر اجاڑ بیابان اور ایک سو گز سے زیادہ تو وادی بھی کم ہی نظر آتی کہ سانپ کی طرح بل کھاتی تھی۔آخر ایک جگہ چھوٹے چھوٹے

ان کے سردار صاحب کو بلوایا۔ ٹوپی پر سفید رنگ کا بڑا سا پر لگا رکھا تھا یہ اسکی سرداری کی علامت تھی۔ ڈاکٹر سے مل کر بہت خوش ہوا کہ یہاں پہلے بھی دوا وغیرہ تقسیم ہوتی رہی تھی لہٰذا اکثر واقف تھے کچھ مسلمان بھی جمع ہو گئے اور یوں سب سے ملتے ملاتے ہم چترال کے لئے روانہ ہوئے۔

واپس دریائے چترال پر پہنچے تو پل عبور کر کے ساتھ چھوٹا سا گاؤں سید پور آتا ہے۔ وہاں ایک بزرگ ساتھی صالح جان رہتے ہیں۔ ان کے ہاں صبح کا کھانا تھا جو ہم نے عصر پڑھ کر کھایا اور لب دریا ان کے خوبصورت مہمان خانے میں آرام کیا ایک طرف پہاڑ کی بلندی آسمان سے باتیں کر رہی تھی تو دوسری طرف دریائے چترال تھا۔ خوبصورت پھولوں سے لان بھرے ہوئے تھے۔ مغرب سے پہلے روانہ ہو کر مغرب چترال پہنچ کر ادا کی۔ جس محلہ میں ہم ٹھہرے یہ محلہ چترال کے امراء کا محلہ تھا اور ان کی ایک خوبصورت مسجد بھی۔ صبح اسی مسجد میں درس ہوا جس کا موضوع قرآن حکیم کا ھدیٰ اور رحمۃً ہونا تھا۔ مگر محسنین کے لئے جو عبادت اور معاملات میں رب جلیل کی اطاعت کرتے ہیں ورنہ تو قرآن حکیم کی برکات نصیب نہ ہوں گی بلکہ الٹا ذلت کا عذاب ہوگا۔ العیاذ باللہ!

دن کو شہر میں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ کھانا اور ظہر کا بیان 'بادشاہی مسجد میں تھا جو ایک بہت خوبصورت جگہ کنار دریا شاہی محل کے پہلو میں اپنی شان دکھا رہی ہے۔ وہاں اسوۂ حسنہ پہ بیان ہوا کہ اسوۂ حسنہ صرف نماز' روزہ ہی نہیں' اخلاقیات' معاشرت اور سیاسیات سب ہی کچھ اسوۂ حسنہ میں موجود ہے مگر ہم اسے بھول چکے ہیں اور زیادہ سے زیادہ نماز' روزہ ہی کو مراد لیتے ہیں وہ بھی نمازی اور دیندار لوگ امور دنیا سے دامن بچا کے رہنے کو دین سمجھ لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ دنیا سے دامن بچانا چاہیے مگر اسکا معنی یہ ہرگز نہیں کہ دنیا کا کام ہی نہ کیا جائے۔ بلکہ مراد

یہ ہے کہ دنیا کے کام بھرپور طریقے سے کئے جائیں مگر ان سے دامن دل آلودہ نہ ہو' اس نگر میں صرف اللہ کی یاد بستی ہو۔ لہذا مدارس کے طلبا کو حصول علم کے بعد میدان عمل میں جانا چاہئے اور جو لوگ میدان عمل میں تو ہیں مگر ان کی پیشانیاں سجدوں سے آشنا نہیں۔ انہیں اللہ کی بارگاہ میں یعنی مساجد میں بھی آنا چاہئے کہ مسلمان عبادت کے وقت عابد اور کام کے وقت مجاہد نظر آئے۔

کچھ لوگ بیعت ہوئے۔ خطیب صاحب پرانے علماء میں ہیں لائبریری میں ان کی مجلس نصیب رہی۔ عصر کے بعد پھر ایک جگہ بیان تھا۔ جسے مغلان دہ کہتے ہیں الگ گاؤں بھی ہے اور شہر کا محلّہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کافی احباب منتظر تھے۔ جو بیان ہوا۔ اس کا خلاصہ ارشاد ربانی کے مطابق تھا کہ اسلام میں سارے کے سارے داخل ہو جاؤ۔ مراد یہی ہے کہ ہر وہ کام کرو جس کی انسانی حیات اور کائنات کو ضرورت ہے قاعدہ یہ ہے کہ اسے اسلامی حدود کے اندر رہ کر کرو یہ ہرگز مناسب نہیں کہ دین اختیار کریں تو دنیا کے امور چھوٹ جائیں اور اگر دنیا کی طرف متوجہ ہوں تو دین کا دامن ہاتھ سے جاتا رہے۔ بلکہ دنیا کو بھی دین ہی بنالیا جائے اور اسے اس طرح کیا جائے جس طرح دین کرنے کی اجازت دے۔ وہاں احباب کے ساتھ چائے پی۔ ہمارے ہموریت والے ڈاکٹر صاحب کے عزیزوں کا گھر تھا وہ بھی اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور یوں ۱۰ ستمبر ۸۹ء کا دن چترال میں بہت مصروف گزرا۔ ۱۱ ستمبر کو صبح ٦ بجے ہم شندور پاس کے لئے روانہ ہوئے خبر یہ تھی کہ آگے گلگت جانے کا راستہ بند ہے اور ہمارا پروگرام یہ تھا کہ درہ شندور سے گزر کر وادی غذر سے ہوتے ہوئے گلگت جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے سوچا سامان اٹھانے کی زحمت نہ کریں' واپس چترال تو آنا ہی پڑے گا۔ پھر لے لیں گے۔ ہاں یہ مہربانی کر گئے کہ میرے دو بیگ گاڑی میں رہنے دیئے۔ چنانچہ ہم اللہ کریم کے بھروسے پہ نکل کھڑے ہوئے۔

چترال شہر سے نکلتے ہی پکی سڑک شروع ہو جاتی ہے گلگت داخل ہونے تک ساتھ نباہتی چلی جاتی ہے شہر کے باہر ہوائی اڈہ ہے۔ یہاں رن وے کے لئے کافی جگہ ہے مگر اڈہ برائے نام ہی ہے۔ تاروں کا جنگلہ سا اور چھوٹی سی عمارت۔ ہاں! جگہ خوبصورت ہے کنار دریا ہے۔ ایک طرف ترچ میر کی بلند برف پوش چوٹی نظر آتی ہے جو چترال کے سر پر تاج کی مانند سجی ہے یہ ۲۶،۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ چترال سے شندور پاس اور پھر وادی غذر سے گزر کر گلگت' یہ خوبصورت ترین مگر مشکل ترین راستہ ہے۔ چترال سے شندور تک چترال ہی کا علاقہ ہے جو بالائی چترال کہلاتا ہے۔

شہر سے نکلیں تو ہوائی اڈے سے آگے وادی تنگ ہونے لگتی ہے حتیٰ کہ دریا بھی سمٹ جاتا ہے اور سڑک بھی سمٹ کر کنار دریا لپٹ جاتی ہے پھر کبھی دریا کے غضب سے ڈر کر پہاڑی چٹان کے ساتھ بلند ہو جاتی ہے اور کبھی پھر سے نیچے آجاتی ہے۔ بہر حال چونکہ صرف وہی راستہ ہے اسلئے اسکو سڑک کہنا پڑتا ہے۔ وادی کی یہ تنگ دامانی تقریباً ستر کلو میٹر تک مسلسل چلتی ہے۔ آپ کو چاروں اوٹ بلند چٹانیں اوپر آسمان اور نیچے بہتا دریا نظر آتا ہے۔ ہاں! ستر کلو میٹر پر بونی کا شہر آتا ہے۔ جو تحصیل ہیڈ کوارٹر ہے اور اپنی شادابی و خوبصورتی کے لئے بہت مشہور ہے۔ بونی کا فروٹ بے مثال ہے اور یہاں آکر وادی کھل جاتی ہے۔

اس طرف بھی سارے علاقے میں (A.K.R.S.P) "آغا خان رورل سپورٹ پروگرام" کے بورڈ لگے ہیں۔ پانی کی سکیمیں' سڑکیں' ہسپتال' سکول غذا' دوا کا اہتمام آغا خان فاؤنڈیشن کی طرف سے ہوتا ہے مگر یہ سب کہنے کو ہے دراصل آغا خانی یا اسمٰعیلی شیعیت پر لوگوں کو قائم رکھنے کے لئے یہ ایمان خریدنے کے ہتھکنڈے ہیں۔ آغا خاں سوم سلطان محمد شاہ ہیروں کے بہت بڑے سمگلر تھے۔ ان

سب علاقوں میں ان کا اثر امراء سے جواہرات حرید کر پیرس سمگل کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یہ لوگ حاضر امام کے قائل ہیں اور امام میں اللہ کا حلول مانتے ہیں۔ مسجد کی جگہ جماعت خانہ بناتے اور صبح ایک ہی رکعت نماز پڑھتے ہیں جس میں امام کو سجدہ کرتے ہیں۔

یہاں فاؤنڈیشن ان کے لئے اس طرح سرگرم عمل نہ تھی۔ بلکہ اپنے کارندوں کو محض کرایہ وغیرہ دیتی تھی۔ ۱۹۸۲ء میں جمیعت العلمائے اسلام اور جماعت اسلامی کے حضرات نے مل کر آغا خانیوں کے خلاف چترال میں تحریک چلائی۔ خوب جلسے ہوئے' نعرے لگے' فتوے صادر ہوئے۔ آخر کار لڑائی ہوئی' پانچ آغا خانی مارے گئے جبکہ چار مسلمان بھی کام آئے۔ جنہیں اس وقت شہید کہا گیا مگر بعد میں بات بدل گئی۔ کچھ لوگ گرفتار ہوئے۔ تفتیش ہوتی رہی۔ بریگیڈیئر صاحب جو مارشل لاء کمانڈر تھے انہوں نے طے کیا کہ دونوں طرف سے لیڈروں پہ مقدمات چلائے جائیں۔ عام لوگوں کا قصور نہیں۔ چنانچہ نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ علماء اسلام اور آغا خانی لیڈر جمع ہوئے تصفیہ اور صلح نامہ لکھ کر حکومت کو دیا گیا۔ جس میں لکھا گیا کہ فساد شر پسندوں نے کیا تھا ہم دونوں مسلمان ہیں اور آئندہ بھی امن سے رہیں گے چنانچہ شہداء تو شر پسندوں میں شامل کئے گئے اور آغا خانی مسلمان تسلیم ہوئے۔ جماعت اسلامی اور جمیعت کے چترال کے صدور نے دستخط کئے اور یوں علماء کی جان بچی۔

یہ تو خاموش ہو گئے مگر آغا خان نے تب سے فکر کرنا شروع کیا۔ وہاں فاؤنڈیشن بنائی' جو دنیا کے تمام ممالک سے چندے لیتی ہے اور شمالی علاقہ جات میں کام کرتی ہے۔ پہلا منصوبہ چھتیس کروڑ کا تھا جو وہ مکمل کر چکے ہیں اور اب بیاسی کروڑ کے منصوبے پر کام ہو رہا ہے۔ اسی سے زائد نئی گاڑیاں اور کئی ہیلی کاپٹر فاؤنڈیشن

کے اپنے ہیں۔ جگہ جگہ انہی کے بورڈ نظر آتے ہیں۔ اب یہ فاؤنڈیشن دنیا بھر کے ممالک سے شمالی علاقہ جات کے نام پر امداد جمع کرتی ہے اور خود عیش کرتی ہے۔ کم از کم یہ موؤیں ہیلی کاپٹر اور سارا عملہ تو اسی سے پلتا ہے پھر پرنس خود بھی شہنشاہ مزاج ہیں اور کروڑوں پاؤنڈ کا جوا کھیلتے ہیں۔ ویسے بھی بہت امیر آدمی ہیں۔ بہر حال ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جہاں مدرسہ بنایا' آغا خانیوں کے بچے بھی پڑھنے آگئے اور جو دوا بانٹنا شروع کی تو اکثریت آغا خانیوں کی لینے آئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انگریزی میں بورڈ بھی غیر ملکیوں کو دکھانے کے لیے ہے کام کم ہی ہوتا ہے مگر پھر بھی کافی کچھ کر رہے ہیں۔

ہم بونی پہنچے۔ باغات میں گھرا ہوا خوبصورت شہر' یہاں کے سیب بہت مشہور ہیں۔ انگور بڑا مزیدار ہوتا ہے۔ خوبانی' ناشپاتی' آڑو' غرض پھلوں اور پھولوں کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چنار کے قد آور درخت' جس درخت کے نیچے ہمارے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ وہ صدیوں پرانا ہو کر گر چکا تھا۔ شاید کئی بار اس کا تنا کاٹا گیا اور کئی بار اگا۔ یوں پھیلتا رہا۔ اب اسکے گرداگرد ایک تنے سے اٹھارہ مضبوط اور قد آور چنار کھڑے تھے۔

یہاں کچھ دیر آرام کیا' کھانا کھایا اور ظہر مسجد میں جا کر ادا کی۔ جہاں مولوی صاحب اور چند دوست پہلے سے ذکر کرتے ہیں۔ بیان ہوا' مختصر تھا' کہ معیت رسالت ہی مسلمان کا سرمایہ افتخار ہے اور ہم میں سے ہر ایک اسکا مدعی بھی ہے اللہ کرے' سب کو نصیب ہو' مگر قرآن حکیم نے اس کے اثرات ارشاد فرمائے ہیں جو ظاہرا انسان پر مرتب ہوتے ہیں اور عبادات' معاملات' اخلاقیات سیاسیات وغیرہ مین نظر آتے ہیں برکات معیت کے باعث گناہ سے نفرت اور نیکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ اعمال میں خلوص اور للّٰہیت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز حیات دنیا میں چہرے پہ

تجلیات باری رقص کرتی ہیں۔

محفل ذکر کے بعد احباب سے اجازت لی اور آگے روانہ ہوئے۔ یہاں سے نکل کر وادی کھل جاتی ہے اور ایک عجیب صورت اختیار کرتی ہے۔ دریا سانپ کی طرح بل کھاتا ہے۔ پہاڑ کے ایک طرف جاتا ہے تو دوسری طرف بہت بڑی تکون بن جاتی ہے۔ جس پر شہر آباد ہوتا ہے پھل پھول اور کھیتیاں ہوتی ہیں پھر دریا دوسرے پہاڑ کو جا چھوتا ہے۔ اور جب پلٹتا ہے تو دوسری طرف تکون چھوڑ دیتا ہے جس پر انسانی آبادی اپنے قدم جمالیتی ہے۔

ایک جگہ سڑک، ایک بلندی پہ چڑھی تو دیکھا دور تک آری کے دندانوں کی طرح دونوں پہاڑوں کے دندانے بڑھے ہوئے تھے۔ درمیان میں دریا حد فاصل کا کام کر رہا تھا اور ہر دندانے پہ اک گاؤں آباد تھا۔ پیچھے ترچھ میر کی چوٹی بادلوں سے جھانک رہی تھی۔ جو چترال کے سر پر ہے اور دائیں طرف پاؤل پیکس' Powell) (Peaks- یہ تین بلند چوٹیاں ایک ہی سلسلہ کوہ سے متعلق ہیں۔ جو پاول کے نام پہ مشہور ہیں۔ ایک سڑک پہاڑی کے اوپر چلی جاتی ہے۔ اور طور کوہ' معکو کو جاتی ہے جو تحصیل ہیڈ کوارٹر ہیں اور بونی سے ساٹھ کلو میٹر پہاڑوں کے اوپر ترچھ میر کے عقبی دامن میں آباد ہیں۔

ہم چلتے رہے۔ وادی کے حسن کو آنکھوں میں سمیٹتے۔ کبھی کبھی ڈاکٹر کیمرے کی ٹیپ پر بھی چیزوں کو ثبت کر لیتا تھا اور یوں عصر کے وقت ہم مستوج پہنچے۔ یہاں سے دریائے چترال دو حصوں میں بٹ جاتا ہے ایک شندور پاس کو جاتا ہے اور دوسرا بروغل پاس کو بروغل کا درہ یہاں سے ایک سو چالیس کلو میٹر ہے جس میں بیس کلو میٹر جیپ کا راستہ ہے اور باقی پیدل یا گھوڑے پر طے کیا جاتا ہے یہ بروغل واخان کی سرحد کے ساتھ منگولوں کی سر زمین میں داخلے کا دروازہ ہے۔ عنایت اللہ فیضی صاحب

یہاں تشریف لے گئے تھے۔ کچھ حالات انہوں نے ستمبر کے شمارہ الرشد میں لکھے ہیں۔ جس میں زر علی کا حال لکھا ہے کہ وہ جانتا ہے مسلمان ہوں مگر اسے کلمہ نہیں آتا۔ بندہ نے اس کے لئے فیضی صاحب کو کچھ رقم دی اس کے ایک بچے کو مزدوری چھڑا کر تعلیم پہ لگایا جائے۔ اسکا وظیفہ دار العرفان سے مقرر کر دیں گے تاکہ پڑھنے کے بعد اسی علاقہ میں لوگوں کو دین سکھانے کے کام پر لگایا جاسکے گا' انشاء اللہ!

دریا کی دوسری شاخ شندور پاس کی طرف مڑ جاتی ہے جدھر ہمیں جانا تھا مستوج گاؤں سے نکل کر عصر ادا کی چل دیئے۔ وہی کنار دریا' وہی سڑک کی تنگی وہی ہم۔ کچے راستے کی دھول الگ' دھکے اس پر مزید۔ مگر اللہ کریم کا احسان تھا۔ جس نے ہمت دے رکھی تھی۔ اب سڑک کے ساتھ ساتھ ہم بتدریج اوپر جا رہے تھے اور برفانی چوٹیاں قریب ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ سورج نے پہاڑوں کی اوٹ میں پناہ لے لی تھی لہذا خنکی اور نیم تاریکی نے ماحول کو سحر انگیز بنا رکھا تھا۔ ہم چلتے رہے۔ کنار دریا لوگوں کو' آبادیوں کو' پھولوں کو' جھرنوں اور پہاڑی چشموں کو آبشاروں اور گرتی دھاروں کو دیکھتے۔ حتیٰ کہ مغرب ہو گئی۔

اب ہماری منزل کوئی سات کلو میٹر دور تھی۔ جہاں سے ہم گزر رہے تھے' یہاں "دیدار مبارک" لکڑی کا خوبصورت رنگ برنگا سائبان اور سامنے پنڈال بنا ہوا تھا۔ دیدار مبارک' آغا خانی فرقے کا حج سمجھ لیں۔ آغا خان وہاں کھڑا ہو کر پنڈال میں جمع لوگوں کو دیدار کراتا ہے۔ بعض اوقات کئی سالوں بعد۔

ایک فرانسیسی سیاح لڑکی نے یہ سب سن کر کہا تھا:

"That play boy of Paris is the god for those poor people."

اس نے بھی ٹھیک کہا تھا اور یہاں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔

غرض ہم نے کچھ تاخیر سے مگر بالیم (Baleem) پہنچ کر مغرب ادا کی۔ بالیم گاؤں کے مقابل دریا کے پار سڑک پر یہاں جیپ چھوڑی اور فیضی صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے جن کا گھر تقریباً دو کلو میٹر دریا کے اس پار تھا۔

یہاں اگر چہ بجلی کی روشنی نہیں پہنچی مگر چوری چکاری کا رواج نہیں' لوگ گھروں کو تالا نہیں لگاتے اور مہینوں غیر حاضر رہ کر آجاتے ہیں۔ کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا' کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ بدکاری کا کوئی تصور نہیں۔ اگر چہ بھوک وافلاس ہے دوا نہیں ملتی۔ جدید آسائشوں کا کوئی تصور نہیں مگر یہ سب کچھ دے کر اگر ہمیں ایسا خلوص ایسی محبت کہیں مل سکے تو ہم یہ سودا مہنگا نہیں جانیں گے ؟ سوچ لیں! پھر چاہیں تو چل کر ان لوگوں سے مل بھی لیں۔

بالیم اور لاس پور' دو جڑواں گاؤں ہیں۔ یہ نو ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پہ واقع ہیں' یہاں آکسیجن کی کمی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اور سخت سردی ہوتی ہے سردیوں میں تو منفی چالیس ڈگری تک جاتی ہے بہر حال آج کل بھی رات تو بہت سرد تھی چونکہ درہ ساتھ ہے اس لئے یہاں ہوا بہت زوروں کی چلتی ہے اور سردیوں میں تو ہڈیوں سے ہو کر نکل جاتی ہے۔ ان دنوں بھی تہجد کے وقت باہر بہت سردی تھی۔ بلکہ ہاتھوں اور چہرے کی جلد جل کر سیاہ ہو گئی اور واپس آکر بھی کئی روز سیاہ رنگ جھلکتا رہا۔

رات یہاں بسر کی' صبح تو تعمیر مسجد دیکھنا تھی۔ ذکر کے ساتھیوں سے ملاقات بیان اور محفل ذکر بھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو مریض دیکھ کر ادویات بھی تقسیم کرنا تھیں مگر سب سے اہم کام یہ پتہ چلانا تھا کہ گلگت کو جانے والا راستہ کھلا ہے یا نہیں ؟ یہاں تو کسی کو علم نہ تھا کہ یہاں تو ایک گاؤں کو دوسرے کی خبر بھی کم ہوتی ہے آبادی کی اکثریت آغا خانی ہے۔ ہر گاؤں میں کچھ گھر مسلمان بھی ضرور ہیں۔ مگر

عقائد سے بے بہرہ اعمال سے نا آشنا۔ یہ دور دراز وادیاں اللہ کے نام کو ترستی ہیں کہ نہ مساجد ہیں نہ اذان ہوتی ہے۔

لاس پور میں ایک مسجد ہے وہاں مولانا صاحب بہت اچھے ملنسار اور نیک آدمی ہیں۔ ان کی مسجد کے لئے احباب نے پشاور سے بیٹری والا لاؤڈ سپیکر کا سیٹ بھجوایا ہے۔ اللہ کریم جزائے خیر دے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ اس وادی میں بھی اللہ اکبر کی صدا گونجے۔

۱۲ ستمبر کو علی الصبح ناشتے کے بعد شندور ٹاپ کے لئے روانہ ہوئے تقریباً تین ہزار فٹ مزید اوپر اسی پہاڑ کی چوٹی پر درہ ہے جس کے دامن میں گاؤں ہے مگر اوپر جانے تک کا راستہ چھ کلو میٹر لمبا ہے کہ موڑ پر موڑ سخت چڑھائی اور نہایت تنگ سڑک۔ آدھے راستہ میں ایک موڑ میں جیپ کا ٹوٹا پھوٹا حصہ پڑا تھا۔ جو نیچے سے لایا گیا تھا۔ انجن اور کچھ اور حصے دور نیچے جھاڑیوں میں نظر آرہے تھے۔ یہ مستوج کا ایک دوست تھا۔ جس کے ہاں پچھلے دورے میں احباب نے قیام کیا اور محفل ذکر ہوئی۔ بچارے کی جیپ موڑ سے لڑھک گئی۔ اللہ کریم اپنے دامان رحمت میں جگہ دے! آمین۔

غرض اوپر پہنچے۔ دونوں طرف پہاڑ درمیان میں تقریباً آٹھ دس کلو میٹر میدان سا ہے جس کے ڈھلوان نما حصے پہ تین خوبصورت جھیلیں ہیں۔ پہلی بہت بڑی دوسری اس سے چھوٹی اور تیسری اس سے چھوٹی۔ ان میں مچھلی نہیں ہوتی کہ گرمیوں میں پانی ساکت رہتا ہے۔ اور سردیوں میں جم کر چٹان بن جاتا ہے دونوں طرف چوٹیاں ہیں۔ میدان کی بلندی بارہ ہزار تین سو فٹ ہے۔ بڑی جھیل کے آگے ایک خوبصورت ہٹ میں میس بنا ہوا ہے جس کے سامنے پولو گراؤنڈ ہے۔ یہ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے بنوایا تھا۔ جھیل کے کنارے کنارے گاف کورس ہے پچھلے

دنوں وزیر اعظم پاکستان نے بھی وہاں پولو دیکھا۔ جنرل صاحب مرحوم نے بھی افتتاح کیا تھا جس کی یاد ان کے خوبصورت فوٹو دلا رہے ہیں جو میس کی زینت ہیں۔ ڈرائیوران فوٹوگرافز کو دیکھ کر رو پڑا اور وہی بات بنتی ہے ؎

میرے پاس سے گزر کر میرا حال تک نہ پوچھا
میں یہ کیسے مان جاؤں وہ "شندور" جا کے روئے

شاعر سے معذرت کے ساتھ۔

ایک ڈاکٹر صاحب اور ایک میجر صاحب وہاں مقیم تھے۔ شائد کوئی گاف کا پروگرام بن رہا تھا۔ انکے ساتھ چائے پی اور راستے کا پوچھا۔ انہوں نے فون کر کے پتہ کیا کہ راستہ کہیں گلگت کے قریب سے بند ہو تا تھا۔ پتہ چلا کہ آج کل کھلا ہے گلگت سے گاکوچ تک فوجی جوان سڑک کھلی کر رہے ہیں اس وجہ سے کبھی کبھی راستہ بند ہو جاتا ہے چنانچہ واپس بالیم پہنچے کھانا کھا کر ظہر ادا کی اور عصر تک ڈاکٹر صاحب نے مریض دیکھے پھر عصر کی نماز مسجد میں جا کر ادا کی جس کا سب کام مکمل ہے۔ مگر ابھی اس پر چھت نہیں پڑی اس کے لئے چادروں کی ضرورت باقی ہے۔ تقریباً چھتیس بچے بچیاں قرآن مجید پڑھنے والے تھے۔ جن میں بارہ مسلمانوں کے تھے' باقی آغا خانیوں کے یہ بہت مؤثر طریقہ تبلیغ ثابت ہوا ہے۔

پچیس تیس آدمی بھی جمع ہو گئے تھے۔ ضرورت ذکر پر بیان ہوا اور محفل ذکر بھی اور یوں اس گاؤں کا پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔

ان وادیوں میں جہاں پھلدار درختوں کی بہتات ہے۔ وہاں ایک خوبصورت درخت کا نام لیلیٰ مجنوں ہے۔ اسکا زرو تا رہتا ہے یعنی اس کے پتوں سے قطرے ٹپکتے اور رات دن نیچے کی زمین گیلی نظر آتی ہے۔ اس لئے مقامی لوگ اسے مجنوں اور مادہ درخت کو لیلی کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے "Weeping Tree" بھی کہتے

ہیں مگر اس کا اصل نام ولو (Willow) ہے۔ یہ بہت قیمتی درخت ہے۔ اس سے کھیلوں کا سامان بنتا ہے خصوصاً انگلینڈ کا ولو کا بنا ہوا بیٹ تقریباً دس ہزار کا ملتا ہے۔ یہ درخت شندور ٹاپ سے دوسری طرف گلگت تک بہت کثرت سے ہے۔

یہاں سے ہم ۱۳ ستمبر کو علی الصبح روانہ ہوئے۔ طے یہ ہوا کہ فیضی صاحب کو چترال جانا ہی ہے۔ لہٰذا ہمارا سامان ایئر کارگو سے پشاور بھیج دیں گے اور گلگت سے واپسی پہ ہم لے لیں گے۔ لہٰذا ہم احباب سے رخصت ہو کر روانہ ہوئے بروقت چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں چند لوگ جو مردان سے تھے۔ ایک خیمہ لگائے ہوئے تھے اور ان کی جیپ سردی کے باعث سٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔ انہوں نے روکا اور مدد چاہی۔ پوچھا" بھئی! رسی ہے ؟"

کہنے لگے :"نہیں! اب دھکا ہی لگ سکتا ہے 'چلو! ہمت کرو۔"

ہم سب بھی شامل ہو گئے مگر گاڑی سٹارٹ نہ ہو سکی۔ صرف ٹھنڈ ہی کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہاں آکسیجن کی کمی بھی ایک مسئلہ ہے نہ انسان میں وہ دم خم رہتا ہے اور نہ آگ ہی آرام سے جلتی ہے انجن بھی آسانی سے سٹارٹ نہیں ہوتے۔ بہر حال تقریباً آدھ گھنٹہ محنت کی۔ مگر نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ دیکھا تو سکاؤٹس آرہے تھے 'جو پولو گراؤنڈ ٹھیک کرنے پر کام کر رہے تھے۔ لہٰذا ان سے کہا کہ اب آپ ان کی مدد کریں گزشتہ روز کی واقفیت کام آئی کہ ان کے انچارج آفیسر ہمارے دوست تھے لہٰذا انہوں نے ہمیں فارغ کر دیا۔ دیکھا تو اپنی موٹر کا ایک پہیہ پنکچر تھا۔ تبدیل کیا اور اللہ کے بھروسے پہ روانہ ہو گئے۔

پوسٹ اور جھیلیں پیچھے چھوڑ کر اترائی پر پہنچے تو پتہ چلا کہ بہت سخت اترائی ہے۔ ہم گلگت کے علاقہ میں داخل ہو چکے تھے۔ بڑا ہی تنگ راستہ مگر دونوں طرف جنگلی گلاب کی جھاڑیاں اور ان میں کئی رنگوں کے پھول' چھوٹی سی نالی پانی لے کر نیچے

بچپن کی ایک یادگار تصویر

لڑکپن کا ایک انداز

کو بھاگ رہی تھی۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ یہ بکھرا ہوا دریا گلگت سے گزرے گا جو فی الحال تو محض چند قطرے نظر آتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا۔ پہاڑی نالے اس میں شامل ہو کر اسے تقویت پہنچانے کا باعث بنتے رہیں گے۔

کافی اترائی کے بعد نیچے پھر میلوں میں پھیلا ہوا میدان جس کے دونوں طرف برف پوش چوٹیاں تھیں اور اس میدان میں دریا نہ سہی مگر ایک خوبصورت ندی ضرور بن چکی تھی جس کے گرد سبزہ اور خودرو جھاڑیاں تھیں۔ پانی میدان میں پھیل پھیل جاتا تو سبزہ بند باندھنے کی کوشش کرتا نظر آتا۔

اس سبزے پر ان جھاڑیوں میں یاک اور گائے ' بیل اکٹھے چرتے پھر رہے تھے۔ یاک ایک جنگلی گائے ہے جو وزن میں بھینس کے برابر ہوتی ہے۔ نوکدار لمبے بال اور گھوڑے کی طرح دم ' مقامی لوگ اسے پال لیتے ہیں۔ پھر دودھ بھی استعمال کرتے ہیں ' سواری اور باربرداری کا کام بھی لیتے ہیں۔ گوشت بہت لذیز اور ہرن کے گوشت کی مانند نرم ہوتا ہے۔ اصلاً یہ برف میں رہنے والا جانور ہے۔

اس وادی میں سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک چشمہ ہے جس میں کوئی معدنی اثر ہے لوگ اسکا پانی پیتے ہیں تو کئی سال گیس کی تکلیف نہیں ہوتی اور عجیب بات یہ ہے کہ چشمے سے نکل کر اس میں وہ اثر نہیں رہتا۔ اسی جگہ پی لیا جائے تو ٹھیک ورنہ جس قدر بھی بند کر کے رکھو اس میں سے ترشی بھی رخصت ہو جاتی ہے اور اثر بھی۔ ہم وہاں نہ جا سکے کہ عموماً اس کے پینے سے پیٹ خراب بھی ہو جاتا ہے اور آدمی فوراً سفر نہیں کر سکتا۔ ہمارے پاس رکنے کے لئے وقت نہ تھا۔

وادی سے قراقرم کی مختلف چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ شمالی چوٹی کا نام دس پار اور بلندی ۲۴۰۴۷ فٹ ہے۔ جب یہ وادی ختم ہوئی تو گلگت کی پوسٹ تھی انہوں نے گاڑی چیک کی۔ دو سپاہی ' پولیس کی وردی میں ایک پرانے سے ٹینٹ کے پاس

کھڑے تھے۔

پوچھا: "ہمارا پہیہ پنکچر ہے کہیں قریب انتظام ہوگا؟"

کہنے لگے: "پھنڈر میں پنکچر لگ جائے گا۔'

"بھئی کتنا دور ہے؟"

وہ کہنے لگے۔ "گھنٹے بھر کا راستہ ہوگا۔"

یہ کوئی نو بجے کا عمل ہوگا مگر پورا زور لگا کر ہم ڈیڑھ بجے کے آس پاس پھنڈر سے گزرے جو واقعی نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ دکانیں تھیں مگر پنکچر لگانے کا کوئی اہتمام نہ تھا۔ انہوں نے ہم سے جھوٹ ہرگز نہ بولا تھا۔ یہ صرف ان کی سادگی تھی جو برسوں سے ایسی جگہ رہ کر حاصل ہو گئی تھی جہاں سوائے سادگی کے کچھ نہیں ملتا۔ اور اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب کئی روز بعد ہم گلگت داخل ہوئے تو پکی سڑک' موٹریں' بجلی' دکانیں اور شہری آبادی ہاں! واقعی گلگت بھی شہر لگ رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر محسوس ہوا کہ ہم شاید برسوں تہذیب سے بیگانہ رہے ہیں اور جنگلوں ہی میں گھومتے پھرے ہیں۔ سب کچھ بالکل عجیب لگ رہا تھا۔ اگر ڈیڑھ ہفتے کا یہ اثر ہم پر ہو سکتا ہے تو جن کی عمریں وہاں بیت رہی ہیں۔ ان کا حال کیا ہوگا؟

پولیس چیک پوسٹ سے لے کر آگے راستہ بہت ہی تنگ ہو جاتا ہے۔ اس قدر تنگ کہ اگر سامنے سے گاڑی آجائے تو دونوں میں سے ایک کو میلوں پیچھے جانا پڑتا ہے وہ بھی ریورس میں' مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ یہاں گاڑیوں کی ملاقات شاذونادر ہی ہوتی ہے۔ سڑک کسی آبشار کی طرح بلندیوں سے گرتی چلی جاتی ہے۔ پہاڑوں کے وسط میں تیرو نامی گاؤں آتا ہے جس میں سے سڑک یوں گزرتی ہے کہ پورے شہر کے اندر سے نکل جاتی ہے اور شہر کو چھوتی بھی نہیں۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر دو دو تین تین بکھرے ہوئے سادے گھر اپنی الگ بہار رکھتے ہیں۔ پہاڑی کے گھاؤ میں پانی بھرا

کھڑا تھا' جو اسکی چوٹی سے آرہا تھا۔ اس خوبصورت جھیل کے کنارے ایک چی اور اندر مرغابیوں کی ڈار تھی اور کنارے کنارے ہمارا راستہ مگر ہر کوئی اپنی حالت میں محو تھا شاید میرے سوا۔

یہاں سے نیچے دریائے غذر نظر آتا ہے جس میں وہ چھوٹا دریا بھی مل جاتا ہے جو ہمارے ساتھ آرہا تھا اور دوسری وادی سے آنے والا دریا بھی۔ غذر ایک گاؤں ہے جو پہاڑ کے قدموں میں نہایت خوبصورتی سے سجا ہے اور بہت معروف ہے شاید خضر کی بگڑی ہوئی شکل ہے دریا اور وادی دونوں ہی کو غذر کہتے ہیں۔ مگر صاحب نہ کوئی وادی اتنی حسین ہوگی اور نہ کوئی دریا اسقدر پیارا۔ اتنی بلندیوں پہ وادیوں میں وسعت کا تصور نہیں۔ مگر یہ وادی تو جہاں سے کم چوڑی ہے وہاں بھی ایک کلو میٹر تو ہوگی کہیں دو بھی اور جس قدر وادی پھیلتی ہے' دریا اسی قدر پاؤں پسار لیتا ہے ایک سے دو اور دو سے دس بن جاتا ہے۔ نیلا شفاف پانی ٹراؤٹ مچھلیوں کا خزانہ' پھولوں سے بھرا ہوا' پھلوں سے لدا ہوا' فصلوں سے پر' ہر طرف زندگی' ہر طرف سادگی' ہر طرف بہار' سنا ہے انگریز بہادر اسے "چھوٹا کشمیر" (Little Kashmir) کہا کرتا تھا۔ اگر کشمیر بھی ایسا ہی ہے تو واقعی بہت خوبصورت ہے مگر یہ بات نہ بھولنے گا کہ یہ سب پاکستان کا حصہ ہے جگہ یہاں کچھ بھی نہیں نہ سڑک' نہ ہسپتال' نہ سکول نہ بازار' گویا ملک کے اندر رہنے والے لوگ ایک طرح سے ملک سے باہر رہتے ہیں۔ محض قدرتی موسموں کے رحم و کرم پر پاک سرزمین پر کوئی اللہ کریم کا نام بتانے کی زحمت بھی نہیں کرتا' اکثریت آغا خانیوں ہی کی ہے جو اپنے اپنے کھیتوں میں کام پر لگے تھے کہ آج کل فصل سمیٹنے کے دن ہیں کام زیادہ تر خواتین ہی کرتی ہیں۔ عموماً صبح سویرے ہر خاتون' ہر بچی کمر پر ایک خاص ٹوکری اٹھالیتی ہے جو ان کے لباس کی طرح روزانہ ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ مختلف اشیاء اٹھانے کے کام آتی ہے۔ اسلام کے علاوہ

پاکیزگی کا تصور نہیں لہٰذا یہ اسمٰعیلی یا آغا خانی بھی دریا کنارے رہتے ہوئے بھی مہینوں غسل نہیں کرتے۔ خواتین تو ترکی ٹوپی کی طرح بنی ہوئی ٹوپی دوپٹے کے نیچے پہنتی ہیں اور لباس بھی موٹا ہوتا ہے جس کی وجہ سے عجیب سی بدبو آتی ہے۔ اگر کسی خاتون کی ٹوپی اتر جائے تو کرہ تو الگ رہا انسان شاید اس کھیت میں بھی کھڑا نہ ہو سکے۔ یہ انسانیت کی روحانی ویرانیوں کا حال ہے۔

دنیا کے اعتبار سے وہاں کسی جدید سہولت کا نام نہیں۔ اسکے باوجود محنت کرنے والے کسان بھوکے نہیں رہتے۔ بھیڑوں اور بکریوں کے گلے بیلوں اور گایوں کے غول دریا کے بنائے ہوئے جزیروں میں چرتے پھرتے تھے۔

اس وادی میں ہمیں کوئی کوئی گاڑی سامنے سے بھی ملنے لگی۔ جن میں چند ایک آغا خان فاؤنڈیشن کی جیپیں تھیں اور ایک آدھ گلگت سے آنے والی سواری کی موٹر یہ بھی ولی جیپ ہی ہوتی ہے یا لینڈ کروزر مگر یہاں گاڑیاں گزارنے کی جگہ تھی۔ جب ہم عین وادی میں پہنچے تو رہا نہ گیا۔ موٹر روک کر دریا کے اندر اتر گئے۔ موجوں سے لڑتی ہوئی ایک چٹان پر ڈیرہ لگا کر تھرماس کھولا تو چائے خراب ہو چکی تھی کہ جہاں سے ہم چلے تھے وہ بیچارے کھانے پکانے سے بھی کم ہی واقف تھے انہوں نے پتی سمیت چائے تھرماس میں ڈال دی، جو بدبو دے رہی تھی چنانچہ دریا کے پانی میں اپنے ہاتھوں بہائی۔ مجھے چائے بہت پسند ہے۔ پھر سفر بھی مسلسل اور دوپہر ہو چلی تھی دریا کا دامن مگر مجبوری، وہ شعر بہت یاد آیا۔

اے محتسب نہ پھینک، ارے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

مگر مجبوری تھی، کھانا دیکھا، وہ بھی خراب ہو چکا تھا۔ صرف چند دوستوں کی یاد تھی جو تازہ تھی اور بس۔

الغرض چلتے رہے پھنڈر بھی پہنچ گئے مگر یہ بھی ایک ویرانہ تھا ہاں پانچ سات دکانیں سرراہ تھیں جن میں آٹا دال مل جانے کی امید کی جا سکتی تھی ایک کچے سے کوٹھے پر غالباً "سدا بہار ہوٹل" کا بورڈ لگا تھا اور دروازے پہ تالا۔ ایک دکان کے باہر لیٹر بکس بھی نظر آیا۔ یہ تھی پھنڈر کی شہریت اور بس۔

ہم گزر گئے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

راستہ اور اس کے گرد سڑک کی ناپختگی کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر دھکے۔ یہ اللہ کریم کا شکر ہے گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی لہٰذا شیشے چڑھا رکھے تھے۔ بہر حال صبح سے فاقہ مستی کا نشہ بڑھ رہا تھا مگر عجیب بات ہے شوگر کے مریض کے لئے بغیر خوراک کے قدم اٹھانا دوبھر ہوتا ہے اور اسکی آنکھوں میں اندھیرا آجاتا ہے مگر وادی کا حسن اس قدر بے پناہ تھا کہ مجھے فاقہ بھول گیا۔

بالآخر ہم دو بجے کے قریب اس نالے پر پہنچے 'جہاں پل خراب اور راستہ بند رہتا تھا۔ لکڑی کا معلق پل تھا۔ شاید کوئی گاڑی گری تھی کہ کنارے ٹوٹ چکے تھے۔ ٹھیکیدار کے آدمی وہاں تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ سواریاں اتر کر پیدل پل عبور کریں۔ یہ نالہ بائرتھ کہلاتا ہے۔ اچھا خاصا دریا اس جانب سے آکر دریائے غذر میں مل رہا تھا۔ اس نالے میں ساری آبادی گجر قوم کی ہے جو انتہائی غربت اور کسمپرسی کا شکار ہے۔ ہم نے پل عبور کیا یقیناً جان پر کھیل کر گاڑی کو پل پر چڑھانا آسان نہ تھا۔ ایک نقص یہ تھا کہ وہاں چھوٹی جیپیں چلتی ہیں جبکہ ہمارے پاس پجارو تھی 'جو ان سے بڑی تھی۔ بہر حال اللہ کریم کا شکر ہے کہ سلامتی سے پار اتر گئے۔ پھر سے سب کو بٹھایا اور چل دیئے کوئی پندرہ منٹ چلنے کے بعد میر کی جیپ آتی ہوئی نظر آئی 'جو ہمارے استقبال کو تشریف لا رہے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور مسلسل چلتے رہے۔

تقریباً اڑھائی بجے ہم گوپس پہنچ گئے۔ شندور سے یہاں تک یہ ایک سٹیٹ تھی جس کا دارالخلافہ گوپس تھا۔ غالباً یہ ریاستیں ۱۹۷۵ء میں بھٹو صاحب نے ختم کی تھیں۔ ہمارا عارضی قیام ریاست کے سابق حکمران صاحب کے در دولت پہ تھا جو ایک نیک دل اور کھرے انسان تھے۔ اب فوت ہو چکے تھے۔ انکے صاحبزادے راجہ اصغر حسین صاحب گھر پہ تھے۔ محل نما مکان میں ان کے کمرے تک جانا جائے خود ایک بڑا کام تھا۔ ظہر ادا کی۔ چائے، پھل اور ٹراؤٹ سے تواضع فرمائی۔ بہت محبت سے پیش آئے ان کی نواسی بیمار تھی جو چند ماہ کی تھی ان کے پاس دوا بھی تھی جو اسلام آباد سے لائے تھے۔ مگر نہ بیماری کا پتہ نہ دوا کے متعلق بتانے والا۔ ڈاکٹر صاحب نے بچی کو دیکھ کر بتایا کہ اسکی دوا یہی ہے اور یہ اسکا طریق استعمال ہے۔ تو بہت خوش ہوئے۔ جب حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ تو عام آدمی کا حال کیا ہو گا۔

عرض کیا کہ میں نے تو یہ سارا سفر یہ دیکھنے کے لئے اختیار کیا ہے کہ لوگوں کا حال کیا ہے اور ہم ان کے کس کام آ سکتے ہیں؟ انہوں نے وعدہ فرمایا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کو ادویات دے کر روانہ کریں ہم گاؤں گاؤں ساتھ جائیں گے 'لوگوں کو دین بتانے والا کوئی نہیں' ہو سکے تو اسکا اہتمام کریں۔ چنانچہ ان کے خلوص نے بہت متاثر کیا۔ وہاں سے چلے تو ان کے داماد ساتھ تھے جو حلقہ ذکر کے پرانے ساتھی ہیں۔ ان کا نام شیر اسلام ہے۔ انہوں نے دریا کنارے ایک مسجد میں چاء کا اہتمام کر رکھا تھا۔ جیسے آپ ایک پل پر سے گزریں انگور کی بیلوں میں ڈھکی ہوئی چھوٹی سی مسجد ہے۔ گاؤں کا نام "بج بارگو" ہے۔ اور اس کا واحد مالک شیر اسلام کا چچا ہے باقی سب لوگ اس کے مزارعہ ہیں۔ بہت لطف آیا۔ کچھ پھل کھائے۔ حتیٰ کہ مغرب بھی وہیں ادا کی اور پہاڑوں کی اوٹ سے نکلتے ہوئے چودھویں کے چاند کو دیکھا گئے۔

یہ بج بار گو گو پس ریاست کا آخری گاؤں ہے یہاں سے آگے نپیال کی ریاست شروع ہو جاتی ہے اور ایک وادی دوسری طرف مڑتی ہے جس میں الگ ریاست یاسین نامی تھی یہ واخان بارڈر تک جاتی ہے اگرچہ یہ سب ریاستیں سابقہ ہو چکی ہیں مگر سابق حکمرانوں کے بعد بھی ان کا کوئی پرسان حال نہیں' ہر وہ شے جو قدرتی طور پر پلتی ہے خوبصورت ہے اور ہر وہ کام جو انسانی توجہ کا محتاج ہے' قابل رحم حالت میں ہے۔

یہاں سے دس بارہ میل "گاگوچ" تھا۔ جہاں میر صاحب کے ریسٹ ہاؤس میں ہمارا قیام بھی تھا اور طعام بھی۔ رات یوں گزر گئی' جیسے آئی نہ تھی۔ کام' محنت اور مشقت' یہ سب چیزیں مشکل تو لگتی ہیں مگر ان میں دہری لذت بھی ہے کام کر کے ایک منفرد سا ٹھنڈا ٹھنڈا لطیف اور مزیدار احساس پیدا ہوتا ہے اور جب نیند آتی ہے تو لوریاں دیتی ہیں۔ عجیب بات ہے صبح' نقشے' چارٹ' راستہ پروگرام سب کچھ دیکھ کر پھر ناشتہ اور وہی ویران راستے تھے اور ہم تھے لیکن یہاں سے گلگت تک راستہ تنگ نہیں رہا تھا' فوج کے جوانوں نے خوب کھلا کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک چھوڑ' دو موٹریں بھی پہلو بہ پہلو چل سکتی تھیں مگر تا حال ذرا ہموار نہ تھا لہٰذا رفتار تو وہی تھی اور کچھ ان حسین وادیوں میں بھاگنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ بھلا کوئی حسن سے بھی بھاگا کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

تھوڑی دور سر راہ فوجی جوانوں کا کیمپ تھا۔ سب کے لئے سہولتیں فراہم کرنے والے سب کے محافظ' سب سے الگ ڈیرہ ڈالے پڑے تھے' دن بھر کام کر کے رات یہاں آرام کرتے۔ شاید شہر کے باسی تو وہاں رہنا سزا سمجھیں' مگر ان کے لئے وہی آرام تھا۔ ہم چلتے رہے' دریا بل کھاتا رہا اور سڑک بھی اس کے پہلو بہ پہلو لپٹتی چلی گئی۔ آبادیاں آتی اور گزر جاتی تھیں۔ جماعت خانے آغا خانی فاؤنڈیشن کے

نشانات اور مساجد سے محروم گاؤں۔ حتیٰ کہ ایک جگہ 'ایک معاون نالے پر ٹرک پھنسا ہوا تھا۔ یہ پل بھی فوجی جوانوں نے عارضی بنایا تھا۔ ایک خاص قسم کے گارڈر اور ان پر اسی مقصد کے لئے بنی ہوئی خصوصی چادریں۔ مگر چادریں کم تھیں ایک جگہ سے چادر بیٹھ گئی اور ٹرک کا پہیہ نیچے چلا گیا۔

ہم جیپ کھڑی کر کے دریا کنارے پتھروں پہ بیٹھ کر چاء پینے لگے۔ ایک فوجی حوالدار صاحب نظر آئے جنہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک پل کے سامان سے تین پل بنائے ہیں' جو سب ہی ضروری تھے۔ ان کے تین بلڈوزر تیل کے لئے رکے ہوئے تھے۔ بس اسی رفتار سے وہاں کام ہو رہا تھا۔

الغرض دو گھنٹے ضائع کر کے وہاں سے نکلے تو گاپور جا کر رکے۔ میجر شمس کا گھر تھا۔ گھر والوں کو ذکر کروایا۔ کچھ بچیوں نے بیعت کرنا تھی۔ انہوں نے اصرار تو بہت کیا کہ ظہر پڑھ کر چلے جانا مگر ہم رک نہ سکے۔ اور یوں ظہر گلگت پہنچ کر ادا کی۔ آج ۱۴ ستمبر تھی اور ہم نے ۶ ستمبر کو پکی سڑک چھوڑی تھی ان نو دنوں میں ہم خود کو ویرانوں کا حصہ سمجھنے لگ گئے تھے اور تارکول بچھی سڑک بجلی کے کھمبے گلیاں اور چوک 'آدمیوں کی کثرت' دوکانیں یہ سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ الحمد للہ!

ہم گلگت پہنچے 'ظہر ادا کر کے کھانا کھایا' آرام کیا اور عصر کے بعد مدرسہ دیکھنے اور علماء حضرات کی زیارت وملاقات کو چلے گئے۔ میں نے ان حضرات کا تذکرہ پہلے کیا ہے ایسے لوگ وہاں رب کریم کا انعام لگتے ہیں کہ ان ویرانوں میں لوگوں کو اللہ کا دین سکھانے کا عظیم کام کر رہے ہیں۔ رات کو احباب کے ساتھ محفل ذکر تھی۔

علی الصبح ذکر کے بعد درس قرآن ہوا۔ ہم نے ناشتہ کیا اور ۱۵ ستمبر کو گلگت سے خنجراب کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ وسیع اور پکی سڑک ہے جو پاکستان آرمی نے چین کے اشتراک سے بنائی ہے اور واقعی دنیا کا آٹھواں عجوبہ اور دور حاضر کی

انجینئرنگ کا کمال ہے۔ گلگت سے تقریباً پچیس کلو میٹر تک سنی شیعہ اور اسمٰعیلی آبادی ملی جلی ہے۔ اس سے آگے دو ریاستیں شروع ہو جاتی ہیں جن کو خنجراب سے آنے والا دریا جدا کرتا ہے۔ جاتے ہوئے دائیں ہاتھ نگر یہ خالص شیعہ ریاست ہے۔ گھر گھر اور شہر شہر امام باڑے ہیں مگر مسجد کا نام نہیں اور دوسری طرف ہنزہ۔ یہ خالص آغا خانی یا اسمٰعیلی ریاست ہے جس میں جماعت خانے ہیں مساجد کا نام نہیں۔ یہ تقریباً دو سو پچاس کلو میٹر پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔

ہنزہ کا صدر مقام علی آباد ہے۔ یہاں اب ایک مسجد بنی ہے اور ایک آدھ گھر مسلمان ہوا ہے۔ بہر حال یہ میلوں پر پھیلا ہوا وسیع اور حساس علاقہ 'جو ایک طرف سینکڑوں میل واخان کی سرحد سے ملتا ہوا چلتا ہے۔ پھر چین کی سرحد کے ساتھ ہوتا ہوا ہندوستان کی سرحد کو جا چھوتا ہے جس میں کشمیر کا متنازعہ بارڈر بھی ہے۔ تقریباً سارا ہی اسی طرح سے ہے کم از کم چترال سے گلگت' سکردو اور بہت نیچے تک سوائے شیعہ اور آغا خانیوں کے کوئی نہیں بستا۔ زندگی کی کوئی آسائش نہ مذہب کا کوئی نشان۔ یہ دیس اندر پردیس ہے۔ ایسے لگتا ہے ہے جیسے جنوں کی آبادیاں ہوں یا کوئی اور کسی دوسری دنیا کی مخلوق بستی ہو۔

کیا میرے ہم وطن اس طرف متوجہ ہوں گے ؟

ہم آبادیاں دیکھتے حالات کا مشاہدہ کرتے اور راستہ طے کرتے چلے گئے۔ سڑک کنارے چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں جو فوجی جوانوں نے بنائی ہیں اور اب بھی سڑک کی مرمت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ ہم نے کھانا خنجراب پاس پر پہنچ کر کھایا جو سولہ ہزار فٹ بلندی پر ہے۔ یہاں سے شاہراہ قراقرم چین میں داخل ہوتی ہے۔ ہم کھانا کھا چکے تو چین کی طرف سے بس آگئی جس میں چینی کسٹم اور فوج کے چند لوگ بھی تھے۔ باقی پاکستانی کچھ غیر ملکی سیاح تھے۔ ان سے گپ شپ رہی اب واپسی تھی۔ جیپ

واپس روانہ کر کے میں نے پیدل چوٹی پہ چڑھنا شروع کر دیا' جو وہاں سے مغرب کو تھی۔ آہستہ آہستہ بلند بھی ہوتی جا رہی تھی اور دور بھی۔ ڈاکٹر صاحب ڈرائیور اور ایک مقامی ساتھی ارشاد صاحب ساتھ تھے۔ جوں جوں قدم اوپر اٹھ رہے تھے 'اعصاب ٹوٹ رہے تھے مگر ہم بڑھتے رہے اور یوں تقریباً دو ہزار فٹ مزید بلند ہوئے تو خوبصورت یاک چرتے ہوئے پائے۔ مگر اختر اور ارشاد کا چہرہ پیلا پڑنے لگا' ان کی نگاہ بھی متاثر ہونے لگی۔ یہ سب آکسیجن کی کمی کا اثر تھا۔ اس کی وجہ سے اعصاب کام چھوڑنے لگتے ہیں۔ دماغ متاثر ہوتا ہے تو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت میں فرق پڑنے لگتا ہے' نگاہ خراب ہونے لگتی ہے بلکہ ایک کے دو نظر آنے لگتے ہیں چنانچہ ان دونوں کو نیچے روانہ کر کے ڈاکٹر صاحب اور میں کچھ دور بڑھتے گئے۔ ہم تقریباً انیس ہزار فٹ بلند ہو چکے ہوں گے کہ واپسی کی ٹھانی اب ہماری طبیعت بھی مضمحل ہونے لگی تھی اور اعصاب پر شکستگی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ لہذا نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اور چوٹی سے غالباً پانچ چھ کلو میٹر نیچے جیپ سے آ ملے۔ ظہر ادا کی کہ اترتے ہوئے راستہ میں وضو تو کر ہی لیا تھا خوب ٹھنڈا پانی تھا لطف دے گیا۔

اب واپسی کا سفر شروع ہوا' جو رات کو ختم ہوا اور یوں رات گلگت بسر کر کے ۱۶ ستمبر کی صبح ہم واپسی کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہی قراقرم کی شاہراہ اور وہی ہم سالوں پرانے رفیق' وہ ہماری واقف' ہم اسکے جاننے والے مگر اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ پتہ چلا کہ عہد محمد خانی میں جمہوریت نے سول کے سپرد کر دی تھی۔ ٹھیکیدار بل وصول کرتے رہے مرمت نہ کی۔ لہذا سڑک ختم ہو گئی۔ اب پھر فوج کو مرمت کا حکم ہوا ہے جو بڑے زور شور سے کام کر رہی ہے اور یوں نئی سڑک بنتی جا رہی ہے۔ ہم نے داسو سے نکل کر لب سڑک اور لب دریا کھانا کھایا جو

جیب میں رکھا تھا۔ چائے پی' وضو کر کے ظہر ادا کی اور عصر کے وقت ہم بشام پہنچ چکے تھے' جو وہاں سے پچیس کلو میٹر پر تھا۔ کوٹ سے سڑک دریا چھوڑ کر پہاڑوں پہ چلی جاتی ہے اور ایبٹ آباد جا کر نکلتی ہے مگر ہمیں بشام سے سوات جانا تھا۔ لہٰذا ادھر مڑ گئے۔ آج کل وہاں اپنے ایک عزیز بطور ایس پی تعینات ہیں۔ انہیں فون کر کے اطلاع دی تھی۔

سڑک ایک دم چڑھائی چڑھ کر وادی میں داخل ہو گئی۔ تنگ اور حسین وادی' جس کے گھر بتا رہے تھے کہ یہاں کی اکثریت خوشحال ہے۔ خوبصورت گھر اور چادروں کی چھتیں یہ بتا رہی تھیں کہ لوگ اچھے ہیں۔ مساجد مدرسے' علماء' تبلیغی احباب سب کچھ بڑی کثرت سے تھا۔ ہم چلتے رہے حتیٰ کہ وادی کے خاتمے پر الپوری کا شہر آیا' جو غالباً سب تحصیل لگتا تھا۔ وہاں سے سڑک ایک دم اوپر چڑھنے لگی اور موڑ کاٹتی' بل کھاتی 'شنگلہ ریسٹ ہاؤس جا پہنچی' جو انتہائی بلندی پر ہے۔ غالباً آٹھ ہزار کچھ فیٹ ہوگا' ٹھیک سے یاد نہیں رکھ سکا۔ یہ پولیس والوں کا خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے اور یہاں تھانہ بھی ہے۔

یہاں ہمیں لینے کے لئے آدمی آیا ہوا تھا۔ ان سے علیک سلیک ہوئی جنگلات والوں کی چوکی بھی ہے اور بہت خوبصورت مسجد' جو جنگلات کے کسی فاریسٹ آفیسر نے چندہ جمع کر کے بنوائی تھی۔ نیز یہاں سے سوات کی ساری وادی سامنے بکھری پڑی تھی۔ مالم جبہ کی مشہور چوٹی بھی' جس پر اب مشہور سیر گاہ بنائی گئی ہے نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر نظاروں سے لطف اندوز ہوئے اور چل پڑے کہ ہمیں رات منگورہ' جو سوات کا صدر مقام ہے' بسر کرنا تھی۔ راستے میں بدین سے گزر ہوا۔ یہاں سے دوسری سڑک کالام جاتی ہے جس کے آگے فلک سیر کی چوٹی ہے' جو اٹھارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے اور یہاں سے جو پانی اس جانب ڈھلتا ہے دریائے سوات بنتا

ہے۔ دوسری طرف کا پانی وادیء شندور کے نیچے لاس پور جا کر ملتا ہے اور یوں دریائے چترال بن کر آتا ہے۔ کابل سے ہو کر اٹک آ کر سندھ میں گرتا ہے۔

بدین ہی سے دوسری طرف بونیر ہے' جہاں بدھوں کا مشہور قلعہ تھا جس کی شکست کے بعد بدھوں نے ملک ہی خالی کر دیا تھا اسی راستہ شندور سے گزر کر تبت کو سدھارے جوان کا اصلی وطن تھا۔ سکندر اعظم نے مالاکنڈ سے ایک جرنیل کو روانہ کیا تھا' جسے شندور کی طرف سے آ کر کالام پہنچنا تھا اور اس طرف سے بونیر پہ حملہ آور ہونا تھا اور سیدھے راستے سے خود سکندر اعظم کو۔ مگر وہ ادھر آنے کے بجائے شندور سے گزر کر گلگت اور آگے ہنزہ کی طرف چلا گیا اور کبھی واپس نہ آسکا۔ کہا جاتا ہے کہ ہنزہ کے نیلی آنکھوں والے لوگ یونانی نسل سے ہیں' سکندر نے خود ہی قلعے پر حملہ کر کے بدھوں کو شکست دی حالانکہ اس کی فوج ہزاروں میں اور بدھ لاکھوں میں تھے مگر یہ بھاگے اور آج تک واپس نہیں آئے۔ بس لوگ گندھارا کے نام سے ملک کے اس عہد غلامی کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

ہمیں صبح بدین ہی کالام اور فلک سیر کی طرف جا کر ان لوگوں کو بھی دیکھنا تھا کہ اس جانب بھی سہولتیں مفقود ہیں۔ مگر یہاں بندوق کا راج ہے۔ لوگ شمالی علاقوں کی طرح نہیں' بندوق کی نالی سے بات کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے مغرب منگورہ پہنچ کر ادا کی۔ رات آرام کیا۔ امتیاز نے مل کر بہت مسرت ہوئی۔ بہت خوبی سے اپنے فرائض نباہ رہا ہے۔ وہاں پتہ چلا کہ کالام کی طرف راستہ بند ہے اور جو سڑک قسم کی شے تھی اس کی مرمت ہو رہی ہے۔ یوں ہم اس طرف نہ جا سکے لہذا صبح واپسی کا پروگرام بنا۔ ناشتے کے بعد نکلے تو دریائے سوات کے اس موڑ پر جہاں سے راستہ لواری ٹاپ کو جاتا ہے۔ چرچل پوسٹ سینہ تانے ہمیں بتا رہی تھی کہ ۶ ستمبر کو یہاں سے شروع ہونے والا سرکل ۱۷ ستمبر کو بارہ دنوں میں مکمل ہو چکا تھا۔ جس میں

سے نو دن ہم دیس ہوتے ہوئے خود کو پردیس میں پاتے تھے۔ ہم نوشہرہ رکے اور دوپہر کا کھانا پنڈی آکر کھایا اور رات بفضل اللہ ہم واپس گھر پہنچ چکے تھے۔

اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ اللہ کریم توفیق دے اور ہم سب مل کر ان لوگوں کے لئے کچھ کر سکیں، مالی طور پر روحانی طور پر اور جسمانی علاج کے طور پر۔ جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ غیر ممالک کی پبلک تنظیموں کو کہا جائے، یوں روپیہ تو بہت آجائے گا مگر غیرت اسلامی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ دین کے کام کے لئے بے دین سے سوال کروں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی حالت زار سے آگاہ کر کے ان کی مدد کی دعوت دی جائے۔ یہ کام کرنے کے لئے ہی یہ چند حروف لکھے ہیں۔

اللہ کریم قادر ہیں کہ اس میں برکت دے دیں۔

فقیر محمد اکرم عفی عنہ

یکم اکتوبر ۸۹ء

دارالعرفان، منارہ ضلع چکوال

شیروں کی کچھار میں !!

ہم نے ناشتہ ٹانک پہنچ کر مولانا غلام محمد صاحب کے ساتھ کیا۔چونکہ وہاں رکنے کا پروگرام تو تھا نہیں'لہذا جلد ہی روانہ ہو گئے۔یوں تو ٹانک بھی وزیرستان کا دروازہ ہی کہہ لیں مگر اس سے کوئی پون گھنٹہ کی راہ چل کر خرگئی ایک سکاؤٹ پوسٹ آتی ہے جس سے پہلے میدان میں قلعہ اور سکاؤٹوں کا اس علاقہ کا مرکز بھی ہے۔یاد رہے یہاں وزیرستان سکاؤٹس ایک نیم فوجی تنظیم ہے جو شالی اور جنوبی وزیرستان میں انتظامی امور اور قیام امن کی ذمہ دار بھی ہے۔پوسٹ پر ٹریفک رکی ہوئی تھی' پتہ چلا کہ کسی نے ایک سپاہی قتل کر دیا ہے اور اسکی گرفتاری کے لئے ان کے جوان گئے ہیں۔مزید فائرنگ کے خطرے کے پیش نظر راستہ بند ہے۔خیر! ہمارے ساتھ جو وہاں کے مقامی لوگ تھے انہوں نے کہہ سن کر اپنی دو گاڑیوں کے لئے تو اجازت حاصل کر لی اور یوں ہم آگے روانہ ہوئے۔پہاڑی علاقہ' نالے اور راستہ کا زیر و بم شروع ہو چکا تھا۔روایتی قبائلی مکان شروع ہو چکے تھے۔ایسا ہر مکان قلعہ نما ہوتا

ہے۔ باہر کی دیواریں تقریباً بیس فٹ بلند اور اندر ایک برج دفاع کے لئے ضرور ہوتا ہے۔

ہم سفر طے کرتے ہوئے جنڈولہ پہنچے جو انگریز کے زمانے میں مشہور ہیڈ کوارٹر اور مرکز ہوتا تھا۔ اب بھی پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر ہے۔ چھوٹا سا بازار ہے ضروریات زندگی دستیاب ہیں۔ ہوٹل اور دواخانے وغیرہ ہیں ہر آدمی مسلح ہے اور یہاں سے آگے اسلحہ پر کوئی پابندی نہیں اپنے ملک کے اندر پہلی بار پتہ چلا کہ یہاں سے آگے کسی مقامی کی ضمانت پر جا سکتے ہو جو یہ گارنٹی دے کہ انھیں سلامت واپس لوٹا دیا جائے گا اور کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو گا' نہ یرغمال بنائے جائیں گے۔ اس لکھا پڑھی میں کافی دیر لگی اور یوں ہم کفیل دے کر وہاں سے آگے روانہ ہوئے۔ جنڈولہ ہی کو بنیاد بنا کر جنوبی وزیرستان میں برطانوی فوج پیش قدمی کرتی رہی اور سڑکیں' چھاؤنیاں نیز فوجی چوکیاں وغیرہ بنائی گئیں، مگر آگے کا ہر موڑ پٹھانوں کے جذبہ حریت کا گواہ ہے جس کے پتھروں میں ان کا خون رچ بس گیا ہے اور قدم قدم پر اس قدر سخت مقابلے کئے کہ انگریز کو ہندوستان چھوڑنے تک اس علاقے میں ایک رات چین نصیب نہیں ہو سکا۔ یہ جنڈولہ کیا ہے شیروں کی کچھار کا دروازہ ہی کہہ لیں، اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں۔ مگر جن کی نہیں وہ بھی نماز پنجگانہ ادا نہ کرنے کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔

یہاں سے آگے واقعی شرعی پردہ ہے اور کوئی خاتون نظر نہ آئے گی اگر کوئی سفر کرتی ہوئی یا پانی وغیرہ لاتی ہوئی نظر پڑی تو سارے وجود کے ساتھ اسکا چہرہ بھی پوری طرح ڈھانپا ہوا ہو گا۔

سڑک پہاڑی نالوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے جنہیں دریا کہا تو جاتا ہے مگر پانی بہت کم ہے ہاں! بارش کا سیلابی پانی ضرور گزرتا ہے۔ مشہور دریا' دریائے شہور ہے

جس پر شہور تنگی ایک بہت تنگ گزر گاہ ہے۔ جہاں ۱۹۳۶/۳/۷ء میں دو بریگیڈ فوج کو محسودوں نے گھیر کر بے بس کر دیا تھا اور ایسے زبردست مورچے بنائے تھے، جن پر ہوائی جہاز بھی بم نہیں گرا سکتے تھے نہ ان کا فائر کارگر تھا کیونکہ دونوں طرف پہاڑ تھا اور بتدریج بلند ہوتا گیا لہٰذا مورچے ایسے تھے کہ ان میں سے نیچے نظر بھی آتا تھا اور فائر کرنا بھی آسان تھا مگر اوپر سے ان کا کچھ بگاڑنا آسان کام نہ تھا۔ لہٰذا دو بریگیڈ انگریزی فوج، جس کے ساتھ ٹینک 'بکتر بند گاڑیاں' توپیں وغیرہ سب کچھ تھا پھنس کر رہ گئی' یہ وزیرستان کی مشہور جنگوں میں سے ایک ہے۔ جس میں فوج کا کافی نقصان ہوا حتیٰ کہ سکاؤٹ ٹروپس جمع ہو کر پیچھے سے حملہ آور ہوئے جنھوں نے مجاہدین کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ یوں کئی روز بعد فوج کی جان چھوٹی اور پھر انگریز بہادر نے محسودوں کے کئی گاؤں بمباری کر کے تباہ کر دیے۔ پہلے جہاز بم گراتے پھر توپخانہ گولہ باری کرتا اور پھر پیدل فوج جا کر بچے ہوئے مکانوں کو ڈائنامائیٹ کر دیتی فصلیں اور پھلدار درخت کاٹ دیئے جاتے۔ جنگل اور گھاس جلا دیئے جاتے اور یوں یہ مہذب قوم وحشت و بربریت کی وہ داستانیں لکھتی رہی جس پر آج بھی ساری انسانیت کے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ یہ انسانی حقوق کے ٹھیکیدار ایسے ظالم تھے' ایسے ظالم ہیں کہ تاریخ انسانی میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ فرعون ایک تھا مگر اس قوم کا ہر ذی اقتدار فرعون ثابت ہوتا رہا۔ اور اب بھی ان کا کردار یہی ہے۔

جنرل اکرم صاحب کی کتاب میں ہے کہ جب جرمن جہاز لندن پر اندھا دھند بمباری کرتے تھے تو شاید انگریزوں کو اندازہ ہوا ہو گا کہ وزیرستان میں ان کی بمباری سے غریب کسانوں پر کیا گزرتی تھی؟

ہم مشہور تنگی سے گزر رہے تھے اور یہ واقعات حافظے پہ فلم کی طرح مختلف تصاویر بنائے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ سروا کئی پہنچے جہاں سکاؤٹس کا قلعہ اور وائرلیس

وغیرہ ہے، مگر ہم وہاں سے اندر پہاری علاقہ میں داخل ہو گئے' جہاں چند میل پکی سڑک ہماری ساتھ گئی اور پھر ختم ہو گئی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسے پختہ کرنے کا منصوبہ شروع کروایا تھا جو موجودہ عوامی حکومت نے روک دیا ہے۔ یہ شاہراہ سے ہٹ کر دیہات کے اندر سے ایک راستہ ہے جس کے گرد پہاڑوں کی بلندی سات ہزار سے آٹھ ہزار فٹ تک ہے ایک جگہ سڑک پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیتی ہے وہاں ہمارے استقبال کو آنے والی گاڑیاں مل گئیں، جن کے ہر سوار کی کلاشنکوف پوری طرح لوڈ تھی اور پھر انہوں نے خوشی میں میگزینیں خالی کر دیں۔ فائر کی آواز سے وادیاں گونج اٹھیں۔ یہ ان کا خوش آمدید کہنے کا طریقہ تھا۔ پھر سب لوگ ہمارے ساتھ چلے۔ پہاڑ سے گزر کر دوسری طرف وادی میں "اوس پاس" گاؤں سے باہر مدرسہ تھا، اس کے مہتمم مولانا سعید نور صاحب بہت نیک متواضع اور قدو قامت والے خوبصورت جوان ہیں یہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بیعت تھے اور آپ کے ارشاد کے مطابق یہاں مدرسہ شروع کیا تھا۔ جب ہم مدرسہ کے باہر پہنچے تو بہت سے لوگ صف بنا کر کھڑے تھے جن سے ملاقات کی اور ہر آنے والا مسلسل فائرنگ کر رہا تھا جو بہت دیر تک ہوتی رہی۔

اس کے بعد مدرسہ میں ایک بچے کی دستار بندی کی تقریب تھی۔ دور نزدیک سے کافی لوگ جمع ہو گئے تھے جن میں سے سب اردو بول تو نہ سکتے تھے مگر سمجھ ضرور سکتے تھے لہذا اردو میں بیان کیا۔ ماحصل دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت کے ساتھ اس کا مصرف بیان کرنا مقصود تھا۔ دین سیکھنے سے مراد یہ ہے کہ امور دنیا کو دینی احکام کے مطابق انجام دیا جائے۔ مگر ہماری بد نصیبی یہ ہے کہ جو طبقہ دینی علم حاصل کرتا ہے وہ عملی زندگی میں حصہ نہیں لیتا نہ کسی سرکاری شعبے میں کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے نہ پرائیویٹ سیکٹر میں یہی وجہ ہے کہ ملک مسلمانوں کا ہے مگر طرز حکومت

کبھی اسلامی نہ ہو سکا۔

اس کے بعد کھانا کھایا جو پٹھانوں کا روایتی کھانا تھا کئی طرح کا گوشت اور چاول خوان کی زینت تھے، مگر اپنا نصیب تو بغیر شکر کی چاء اور بغیر روغن کی روٹی ہے بہر حال اللہ کریم کا شکر ہے کہ اپنا نام لینے کی توفیق ارزاں رکھے۔ مسلسل فائرنگ کی آواز سے کسی قدر تھک کر میں نے کہہ دیا کہ بھئی! فائر نشانے پر ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ آپ صرف دھماکے کر رہے ہیں۔ بس پھر کیا تھا' میں بات کہہ کے پھنس گیا دراصل ایسی بات کرنا ان کی روایتی نشانہ بازی کے لئے ایک طرح کا چیلنج تھا۔ روایات سے بے خبری بھی بسا اوقات بہت غضب ڈھاتی ہے۔ چنانچہ سب جمع ہو گئے اور بڑے احترام سے کہا کہ نشانہ تو اب آپ کو مارنا ہو گا۔ ساتھ ہی ایک بچے کو چھوٹا سا شیشہ دے کر پہاڑی کی طرف دوڑایا جس نے اندازاً تین سو گز پر شیشہ سورج کے رخ پر رکھا کہ چمکتا ہوا نظر آئے مشکل 1x2 انچ ہو گا۔ ایک جرمن کلاشنکوف بندہ کو تھمادی۔ میں نے ایک دو فائر کئے جو قریب لگے مگر رائفل درست نہ تھی۔ دوسری تبدیل کی۔ اس کا سنگل فائر بھی اس قدر صحیح نہیں تھا کہ ایک آدھ انچ کی چیز کو فاصلے پہ لگتا چنانچہ ایک چینی رائفل دی گئی۔ دریں اثناء ایک پٹھان نشانہ باز لپکا۔ اس نے تین فائر کئے مگر اسی انداز میں قریب قریب لگے۔ آخر بندہ نے چینی رائفل سے شیشہ اڑا دیا تو بہت خوش ہوئے۔ اگرچہ ساتویں یا آٹھویں گولی لگی تھی مگر تھیں سب ہی گل۔ دراصل ٹارگٹ بہت چھوٹا تھا اور بندہ کا پہلے تجربہ بھی' نشانہ بازی کا اتنے چھوٹے ٹارگٹ پر اتنی بڑی رائفل فائر کا نہیں' ورنہ نشانہ بازی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔

نماز ظہر کے لئے گاؤں میں جانا پڑا۔ اہل دیہہ کا اصرار تھا کہ نماز گاؤں کی مسجد میں ادا کریں۔ 'لہٰذا گاؤں میں ظہر کی نماز ادا کی۔ چائے پی اور وانہ کے لئے تیار ہوئے۔ ایک راستہ تو وہ تھا جس پر ہم آئے تھے پھر سروا کئی جا کر مین روڈ سے جاتے'

دوسرا کچا' مشکل اور خطرناک راستہ تھا جو اسی گاؤں سے آگے خیسورہ کی وادی میں داخل ہو جاتا تھا۔ دونوں طرف کے پہاڑ آٹھ ہزار فٹ سے کچھ زائد بلند ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ پانچ' چھ چھ گھروں کی آبادی میلوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہی خیسورہ کہلاتی تھی۔ راستہ نالے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا جو بارشوں کے پانی سے کافی حد تک خراب ہو چکا تھا۔

بہر حال ہم نے یہی راستہ اختیار کیا اور اس مشہور وادی کو دیکھتے ہوئے گزرے جہاں انگریز کے جہاز ہم تو گرا جاتے تھے مگر اسکے سپاہی اس زمین کو چھو نہ سکے کہ نالہ تنگ' راستہ دشوار اور دونوں طرف سے فائر کی زد میں تھا۔ گھنٹہ بھر چلنے کے بعد یہ وادی ختم ہو کر آگے کھلی وادی تھی اور اس میں بہت بڑے بڑے گاؤں آئے جہاں طیارزہ کا قلعہ اور پوسٹ تھی۔ یہاں سے 'وانا سے میرن شاہ جانے والی سڑک مل گئی اور ہم وانا کو مڑ گئے جو زیادہ دور نہ تھا، سڑک پہاڑ کے اوپر جا کر دوسری طرف اتری تو سامنے دریا کے پل جسے خرپُل کہتے ہیں سے اس پار پہلے والی سڑک سے مل گئی، اور یوں ہم وانا کی مشہور اور پرانی چھاؤنی میں پہنچ گئے، جہاں انگریزی عہد میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر ہوا کرتا تھا۔ یہ جگہ بہت کھلی' کافی بلندی پر اور بہت پر فضا ہے۔ انگریز کی چھاؤنی کی ضرورت یہ بھی تھی کہ پہاڑوں سے اس قدر دور ہو کہ رائفل کا فائر کارگر نہ ہو۔ اس کے باوجود چھاؤنی کے گرداگرد پکٹیں تھیں جن میں مورچہ بند فوجی رات دن پہرہ دیتے ایک مشہور پکٹ کا نام جبرال پکٹ ہے۔ اس پہاڑی کی شکل جبرالٹر کی طرح ہے اور نالے کے کنارے پر ہے لہذا اسے یہ نام دیا گیا۔

مشرق کی بلند پہاڑی پر شیشہ پکٹ ہے۔ اس کا یہ نام اس وجہ سے ہے کہ شیشے کی مدد سے دور دور تک پیغام رسانی ہوتی تھی۔ اب زمانہ وائرلیس کا ہے مگر پہلے رات کو لائٹ سے اور دن کو شیشے کی چمک سے الفاظ منتقل کئے جاتے تھے۔ ان سب

انتظامات کے باوجود پٹھانوں کی یلغار نے بار ہا دانا چھاؤنی کو تباہ کیا۔ کبھی ملا پوندہ رحمتہ اللہ علیہ نے، کبھی فقیر ایپی رحمتہ اللہ نے اور کبھی قبائلی سرداروں نے۔ ان کا طریقہ شبخون مارنے کا تھا یہ جیالے منٹوں میں اپنا کام کر کے غائب ہو جاتے۔ رائفلیں اور گولہ بارود لوٹ کر لے جاتے۔ انگریز اور ہندو کو خصوصاً قتل کرتے بلکہ وزیرستان میں بہت عرصہ تک شادی کی شرائط میں یہ بات بھی شامل تھی کہ دولہا انگریز یا ہندو کا سر لائے تو نکاح کر کے دیا جائے گا۔ یہ مردانگی کا امتحان ہوا کرتا تھا۔

وزیرستان میں چار بڑے قبیلے آباد ہیں محسور، وزیر، بھٹنی اور دوڑ آخر الذکر کابل کی سرحد سے لے کر میرن شاہ اور میر علی، کھجوری پوسٹ تک آباد ہیں۔ یہ کاروباری بھی ہیں اور محنتی کسان بھی۔ بھٹنی ہوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کی سرحد کے ساتھ ساتھ اور وزیر ٹوچی سے رزمک تک، جو عموماً خانہ بدوش رہتے ہیں گرمیوں میں پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں اور سردیوں میں اپنے گلے نیچے لے آتے ہیں۔ آگے وانا تک تقریباً محسود ہیں۔ پھر ڈیرہ اور جنڈولہ کی طرف وادی خیسورہ وغیرہ میں سب وزیر آباد ہیں۔ دریا ٹوچی سے لے کر رزمک تک وادیاں کشادہ ہیں۔ لہٰذا وزیروں پر انگریزی فوجیں بہت جلدی چڑھ دوڑتی تھی۔ محسودوں کے علاقہ میں وادیاں اور نالے تنگ اور راستے دشوار گزار ہیں، مگر مقابلہ ہر طرف مثالی ہوتا تھا۔

یوں تو یہ شیروں کے کچھار ہیں اور ہر جھاڑی کسی شیر کا مسکن ہے، مگر بعض لوگ اس قدر سربرآوردہ مجاہد تھے کہ نہ تاریخ انھیں فراموش کر سکتی ہے اور نہ دشمن ان کی جرات و بہادری کا اعتراف کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک ہستی کا نام فقیر ایپی تھا۔ جن کا نام حاجی مرزا علی خاں طوری خیل وزیر قادری اور لقب امیر المجاہدین یا مجاہد کبیر تھا۔ یہ ایپی گاؤں کے رہنے والے تھے، اور فقیرانہ

زندگی بسر کرتے تھے آپ سید حسن نقیب چارباغ جلال آباد سے بیعت تھے اور قادری سلسلہ میں خرقہ خلافت پایا تھا۔

بندہ ناچیز نے ان کے حالات پڑھ کر توجہ کی تو ان کا قلب بہت منور پایا بلکہ لطیفہ قلب کی کیفیات کے دوران ہی زیارت ہوئی بہت زیادہ مجاہدہ کرنے والے اور عجیب بات ہے کہ صرف قلب کی روشنی پر بہت تیز مکاشفات رکھنے والے تھے۔ ان چیزوں کا انحصار عطائے باری کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک مجاہدہ پر ہوتا ہے۔

ان سے پہلے بہت سے سر فروشوں نے انگریز کا مقابلہ جاری رکھا' جس میں ملا پوندا نے ایک عجیب تحریک چلائی کہ پٹھان سپاہیوں اور اردلیوں کو انگریز افسر قتل کرنیکی کی ترغیب دی جس کے نتیجے میں بہت سے انگریز قتل بھی ہوئے اور باقی ماندہ کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ اسکے ساتھ چھاؤنیوں پر شب خون 'کانوائی پر حملہ اور مقابلہ جاری رکھا اور ۱۹۱۳ء میں آپ کی وفات پر انگریز بہت خوش ہوئے۔ مگر یہ خوشی بھی دیرپا ثابت نہ ہوئی البتہ مقابلوں میں کوئی مرکزی قوت نہ رہی اور انگریز ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک کے عرصے میں جنڈولہ سے وانا اور میرن شاہ سے رزمک' وانا تک سڑک بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کی وجہ سے وانا' رزمک' ڈوسلی چھاؤنیاں بنادی گئیں۔ میر علی اور جنڈولہ پہلے فوجی ہیڈ کوارٹر تھے۔ یوں یہ سڑک پورے وزیرستان کے جگر سے گزر گئی۔ مگر ہر میل اور ہر موڑ پر خون دینا پڑا۔

ہفتہ دوروز کے لئے سڑک کھلا کرتی تھی اس میں پہلے فوجی گرد کی پہاڑیوں پہ قبضہ جماتے پھر درمیان میں کانوائی چلتی۔ اسکے باوجود کسی کانوائے کا بچ کر نکل جانا ایک معجزہ سے کم نہ تھا کہ ۱۹۳۵ء میں لاہور مسجد شہید گنج کا واقعہ پیش آگیا۔ ادھر بنوں میں ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کر کے ایک پٹھان نوجوان سے شادی کر لی۔ ہندوؤں نے مقدمہ کیا تو انگریز نے لڑکی ہندوؤں کو لوٹا دی۔ ان دو واقعات نے

جلتی پر تیل کا کام کیا اور وزیرستان کے مختلف ملک اور قبائلی سردار جمع ہو کر فقیر ایپی رحمتہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ اب مرکزی شخصیت صرف آپ ہی کی ہے لہذا آپ نے اللہ کا نام لے کر جہاد شروع کیا اور ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک انگریز کے خلاف پورے وزیرستان میں نبرد آزما رہے۔ آپ کے معرکوں نے امام شامل اور مہدی سوڈانی کی یاد تازہ کر دی۔ انگریز نے اپنا پورا زور بازو آزما کر دیکھا۔ مگر یہ مرد خدا نہ جھکا نہ ان کے ہاتھ آیا بلکہ ایک کتاب کا نام ہے۔

"فقیر ایپی ایک چھلاوہ تھے۔"

انہوں نے رات دن اللہ کی راہ میں ایک کر دیا۔ بڑے بڑے انگریز سورما دو دو بریگیڈ فوج لے کر حملہ آور ہوئے اور انہیں گرفتار کرنے کے بجائے منہ کی کھا کر ذلت و خواری سے واپس آئے۔ انگریزوں کی روایتی چالیں' روپے کا لالچ' عہدے کی ترغیب اور سارے حربے اللہ کے اس بندے نے پاؤں کے نیچے روند دیئے اور یوں برصغیر سے انگریز کے جانے تک برسرپیکار رہا۔ سارا وزیرستان آپ کی جولان گاہ تھا۔ کاش! کوئی باقاعدہ نظام تشکیل پاتا تو ایک اسلامی ریاست بن جاتی مگر صرف جہاد اور وہ بھی بندوق تک محدود رہا۔ آخری دو سالوں میں فقیر صاحب نے توپیں بنائیں مگر وہ زیادہ مؤثر نہ تھیں۔ کاش! باقاعدہ فوج اور اسکے عہدے' علاقہ' قانون سب بنایا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

آپؒ نے پاکستان کی تقسیم پر بھی کہا تھا کہ ہم اپنا جہاد بند کرتے ہیں کہ پاکستان سے جہاد شرعاً درست نہیں۔ مگر موجودہ پاکستان بھی انگریز کی سازش ہے۔ ایک حصہ مسلمان یہاں' ایک حصہ ہندوستان میں اور ایک حصہ بنگال میں تقسیم کر دیئے ہیں۔ ان کے خیال میں سارا کشمیر اور دہلی تک کا علاقہ مسلمانوں کا حق تھا اور ساتھ بنگال بھی۔ بہر حال آپ ۱۹۶۰ء میں واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار "گورویخت"

میں دشوار گزار پہاڑوں کے درمیان کابل کی سرحد پر ہے۔ جہاں آپ کا بھتیجا فی الحال جانشین ہے جسے امیر المجاہدین کا لقب دیا گیا امیر صاحب کہلواتا ہے۔

وانا چھاؤنی میں بھی خوبصورت اور وسیع مسجد ہے اور باہر آبادی میں بھی ایک بہت شاندار مسجد اور مدرسہ ہے جس کے مہتمم مولانا نور محمد صاحب بہت معروف شخصیت ہیں۔ آپ کے مدرسہ میں درس نظامی کے ساتھ۔ ایف اے تک نصابی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور یہ وقت کی بہت اہم ضرورت ہے۔ اللہ کریم ایسے لوگوں کو مزید ہمت دے جو قوم کی رہنمائی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ بندہ مسجد اور مدرسہ میں حاضر ہوا جسے میں اپنی خوش نصیبی شمار کرتا ہوں۔

وانا سے آگے کابل کی سرحد تقریباً تیس میل ہو گی سامنے پہاڑ کے دامن میں شکنئی گاؤں نظر آتا ہے۔ پہاڑ خاصے بلند ہیں اور ان علاقوں میں حکومت کا کوئی اثر نہیں وہ اپنے فیصلے خود کرتے ہیں اور بہت اچھا فیصلہ کرتے ہیں' فوری اور مفت انصاف مل جاتا ہے۔ اس گاؤں کے بہت سے لوگ سلسلہ عالیہ میں بیعت ہوئے۔ ایک ڈاکٹر صاحب بھی تھے جنہوں نے ایک تازہ واقعہ سنایا کہ ان کے بھائی سے ایک آدمی قتل ہو گیا۔ ان کے بھائی کے مطابق گولی اتفاقاً لگ گئی تھی اور پہلے دشمنی بھی بہت تھی۔ مگر ورثاء نے یہ عذر قبول کرنے میں پس و پیش کیا تو وہ گاؤں چھوڑ کر کئی میل دور وانا آیا اور جنوب میں مستی خیل قبیلہ کے گھروں میں جا کر دنبہ ذبح کیا۔ ان کے بزرگ جمع ہو گئے۔ پوچھا کیا بات ہے اس نے واقعہ بتایا اور کہا کہ اب خطرہ ہے کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔

انہوں نے اسے اپنا اطالس بنالیا۔ اس کا معنی ہے اٹھارہ، جس کسی پہلے آدمی نے پناہ چاہی تھی تو وہ خاندان کے ممبر سترہ تھے انہوں نے اسے اٹھارواں قبول کیا تھا اب اسکا نام ہی اطالس ہے۔ ان لوگوں نے جا کر بتایا کہ وہ آدمی بے قصور بھی ہے

اور ہماری پناہ میں بھی۔ لہذا اسے کوئی نہ چھیڑے۔ چند ماہ بعد جنگل میں اسے گولی مار دی گئی تو وہ اس کے گاؤں گئے جس نے گولی ماری تھی' اسے ملے' کہا' تم نے اچھا نہیں کیا مگر اب اپنا دھیان رکھنا ہم تمہیں قتل کریں گے' تم ہمارے مجرم ہو' اور ٹھیک تیسرے روز اس آدمی کو قتل کر دیا۔ اب وہ جھگڑا ان دو قوموں کے درمیان بن گیا جس کو سلجھانے کے لئے پولیٹیکل ایجنٹ صاحب کوشش کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ ان کی روایات ہیں جن کی پابندی بہر طور کی جاتی ہے۔

ہم دوسرے روز یعنی ۱۶ اکتوبر کو وانا سے لدھا کے لئے روانہ ہوئے طیارزہ تک تو پکی ہی سڑک تھی، وہاں سے کچے راستے پر مڑنے کے بجائے سیدھے چلتے رہے تو سڑک پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گئی جس میں خوبصورت جنگل بھی تھا' اور چلغوزہ کے درخت بھی نظر آئے جنگلی زیتون کی بہتات تھی۔ پتہ چلا کہ جنگلات کی حفاظت پر ان کا اپنا ایک آدمی مقرر ہوتا ہے جو سرخ ٹوپی پہنتا ہے اور جرنیل کہلاتا ہے اسے سب مل کر مقرر کرتے ہیں۔ معمولی نقصان پر بھی رپورٹ کر دے تو بھاری جرمانہ کیا جاتا ہے۔ گزارے کے لئے ہر سال مختلف علاقوں میں کٹائی کی اجازت دی جاتی ہے اس طرح لوگوں کا گزارہ بھی ہو جاتا ہے اور جنگلات بھی ساتھ ساتھ تیار ہوتے رہتے ہیں۔

ان جنگلات میں سڑک کافی خطرناک اور ڈاکوؤں' لٹیروں کی زد پہ رہتی ہے جو عموماً مفرور ہوتے ہیں مگر موجودہ پولیٹیکل ایجنٹ نے اچھا اہتمام کیا ہے۔ اور بہت سے مفرور پیش ہو گئے ہیں خطرہ نسبتاً کم ہے۔

انہی پہاڑوں میں گھرے ہوئے علاقے کو سلو یختی کہتے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی واقعہ پیش آجاتا تو اس علاقہ کے لوگ لشکروں کی صورت میں مقابلے کو نکلتے تھے اور ہر لشکر کم از کم چالیس جوانوں پہ مشتمل ہوتا تھا' جسے پشتو میں سلوبخت کہا

جاتا ہے۔لہٰذا پورے علاقے کا یہی نام ہے۔نالوں کے درمیان ایک خوبصورت گاؤں کا نام بدر ہے۔پتہ نہیں، کسی عاشق رسول ﷺ نے یادیں تازہ کرنے کو چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں بدر کا گاؤں بنایا ہوگا۔چوٹی پر لیفٹیننٹ جنرل عالم جان محسود کا گھر ہے جوان دنوں لاہور میں کور کمانڈر ہیں۔اس علاقہ سے اکثر لوگ پڑھے لکھے اور اچھے عہدوں پر ہیں، مگر علاقہ کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہر افسر کسی نہ کسی شہر میں بس جاتا ہے اور علاقہ میں وہ بھی ایک سیاح کی مانند ہی کبھی کبھار جاتا ہے۔

اس سے آگے مشہور اور قدیم شہر کانی گرم ہے۔پہاڑی نالے کے کنارے اور پہاڑ کے اوپر تک یہ قدیم قصبہ سلطان محمد غوری نے اپنے کسی سردار کو بطور جاگیر بخشا تھا۔تب یہاں گاؤں، جنگل تھا۔یہ گاؤں اسی سردار کی اولاد ہے جو ارمڑ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔عجیب بات ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود کانی گرم میں ابھی تک ارمڑی زبان بولی جاتی ہے۔اگرچہ باہر دوسرے پٹھانوں سے بات چیت پشتو میں کرتے ہیں مگر گھر کے اندر وہی زبان ہے جو پشتو سے مختلف ہے۔یہاں ایک زمانے میں کئی برس قحط پڑا تو لوگ مختلف علاقوں کو چلے گئے۔ہندوستان میں برکی اور مرزا کہلائے۔مرزا کے معنی اڑمڑی زبان میں بھائی کے ہیں۔افغانستان میں لوگر کے علاقہ میں آباد ہوئے۔وہ ابھی تک اڑمڑ ہی کہلاتے ہیں۔اس گاؤں میں بندوق اور چھری بطور خاص تیار ہوتی ہے۔یہاں ایک بزرگ گزرے ہیں۔جنہیں پیر روشان کہتے ہیں۔یہ لفظ دراصل روشن ہے پشتو کی کھینچ تان سے روشان بن گیا۔ایک بار تو سارا وزیرستان ہی نہیں بلکہ کہتے ہیں سارا سرحد ان کے پیچھے چل پڑا تھا۔کسی کامل ہستی کے مرید تھے ان کی ایک کتاب جرمن کتاب خانہ سے دستیاب ہو کر چھپی ہے۔''خیر البیان'' عربی، فارسی اور پشتو میں ہے۔کہا جاتا ہے کہ پشتو کا سب سے پہلا نسخہ ہے اس میں بہت اعلیٰ خیالات بلند ذوق اور علمی نمونے دستیاب ہیں۔اس میں

بھی دریائے رحمت تک کا تذکرہ ہے جس کی بات وہی صاحب حال کر سکتا ہے جس کی رسائی سالک المجذوبی سے بہت اوپر ہو اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ جو بھی ان کے ساتھ چند روز رہتا اس کا قلب روشن اور منور ہو جاتا جس پر ان کا نام ہی پیر روشن پڑ گیا مگر آخر میں دھوکا کھا گئے اور ابلیس کے فریب سے نہ بچ سکے اور اباحتی ہو گئے۔ اباحتی سے مراد صوفیوں کا وہ فرقہ ہے جن کے خیال کے مطابق ایک خاص مقام طے کرنے کے بعد صوفی کو نہ عبادت کی ضرورت رہتی ہے نہ گناہ سے اس کا کچھ بگڑتا ہے' اس معصیت میں مبتلا ہو کر سب مقامات سلب ہو گئے حتیٰ کہ ایمان بھی گیا اور نور کی جگہ ظلمت نے لے لی۔ مگر لوگوں کی اندھی عقیدت کسی نہ کسی صورت باقی ہے۔

اس شخص کا زمانہ اکبر اعظم کا زمانہ ہے اور اس شخص نے بھی اکبر کے دین الٰہی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا جس پر بہت لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی مگر آخر کار نفس کے ہاتھوں میں تباہ ہو گیا۔ ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

جب مذہب اباحتی اختیار کیا تو پیر بابا' اخوند درویزہ سوات والوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور فتویٰ دیا جس کے باعث بہت سے لوگ گمراہ ہونے سے بچ گئے۔ انہوں نے اس کا نام "پیر تاریکی" رکھا۔

اس علاقہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر گاؤں کے باہر گاؤں کی سرائے ہے جہاں مسافر بغیر کسی معاوضے کے قیام کرتے ہیں اور ان کا مال یا سواری محفوظ رہتی ہے یہ گاؤں کا ذمہ ہے۔ لہذا سرائے میں ٹھہرنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ ان پہاڑوں سے ذرا کھلی جگہ نکلیں تو سامنے لدھا نظر آتا ہے۔ انٹر کالج ہے' ہائی سکول ہے اور سکاؤٹس کا قلعہ ہے جہاں برطانوی فوج رہا کرتی تھی۔ ہمارا قیام

اس سے تین میل ادھر شیش تین گاؤں میں سید لعل بادشاہ صاحب کے گھر میں تھا۔
دو گہرے نالوں کے درمیان بلند اُبھار گاؤں کی آبادی ہے' عصر وہاں پہنچ کر ادا کی' اہل دیہہ سے ملاقات' بیان اور مغرب کا ذکر مسجد میں جا کر کیا۔ رات بسر ہوئی۔ عجیب لوگ ہیں کوئی بوڑھا ہے یا بیمار' گھر سے نکلے گا تو لاٹھی کے جائے بندوق اٹھا کر۔ جوان جدید اسلحہ سے لیس' ادھیڑ عمر لوگوں کے پاس پرانی تھری ناٹ تھری اور بوڑھوں کے پاس اپنی ہم عمر کلچ والی سنگل شاٹ رائفل' مگر کسی کو خالی ہاتھ نہ پایا۔

صبح ۱۷ تاریخ تھی۔ وہاں سے روانہ ہو کر لدھا سے گزرے' آگے لنگر خیل آباد ہیں جن کی لوٹ مار میں بہت شہرت ہے اور ہر گروہ کا سردار عموماً لنگر خیل ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر سے سڑک کے موڑ پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا نظر آیا غالباً ایک صدی کے لگ بھگ عمر ہو گی مگر بندوق گھٹنوں پہ رکھ کر بیٹھا تھا' رزمک سے ذرا پہلے ساؤتھ وزیرستان ختم ہو جاتا ہے۔ غالباً آخری اڈہ میکن ہے جہاں بسوں کا اڈہ' ورکشاپیں' سپیئر پارٹس کی دکانیں' چند دوسری دکانیں اور چند ایک ہوٹل بھی ہیں۔ ایک ہوٹل پر ''وزیر آباد ہوٹل'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ آگے وادی بہت کھل جاتی ہے۔ بلندی بھی سات ہزار فٹ کے لگ بھگ ہو جاتی ہے۔ لہذا موسم بہت خوشگوار ہو جاتا ہے۔ یہاں رزمک کی مشہور چھاؤنی ہے۔ اب یہاں کیڈٹ کالج ہے اور چھاؤنی کا علاقہ سکاؤٹس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اب کسی حد تک سویلین آبادی بھی ہے۔ انگریزی عہد میں صرف انگریز افسر رہتے تھے اس کا نام چھوٹا ولایت بھی تھا۔

تھوڑی دور جا کر وادی پھر تنگ ہو کر سڑک کو پہاڑ کے اوپر دھکیل دیتی ہے۔ ہر طرف پٹھانوں کے روایتی قلعہ نما گھر بکھرے پڑے ہیں۔ چھوٹی بڑی آبادیاں ہیں۔ رزمک سے آگے پہاڑ اور بھی زیادہ خطرناک شمار ہوتے ہیں۔

ہمارے ساتھ مقامی احباب کی ایک مسلح موٹر بھی تھی پھر بھی انہیں فکر تھی کہ خدانخواستہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آجائے۔ اللہ کریم ایسے قادر ہیں کہ اسی دن رزمک گورنر سرحد کا دورہ تھا۔ لہٰذا رزمک سے لے کر بون میرن شاہ روڈ تک سارے راستے پر سکاؤٹس پہرہ دے رہے تھے۔ ہم بھی بے فکر ہو کر سفر کرتے رہے۔ آرمڈ کاریں اور مسلح سنتری ہر موڑ پر کھڑے تھے۔ ہم نے اسے اللہ کی عطا سمجھا اور اس کا شکر ادا کرتے ہوئے آرام سے گزر گئے۔

پہاڑ کی بلندی پر الیگزینڈر فورٹ ہے۔ نہ جانے یہ سکندر اعظم کی یاد میں ہے یا اسکی کوئی اور وجہ ہے۔ بہر حال یہ اسکا راستہ بھی ہے۔ مغل فاتحین بھی اس راہ سے گزرے۔ محمود غزنوی کے گھوڑوں نے بھی بار ہا ان وادیوں کو عبور کیا اور سب سے بڑی بات کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ۲۹ ہجری میں وزیرستان کی زمین کو

اپنے قدموں سے روشن فرمایا اور جناب عبدالحلیم اثر افغانی کی پشتو کتاب "سرحدی قبائل میں اسلام کی روشنی" کے مطابق شمالی وزیرستان کی وادی شیرہ تلہ میں حضرت مجاشع برادر، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فوجی کیمپ تھا۔ وادئ ٹوبیہ (بالائی دوڑ) میں کفار کے جو آثار پہاڑوں پر ملے ہیں۔ ان کے خلاف جہاد میں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کی شراکت کا پتہ ملتا ہے۔ رزمک میں جو کتبہ ملا ہے اسکے مطابق ۱۵۴ ہجری تک سلیمان الوزیر برکی کی حکومت تھی۔ یہی طوفان نور تھا جو سرزمین سرحد کو منور کر گیا اور قبائلی علاقوں میں ہر طرح کی جہالت بے علمی سخت مزاجی کے باوجود جذبۂ دیں کبھی سرد نہیں پڑا۔

یہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامت ہے کہ جہاں جہاں ان کے قدم مبارک لگے ہیں اس مٹی کے مزاج میں اسلام رچ بس گیا ہے افغانستان سرحد اور قبائل کی دینداری سب انہی کرامات کا ثمر ہے۔ اور تب سے لے کر آج تک کفر کی ہر آندھی ان پتھروں سے ٹکرا کر مڑ گئی۔ جنہوں نے غلامانِ نبوت کے پاؤں چومے تھے۔ ان پہاڑوں کی بلندیاں ایک بار پھر ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں تو سڑک تیزی سے نیچے کو آتی ہے موڑ پہ موڑ کاٹتی ہوئی پہاڑ کے ایک سرے سے جھانکتی ہے تو سامنے کھلی وادی نظر آتی ہے۔ زمین کا مزاج ایک سا ہے لوگوں کا لباس ایک سا ہے۔ سلوک ایک طرح کا۔

ان ڈھلوانوں سے ذرا آگے نکل کر ڈوسلی آتا ہے جہاں انگریزوں کا مشہور کیمپ ہوا کرتا تھا۔ قلعہ بھی ہے جس پر ۱۹۳۰ء کا سن لکھا ہوا ہے۔ میر علی، جو میرن شاہ روڈ پر چھاؤنی تھی سے چل کر یہی کیمپ ہوا کرتا تھا ایک انگریز افسر نے پٹھانوں کی روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن نالے کی طرف سے ہم پر فائر آنے لگا جو ایک رائفل کا تھا اور تھوڑی دیر بعد آرہا تھا۔ میں نے نوجوانوں کو حکم دیا کہ پیچھے سے

جاکر گھیر ادے لیں۔ چنانچہ گھیر اڈال کر بندوق رکھوا لی گئی تو وہ ایک نوجوان لڑکی تھی جسے وہ میرے پاس لائے اسکے بال ماتھے پر سے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے کوئی بات نہ کی۔ چنانچہ مسلمان صوبیدار کی تحویل میں دے دی جس نے علیحدہ کوارٹر گارڈ میں بند کر دی۔ صبح اسکے ورثا آئے کہ ہمیں سزا دے لیں اور بچی کو رہا کر دیں۔

میں نے گیٹ سے باہر نکل کر ان کی بات سنی اور پوچھا :-

''اس کی جگہ کون سزا کے لئے تیار ہے؟''

تو ایک جوان آگے بڑھا یہ اس کا منگیتر تھا۔ جسے گرفتار کر کے لڑکی کو چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ ابھی گیٹ بند ہی ہوا تھا کہ ایک فائر ہوا پتہ چلا کہ لڑکی کے بھائی نے اسے گولی مار دی تھی کیونکہ رات وہ دشمن کی قید میں گزار چکی تھی اور اب اس کی خون میں نہائی ہوئی لاش کندھے پر لاد کر گھر جا رہا تھا۔

کیسے عجیب لوگ ہیں؟ اور کتنی عجیب روایات کے حامل ہیں' لیکن شاید یہ بات ان ذہنوں میں نہ سما سکے جو ابھی انگریز بننے کی کوشش میں اپنے چونڈے کٹا کر عجیب شکلیں بنائے پھرتے ہیں۔

یہ پتھر' یہ جھاڑیاں' یہ خشک برساتی نالے' یہ سنگلاخ پہاڑ۔ نہ ان میں زراعت ہے' نہ پھل لگتے ہیں نہ پھول کھلتا دکھائی دیتا ہے نہ چشمے ابلتے ہیں' نہ بلبل کا نالہ ہے نہ رگ گل' نہ حسن و عشق کی داستانیں ہیں نہ ہجر و فراق کے قصے مگر ہر پتھر اذان کی آواز سے گونجتا ہے۔ ہر وادی اللہ اکبر کہتی ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا آزاد ہے بالکل آزاد اور وہاں کا ہر باسی آزاد ہے۔ انکا سر رب کریم کے حضور بار بار جھکتا ہے مگر اس کے سوا کسی کے آگے جھکنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جذبوں کی سرزمین ہے' روایت کی امین۔ اللہ اسے سلامت رکھے! اس کے جذبوں کو تاقیامت رکھے! آمین

آگے پھر پہاڑ کی بلندی عبور کرنا پڑتی ہے جس کے دوسری طرف دریا کے ساتھ

ایک طرف دوڑ آباد ہیں اور دوسری طرف وزیر۔ یہیں چھوٹا سا گاؤں ایپی بھی ہے۔ مجاہد کبیر مرزا (بھائی) علی خاں طوری خیل فقیر ایپی کا گاؤں' جو انگریز کے لئے برق تپاں ثابت ہوا۔ یہ پانچ فٹ سات انچ کا دبلا پتلا' کمزور سا انسان جو دمہ کا مریض بھی تھا' رنگ گندمی سیاہی مائل' داڑھی پتلی اور آواز نحیف تھی مگر جذبہ جوان تھا اور گیارہ برس انگریزی فوج کے لئے بلائے ناگہانی بنا رہا۔ آخر عمر میں چارپائی سے اٹھنے کے قابل نہ رہے تھے مگر ہمت نہ ہاری۔ پاکستان بننے کے بعد گوروسخت ہی میں قیام پزیر ہو گئے کہ انگریز کے گماشتوں نے ان کے بارے غلط فہمیاں پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ دوسری طرف انہیں پٹھانستان کے لئے پاکستان کے ساتھ جنگ کرنے کی ترغیب دی۔ مگر اس مرد قلندر نے فرمایا۔

" مسلمان کا قتل حرام ہے' یہ جہاد نہیں ہو سکتا۔"

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ہم نے ٹوچی دریا پل پر سے ایشا کے مقام پر عبور کیا۔ کھجوری اور میر علی سے گزرے۔ میر علی تو آج بھی عرب کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ وسیع میدان اور ہر طرف کھجوروں کے جھنڈ' اس چھاؤنی کی یاد تازہ کر دیتے ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہاں بنائی تھی۔

یہاں سے آگے راستہ میرن شاہ کو جاتا ہے جسے میرم شاہ بھی لکھا جاتا ہے بہت بڑی آبادی ہے' ڈگری کالج ہے' پولیٹیکل ایجنٹ کا دفتر ہے۔ اور تیس سے چالیس ہزار کے قریب افغان مہاجرین کے گھر آباد ہیں۔ آبادی کا اندازہ کر لیں۔ میرن شاہ میر علی وغیرہ بازاروں میں ہر قسم کا اسلحہ کلاشن کوف' پستول راکٹ لانچر' اینٹی ایئر کرافٹ اور چھوٹی توپیں دکانوں پہ یوں بھری پڑی ہیں۔ جیسے گاجر مولی ہوں۔ بہت بڑا بازار ہے۔ میرن شاہ سکاؤٹس ہیڈ کوارٹر اور ہیڈ کوارٹر ہسپتال بھی ہے۔ نیز بہت بڑا تجارتی

مرکز ہے۔

یہاں پہنچ کر ہمارا وزیرستان کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ رات پروفیسر محمد ابراہیم صاحب کے ہاں قیام رہا۔ مسجد میں بیان اور ذکر ہوا اور ۱۸ اکتوبر کو صبح چل کر کچھ دیر بنوں رکے پھر لکی مروت عیسیٰ خیل اور میانوالی سے ہوتے ہوئے مرشد آباد ٹھہرے اور شام تک بفضل اللہ واپس پہنچ چکے تھے۔

ایک خوبصورت یاد' ایک بہترین تجربہ' بہت سے اچھے لوگ اور بے شمار مجاہدوں کی ملاقات۔ کچھ اپنی کہی' کچھ ان کی سنی اور یوں بفضل اللہ ہم نے ایک ہفتہ شیروں کی کچھار میں بسر کیا۔

"غبار راہ سے"

مشاغل

مشغلہ اور شوق کے حوالے سے مجھے بچپن ہی سے شکار سے لگاؤ رہا ہے۔ جس زمانے میں خال خال بندوقیں ہوتی تھیں' اس زمانے میں بھی بندوقیں اور شکار میرا مرغوب شوق تھا۔ نشانہ خطا نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں بہت شکار کھیلا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے اٹھارہ بیس سال شکار کا گوشت ہی کھایا۔ قصاب سے گوشت خریدنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ میرا نشانہ اب بھی بہت اچھا ہے۔ مجھے اچھے سے اچھا اسلحہ رکھنے کی عادت ہے۔ شکار میرے مزاج اور ماحول سے بھی مطابقت رکھتا تھا۔ اور بہترین ایکسر سائز کی حیثیت سے چاک وچوبند بھی رکھتا تھا۔

بطور مشغلہ میں نے چڑیا گھر بھی بنایا۔ جس میں ہرن' ہڑیال' بندر' مور' تیتر اور مختلف جنگلی پرندے رکھے تھے۔ سانپوں کی مختلف اقسام بھی تھیں۔ نایاب سانپ گولڈن کوبرا بھی تھا۔ اس کے علاوہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور اچھی نسل کے بیل بھی پالے' جو مختلف کھیل' کرتب اور رقص کے ماہر ہیں۔ ایک شوق نوادرات جمع کرنے

کا بھی ہے۔ میرے پاس قدیم سکے دنیا کے ہر ملک کی کرنسی موجود ہے۔ قدیم اسلحہ، قدیم تلواریں میرے پاس موجود ہیں۔ ان میں سید احمد شہید اور غازی امان اللہ کی تلواریں، امیر عبدالرحمن بچہ سقہ کا طمنچا بھی شامل ہے۔ ایٹمی ریت کے ذرات بھی میرے ذخیرہ نوادارات میں موجود ہیں۔

ان کے علاوہ دنیا کے قدیم ترین جانور ڈائینوسار کے دانت اور ہڈیاں، سٹار فش کے فوسلز اور قدیم درختوں کی پتھریلی ہیئت اور پتھر بنے سیپ جیسے نوادرات بھی میرے پاس ہیں (سیپ کو پتھر بننے میں کروڑوں سال لگتے ہیں)۔

مجھے تاریخ اور تاریخی مقامات سے لگاؤ ہے۔ ہمارے علاقے میں مغلوں نے سمر قند فورٹ تعمیر کیا تھا لیکن اس کے آثار مٹ گئے تھے۔ میں نے وہ آثار تلاش کئے۔ دشوار گزار بلندیوں پر سمر قند فورٹ کی صرف ایک دیوار باقی ہے۔ وہاں سے ایک طرف اٹک اور دوسری طرف جہلم تک دوربین سے نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

برفانی چوٹیوں کا ہیرو

شکار عمر بھر میری کمزوری رہا ہے اب عمر بھی ڈھل چکی ہے۔ ساتھ مختلف امراض نے بھی دوستی کرلی ہے۔ خصوصاً ذیابیطس جو سب کا جامع ہے اب عمر بھر کی ساتھی ہے۔ علاوہ ازیں موٹر کے دو حادثات نے بدن کا ڈھانچہ ہلا دیا ہے۔ اور ہر حرکت پر کسی نہ کسی جوڑ سے چوں چوں کی آواز آتی ہے۔ درد کی ٹیس اٹھتی ہے۔ اس کے باوجود شکار کا جذبہ جوان ہے۔ ایک بار ہل آزاد کشمیر تک خوار ہوا ہوں اور شکار بھی نہ ملا۔ اب کے پھر سو جھی تو ہمالہ کی ترائی میں جانے کی تیاری کی اور مشہور مار خور جو اڑیال ہی کی نسل کا جانور ہے اور پہلے اسکے بارے میں لکھ بھی چکا ہوں کے شکار کی تیاری کرلی۔

چنانچہ مارچ کے پہلے ہفتے رخت سفر باندھا اور چل نکلا۔ ڈاکٹر صاحب تو ویسے ساتھ ہوتے ہیں۔ بٹ صاحب ابو ظہبی سے آئے تو انہیں ہمالہ کے دامن میں جھانکنے کا شوق چرایا۔ اس طرح ہم تین آدمی عازم سفر ہوئے۔ دامن کوہ میں ایک

دوست کو اطلاع دی۔ جن کا نام نامی ٹی ڈبلیو میر ہے۔اور یوں ان کے پاس آ دھمکے۔اس گاؤں میں حاجی صاحب معروف شکاری ہیں۔ پہلے کئی بار مل کر شکار پر جا چکے تھے۔انھیں بلوایا اور یوں تعداد پانچ ہو گئی۔اب مسئلہ کھانے پینے کا تھا۔ چنانچہ ایک عزیز ارشاد السالکین کو یہ ذمہ داری سونپی اور یوں اللہ کے نام پر ہم تیار تھے۔

فیصلہ ہوا کہ علی الصبح ایک بجے روانہ ہوا جائے اسلئے کہ ایک تو راستہ خطرناک ہے اور خراب بھی ہے۔دوسرے کم از کم تین سو کلو میٹر فاصلہ طے کرنا ہے۔ چنانچہ رات سب نے اپنے اپنے حصے کی اشیاء کو پیک کیا۔ڈاکٹر صاحب نے ادویات' بٹ صاحب نے کیمرہ' میر صاحب نے بندوقیں اور چھٹے جوان نے کھانے پینے کا سامان جمع کیا۔ جیپ تیار کی اور عشاء کے بعد سونے کے لئے لیٹ گئے۔

مگر مجھے نیند نہ آئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب میرے کمرے میں تھے۔ انہیں بھی سونے نہ دیا اور گپ شپ چلتی رہی۔ پونے ایک بجے سب کو جگایا۔ تہجد ادا کی' چائے پی اور نکلتے نکلتے ڈیڑھ بج گیا۔ڈرائیونگ کے لئے قرعۂ فال میرے نام پڑا۔یاد رہے بندوقیں ہمارے پاس صرف دو تھیں۔ ۲۷۔ ۷ اور ایک بارہ بور کہ ممکن ہے کوئی پرندہ شکار کر لیں۔

باتیں کرتے رہے اور جیپ پہاڑی راستوں کے پیچوں میں ہچکولے کھاتی فجر کے وقت تقریباً دس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ایسی وادی میں داخل ہو چکی تھی۔ جہاں سے شکار گاہ شروع ہو جاتی ہے۔

سرد ترین ہوا سینہ شق کئے دیتی تھی۔ فجر کا وقت داخل ہو رہا تھا۔ جیپ روکی اور نماز ادا کی۔ چائے کا ایک ایک کپ پیا اور جیپ میں بیٹھ کر ذکر الٰہی کرنے لگے۔ کچھ روشنی ہوئی تو آگے چلے۔

ہماری جیپ کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ جیپ سے پہاڑ کے دامن اور تنگ وادی

کو دیکھتے جا رہے تھے کہ علی الصبح وہاں مار خور کے ملنے کے امکانات تھے۔ ورنہ پہاڑوں کے پیچھے تو کسی بھی وقت مل سکتے تھے۔ مگر وہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہمارا شکار تو یہ تھا کہ سڑک پر فائر کر لیں۔

آہستہ آہستہ بلندی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور وادی بھی سمٹتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وادی تنگ ہو رہی تھی۔ سردی کے علاوہ ہوا میں شدت بھی آتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ سات بجے کے قریب ہم ایک ایسے موڑ پر تھے۔ جہاں ایک طرف سے دھوپ پڑ رہی تھی اور وادی میں یا دھوپ کے گزرنے کا راستہ تھا یا برفانی پانی کا نالہ سا بہہ رہا تھا۔ یہی مختلف نالے جوں جوں نیچے جاتے ہیں ملتے جاتے ہیں اور آخر دریا کا روپ دھار لیتے ہیں۔

میں تو بڑی احتیاط سے جیپ لے جا رہا تھا کہ نالے کے پار مٹی پر کنکر گرے۔ چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر سے آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کنکر گر رہے ہیں۔ یہ عموماً اوپر جانوروں کے ہونے کی دلیل ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں نے جیپ روکے بغیر حاجی صاحب سے کہا کہ پچھلا دروازہ کھول کر اوپر دیکھیں۔

حاجی صاحب نے خبر دی کہ مار خور اوپر ہے۔ جیپ رک گئی۔ ہم نیچے اترے دیکھنا شروع کیا تو آٹھ دس کے قریب مادائیں اور نوخیز بچے ایک طرف سے گزر رہے تھے اور کافی بلندی پر جا چکے تھے۔ ویسے بھی مادہ یا چھوٹا ہمارا ٹارگٹ نہیں تھا۔ اور ان چٹانوں سے انہیں دیکھنا بھی آسان کام نہیں کہ ان کا رنگ اور عمودی چٹانوں کا رنگ ایک جیسا ہوتا ہے۔ معاً ایک چٹان کی اوٹ سے تین بڑے بڑے نر نکلتے ہوئے نظر آئے۔ یہ جوں جوں بڑے ہوں رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے وہ تقریباً نمایاں ہوتے ہیں۔ اگرچہ پانچ سو گز سے تو دور ہی ہوں گے۔ مگر شکاری کب جانے دیتا ہے۔ فوراً رائفل سے نشانہ لینے لگا۔ اب دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایسی جگہ ہو جہاں جانور زخمی ہو کر گرے تو آپ اسے حاصل بھی کر سکیں۔ ورنہ مار خور اکثر ایسی

جگہ نظر آتا ہے جہاں انسان کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ میں بھی سانس روکے اندازہ کر رہا تھا کہ کہاں فائر کروں۔ وہ آہستہ آہستہ اوپر ہی اوپر جا رہے تھے۔ چٹان بالکل عمودی تھی۔ آخر ایک جگہ ایک جانور ایسی پوزیشن میں کھڑا ہوا کہ ایک ابھری ہوئی چٹان تھی جو اس عمودی چٹان پر کنگرے کی طرح بنی تھی۔ اور جانور اسکے اوپر نظر آیا۔ صورت حال یہ تھی کہ اس طرف گرے تو نیچے آنے تک راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی اور اگر دوسری طرف گر گیا تو پھر شاید پرندوں کی غذا کا کام دے۔ فاصلہ زیادہ تھا سوچا گر بھی گیا تو تڑپے گا۔ اٹھنے کی کوشش کرے گا اور یقیناً نیچے آنے گا۔ چنانچہ ٹریگر دبا دیا۔ دھماکہ گونجا اور ساتھ ہی جانور چٹان کی دوسری طرف گر گیا۔ ساتھی دوربین لگائے دیکھ رہے تھے۔ اور گولی ایسی کاری لگی کہ پھر تڑپا بھی نہیں۔ باقیوں نے رفتار بڑھا دی۔ اوپر کو بھاگنے لگے۔ یہ رائفل بہت ظالم قسم کا زخم لگاتی ہے۔ اگرچہ دور تھا مگر وہیں رہ گیا اور ہم حسرت سے ان بلند چٹانوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو ہماری ہنسی اڑاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ہمالہ کی ترائی پہ زندگی اور موت کا کھیل روزمرہ کے معمولات کا حصہ ہے۔ بہر حال ہم نے سمجھا کہ پرندوں کی غذا کا اہتمام ہوا اور آگے چل دیئے۔ دراصل ہمیں اطلاع تھی کہ ۷۰۰۰ افٹ بلندی پر ایک وادی ہے۔ آج کل اس میں مارخوروں کا ایک گلہ ملتا ہے۔ جو دو صد سے زیادہ ہی ہوں گے۔ اور وہی وادی ہمارا ٹارگٹ تھی۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ابھی مزید دو گھنٹے جیپ چلانا تھی۔ لہذا ہم ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے چلتے رہے۔ ایک جگہ پہنچ کر ایک دم سے بلندی شروع ہو جاتی ہے۔ لہذا وہاں رک کر چائے پی۔ دراصل اس سے پہلے وادی کا سفر کافی تھکا دینے والا تھا۔ اگرچہ چڑھائی زیادہ نہ تھی مگر بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ اور وہاں پہنچ کر ایک دم سے اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ اور سڑک اوپر تلے بہت سے موڑ کھا کر بلندی کو چھو لیتی تھی۔ جہاں ہم تھے یہاں دریا جم چکا تھا اور ہر طرف برف کی چاندی بکھری پڑی تھی۔ چائے کا کپ پیا اور چل پڑے۔ اللہ کا نام لے کر

اوپر اوپر چڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ موڑ ختم ہو چکا تھا۔ اور ایسی جگہ تھی جہاں سے دریا شروع ہوتا تھا۔ یہاں پانی جما ہوا تھا اور دریا پر خوبصورت میدان بنا ہوا تھا۔ جس کے کنارے پر ہم سفر کر رہے تھے۔ اس طرف تو تھوڑی سی ڈھلان تھی مگر دوسری طرف ایسی پہاڑی تھی جو دریا سے ہی سیدھی اٹھتی تھی اور کوئی دو سو گز تک چٹان سی تھی۔ جس میں انسان کے لئے چڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ پھر اس پر تازہ برف بھی پڑی ہوئی تھی کہ اتنی بلندی پر تو کم از کم ہر رات کو ضرور برف باری ہوتی ہے۔

ہم حسن فطرت کی رعنائیاں دیکھنے میں مصروف تھے۔ سامنے سے ایک شیر نے سڑک عبور کی اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے برفانی شیر کو شاہانہ انداز سے گزرتے دیکھا۔ سفید برف کی طرح جسم اور اس پر گول گول دائرے سے بنے ہوئے تھے۔ نہایت لمبی دم چمکدار آنکھوں اور بہت بڑے بڑے پنجوں والا (Snow Leopard) سنو لیپرڈ تھا۔ جو خونخوار ترین درندہ ہے۔ یہ انتہائی بلندیوں کا باسی ہے۔ اور برفانی درندوں میں تو سب سے بڑا ہے سوائے ریچھ کے مگر زندگی میں اسکا ریکارڈ ہے کہ کبھی دو بھی مل کر نہیں رہتے۔ ہر ایک نے اپنا علاقہ مختص کر رکھا ہوتا ہے۔ جو دوسرے کو گھسنے نہیں دیتا۔ صرف ملنے کا موسم ہو تو نر مادہ کچھ روز مل کر رہتے ہیں۔ ورنہ پھر علیحدہ ہی رہیں گے۔ یہ کبھی شیر اور چیتے کی طرح کنبہ نہیں بناتا۔

شیر ہم سے بے نیاز دریا کے تختے پر سے گزرا اور سامنے کی ترچھی چٹان پر چڑھنے لگا مگر اسکا انداز ایسا تھا کہ جیسے لڑکے کھیلتے ہیں۔ اگلے پنجوں سے گولے سے بناتا ہوا نظر آتا تھا اور آہستہ آہستہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی روکی۔ رائفل نکالی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا بیٹھے بیٹھے ہوئے فائر کریں مگر میں تو سٹیرنگ کے پیچھے پھنسا ہوا تھا۔ لہذا نیچے اترنے کے سوا چارہ نہ تھا اور نیچے اترنا بہت خطرناک تھا کہ اگر درندہ حملہ آور ہو گیا تو کیا ہوگا۔ کیوں کہ اس کی عادت ہے کہ یا تو فائر کے دھماکے

سے بھاگ جاتا ہے اور یا پھر حملہ کر دیتا ہے یہ دوسری صورت اس کے معمولی زخمی ہونے میں بھی بالکل یقینی تھی یعنی اگر گولی کم خطرناک لگتی تو ضرور حملہ کرتا۔ مگر اللہ کا کرنا یہ ہوا جب میں نیچے اترا تو درندہ رک کر کھڑا ہو گیا اور اپنا رخ تو اسی طرف رکھا مگر سر گھما کر مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے یہ بات پسند نہیں آرہی تھی۔

میں نے رائفل کندھے سے لگا کر نشانہ لیا اور انتظار کرنے لگا کہ ممکن ہے یہ پہلو بدلے اور یوں بڑا ٹارگٹ بن جائے۔ مگر وہ اسی طرح کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ حاجی صاحب جیپ میں سے شور کر رہے تھے کہ یہ پہلو بدل کر کھڑا رہے گا یہ حملہ آور ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو پھر اسے مارنا آسان کام نہیں ہوتا کہ وہ بجلی کی طرف حرکت کرتا ہوا آتا ہے۔ برف میں جہاں کئی کئی فٹ پاؤں دھنس جاتے ہیں۔ یہ ۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ اور باہر تو ۷۰ میل تک اس کی رفتار ہوتی ہے۔ نیز یہ بہت بڑی چھلانگ لگاتا ہے۔ لہٰذا میں نے ٹریگر دبا دیا کہ زیادہ انتظار کا موقع نہ تھا۔ رائفل گرجی اور شیر وہیں کھڑا رہا تو میں نے سوچا کہ گولی اس کا کام کر گئی ورنہ اسے یا بھاگ جانا چاہئے تھا یا پھر حملہ آور ہوتا۔

وہیں کھڑے کھڑے اس نے پہلو بدلا تو دوسرا فائر کیا وہ چند قدم اوپر کو چلا پھر ایک فائر کیا وہ دو قدم اور بڑھا۔ حاجی صاحب نے کہا مجھے دیں میں فائر کروں۔ انہوں نے کیا تو دو قدم اور چلا۔ میر صاحب نے للکارا مگر میں نے منع کر دیا۔ دراصل ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس صرف ایک میگزین تھی جس میں ۲۸ گولیاں تھیں۔ جن میں بیشتر درہ کی تھیں۔ جو یا تو فائر نہ ہوتیں اور اگر ہو جاتیں تو نشانہ پر لگنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ کوئی بھی نہ لگی اور چند مس بھی ہو گئیں یعنی سرے سے فائر ہی نہ ہوئیں اور اب باقی صرف تین تھیں۔ کچھ تو راستے میں فائر ہو چکی تھیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ شیر پر فائر ہونے والی گولی صحیح تھی۔

خیر شیر کھڑے کھڑے بیٹھ گیا مگر ابھی تک سر اٹھا کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر آرام سے سر رکھ دیا۔ تو میں جان گیا کہ اس نے جان دے دی۔ معاً اسے پلٹا کھایا کہ پنجوں

کی گرفت ختم ہو چکی تھی اور پھر پلٹنے پہ پلٹے کھانے لگا۔ حاجی صاحب چلا رہے تھے۔ خدایا اسے نیچے لانا۔ خدایا راستے میں رک نہ جائے حتیٰ کہ وہ پلٹے کھاتا دریا کے منجمد پانی پر آگیا۔

اب ہماری باری تھی۔ احتیاط کے ساتھ اس کی طرف اترنا شروع کیا۔ حاجی صاحب کو بندوق تھمائی کہ ممکن ہے معمولی جان ہو تو آدمی کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ تیزی میں اترے تو برف میں گرے ڈاکٹر صاحب اور میرے سوا سب نے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کی تقلید کی۔ دراصل جہاں برف کرسٹل بن چکی ہو وہاں پاؤں پڑ جائے تو گرنے کا مزا آجاتا ہے۔ اور اٹھ اٹھ کر گرنا پڑتا ہے۔
بہر حال یوں افتاں و خیزاں ہم اس تک جا پہنچے۔ بڑی احتیاط سے دیکھا مر چکا تھا۔ اب مسئلہ کھال اتارنے کا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ ناپ کیا تو ناک سے دم تک ساڑھے سات فٹ تھا۔ اور برفانی شیر کا بہت بڑا سامنہ تھا۔ ورنہ تو سفید چیتے کی نسل وہاں ملتی ہے جو چھوٹے چھوٹے کتے کے قد کا ہوتا ہے۔ بہر حال ہم نے کھال جیپ میں رکھی اور گوشت تو مقامی آبادی کا حصہ تھا جو کبھی کبھار اگر شیر ہاتھ آجائے تو اس کے گوشت پر باقاعدہ تہوار مناتے ہیں۔ شکاریوں کے نعرے اپنا الگ حسن رکھتے ہیں۔ اب واپسی کا سفر درپیش تھا جو کم از کم ۷ گھنٹے کا تھا لہٰذا ہم جانب منزل چلے اور شام ہوتے ہوتے قیام گاہ پہنچ چکے تھے۔ یہ زندگی کا انوکھا تجربہ تھا کہ چند سو گز سے زمین پر کھڑے ہو کر آمنے سامنے سے ایسے خونخوار درندے کا شکار ہوا۔ جس کے بارے میں ایسا سوچنا بھی مشکل ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیماری اور حادثات کے بعد اللہ کریم نے اس قدر صحت بخشی کہ میں نے اس روز تقریباً ۱۴ گھنٹے پہاڑی راستوں پہ جیپ چلائی جو جانے خود ایک مشکل ترین کام تھا۔

"حوالہ غبارِ راہ"

ابھرتے ڈوبتے سورج

زندگی کے شب و روز کی ہلکی سی جھلک!

۱۵ مئی ابوظہبی

الحمد لله رب العلمین والصلوة والسلام علے حبیبه محمدواله واصحبه اجمعین.اما بعد فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم بسم الله الرحمن الرحیم.

کل صبح گھر سے نکلا تو طبیعت بہت بوجھل تھی۔انسان بہر حال انسان ہے اللہ کی ایک عاجز مخلوق! ضروریات' احساسات اور احتیاجات میں جکڑا ہوا۔اسی عالم آب و گل میں ایک طرف یہی ضرورتیں اس کے راستے کی بہت بڑی دیوار ہیں اور دوسری طرف رب جلیل اور اس کا حسن بے مثال ولازوال 'جس کی اطاعت اور اسکے احکام پر عمل کے ساتھ ان کی اشاعت 'اسکا فریضہ ہے۔

دراصل یہ محض فریضہ ہی نہیں 'انسان کی ابدی اور دائمی زندگی کی تمام

ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے مگر انسان اپنی کوتاہ بینی اور کم نظری نیز فطری کمزوری کے سبب فوری اور دنیاوی ضرورتوں کی تکمیل میں الجھ جاتا ہے اور اسے فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ضرورت انسان کی اپنی ہے مگر اللہ کا کرم دیکھیں کہ اس نے فریضہ قرار دے دیا اسکے باوجود کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو اسکو نبھانے کی سعی کرتے ہیں' اگر محض انسانی ضرورت ہی کی سطح پر رکھا جاتا تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد شاید ہی کوئی انسان اسکی تکمیل میں کوشاں نظر آتا۔

انسان عجیب شے ہے سوچتا ہے' ذرا فراغت ہوگی تو کرلوں گا' بیبنی! کس بات سے فراغت؟ اگر ضروریات زندگی اور مسائل حیات سے فراغت مراد ہے تو کبھی نہ ہوگی کہ جب تک زندگی ہے اس کی ضروریات بھی رہیں گی لہذا زندگی کی اس ہماہمی سے ہی ان فرائض کے لئے وقت نکالنا ہوگا' اس کے ساتھ رب جلیل کا وعدہ ہے کہ تمہاری ضرورتوں کو پورا کرنا میرا کام ہے کہ میں تمہارا رب ہوں اور میری طلب میں' میری اطاعت کے لئے کوشاں رہنا یہ تمہاری زندگی کا مقصد ہے۔ بات کہنے میں تو آسان سی ہے مگر کرتے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ کام کس قدر مشکل ہے۔

رمضان المبارک سے تین روز پہلے گھر لوٹا تھا۔ جنوری میں حرمین الشریفین کی زیارت سے سرفراز ہوئے۔ تو وہاں سے کینیا (مشرقی) چلا گیا۔ پھر نیروبی سے ابوظہبی' دوبئی ہوتا ہوا کراچی اور اسلام آباد پہنچا' چند روز گھر قیام کیا اور گلگت چلا گیا وہاں سے پلٹا' تو ایک آدھ دن گھر ٹھہر کو گوجرانوالہ' لاہور اور وہاں سے جہاز پر بیٹھ کر کراچی جا اترا۔ واپسی پر سکھر اور پنوں عاقل سے ہوتا ہوا فیصل آباد پہنچا' وہاں سے گوجرہ' جھنگ ہوتا ہوا گھر آیا تو پشاور چلا گیا اور یوں ۴ اپریل کی شام گھر پہنچا اور ۸۔ اپریل سے رمضان المبارک شروع ہو گیا برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ! اس کی برکات میں سے ایک بہت بڑی نعمت احباب کا اجتماع ہے جو دارالعرفان کی زینت بنا

ہے۔ یکم رمضان سے ہی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ اکیڈیمی کے اساتذہ اور نونہال تو ہوتے ہی ہیں یوں رونق بڑھنے لگتی ہے۔

حافظ غلام جیلانی صاحب نے تراویح میں قرآن سنانا شروع کیا' ساتھ ہی اسرار التنزیل کی تیسری جلد تقریباً آدھی لکھنا باقی تھی۔ وہ کام شروع کیا' احباب کی آمد' ڈاک اور اس کے جوابات کے ساتھ صبح ۸ بجے سے ۲ بجے تک لکھنے کا معمول بنایا پھر بھی کبھی پچھلے پہر لکھنا پڑتا اور یوں رمضان المبارک کے دو عشروں میں ختم قرآن بھی مکمل ہوا اور تفسیر بھی مکمل ہو گئی۔ اب اعتکاف کے دن آپہنچے اور تقریباً چار سو ساٹھ احباب سنت اعتکاف کے لئے پہنچ گئے۔ نفل کے لئے آنے جانے والوں کو ملا کر آٹھ صد سے ایک ہزار کے لگ بھگ مہمان اللہ کے گھر کی رونق تھے۔ ذکر کے معمولات' بیان اور تعلیم و تعلم کے اوقات شب و روز پر چھا گئے' سبحان اللہ! کیا بہار تھی کہ رواں رواں اور لحہ لحہ ذاکر تھا' دنیا اور غم دنیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یوں عید کی خوشیوں پہ یہ رونق تمام ہوئی تو فصل کی کٹائی کا کام تھا۔ اکیڈمی میں کچھ اضافے کئے جا رہے ہیں ان کا جائزہ لینا تھا' کچھ کاروباری ضرور تیں بڑے دو بچوں کے ذمہ کیں فصل کسی حد تک سنبھال لی گئی کچھ کام باقی تھا' درمیان میں ایک دن امریکہ کا ویزا لینے میں بسر ہو گیا اور یوں خود کو کھینچ تان کر ۱۴ مئی صبح منارہ سے نکلا۔

عبدالقدیر کا پاؤں ٹخنے پر سے جل گیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے بخار تھا' بہر حال تمام کاموں کے لئے رب جلیل سے دعا کی اور چل پڑا سیتھی گیا وہاں چچی بیمار تھی' اور دوسرے اہل خاندان سے ملاقات بھی مقصود تھی۔

گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ اہلیہ کو رات دل کا دورہ پڑا ہے اٹھنے کے قابل نہیں' موٹر سے اتر کر اندر گیا تو عجب حال تھا' نقاہت سے چور' چہرہ زرد' چارپائی پہ پڑی تھی' بچے پریشان پھر رہے تھے' تیس برس کی زندگی کا ساتھ' ہر مشکل و آسانی میں اکٹھے بسر

ہوئی' بڑے بچے سے کہا' انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ کہ میں بھی ایک بارگاہ کا غلام ہوں' انہیں کے حکم کی تعمیل میں پابہ رکاب ہوں' شاید میری لئے کوئی چھٹی بھی نہیں اور نہ مانگنے کی جرات ہے لہذا سب کو اللہ کریم کے ہی سپرد کرتا ہوں۔

یوں سات بج گئے جبکہ مجھے نو بجے اسلام آباد ہوائی اڈے پہ ہونا چاہئے تھا۔ بڑے سے چھوٹا بچہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ حمد للہ' ہم نو بجے پنڈی پہنچ گئے۔ بہت سے احباب ملاقات کے انتظار میں تھے صرف سلام دعا ہی کر سکے۔ ایئر پورٹ پر پہنچے اور بارہ بجے شیر جہاں میر اور میں کراچی اتر رہے تھے۔ کرنل قیوم اور کرنل مطلوب صاحب کو لاہور سے آنا تھا وہ چھ بجے پہنچے۔

کچھ دیر کراچی آرام کر لیا' احباب جمع ہو گئے ملاقات کر لی' عصر کے بعد ذکر کی سعادت نصیب ہو گئی اور پھر اگلے سفر کے لئے تیار۔ ایئر پورٹ پہ پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کا دبئی کا ویزہ نہیں لگا' انہیں کراچی رکنا پڑے گا۔ لہذا باقی ہم چاروں وہاں سے سوا آٹھ بجے شام اڑے اور پاکستانی وقت کے مطابق ساڑھے دس بجے جبکہ دوبئی کے وقت کے مطابق ساڑھے نو بجے دوبئی پہنچے۔ مغرب کراچی ایئر پورٹ پر پڑھی تھی۔ عشاء دوبئی مکان پر آکر ادا کی۔

ہوائی اڈے پر بہت سے ساتھی منتظر تھے' الحمد للہ ملاقات نصیب ہوئی۔ رات دوبئی ٹھہرے' صبح ناشتہ کے بعد وہاں سے کار کے ذریعہ روانہ ہو کر ابو ظہبی آ گئے' پھر واپس دوبئی جائیں گے وہاں سے برطانیہ اور غالباً برطانیہ سے ڈنمارک اور ناروے وغیرہ ہو کر پھر لندن سے نیویارک اور کینیڈا جا کر واپس وطن روانہ ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

اب آج یہاں سے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کیا ہے۔ کسی خاص سفر نامے کی ضرورت تو محسوس نہیں کرتا' لکھنے کا بڑا مقصد تو احباب کو ان ممالک سے روشناس

کراناہے' جہاں سے اثنائے سفر گزر ہو گا یا ٹھہریں گے۔ نیز ان باتوں کا دوسرے احباب تک پہنچانا بھی مقصود ہے جو ان اجتماعات میں بیان ہوں گی کہ اسلام کی افادیت عالمگیر ہے اور تمام زمانوں کے لئے ہے۔

اللہ کریم سے توفیق کا طلبگار ہوں!

"غبار راہ سے اقتباس"

"شکار"

جہاں تک اپنے خاندان کے بارے میری معلومات ہیں۔ ہمارے خاندان میں شروع سے شکار کھیلا جاتا ہے۔ شاید یہ ورزش اور نشانہ بازی کا خوشگوار طریقہ ہے۔ یا کچھ لوگوں کے مزاج کی بات ہے۔

میرے دادا جان شکاری تھے ایک بار دوران شکار ان کی بندوق پھٹ گئی اور دائیں آنکھ ضائع ہو گئی تھی ،ان کے چھوٹے بھائی دوران شکار بندوق فائر ہونے سے شدید زخمی ہو کر فوت ہو گئے۔ اس زمانے میں بندوقیں توڑے دار ہوا کرتی تھیں بارود اور چھرے سامنے سے ڈال کر پیچھے ایک بند ٹوپی لگائی جاتی تھی جس پر چھمبر لگتا اور فائر ہو تا۔ نانا جان نے ساری عمر شکار کیا مشہور فوجی افسر اور معروف شکاری تھے یوں یہ خاندانی سی عادت ہمیں ورثہ میں ملی۔ اچھا اسلحہ اور شوق شکار جب پہلے سے موجود تھے تو ہم بھی اس میں مبتلا ہو نے۔ سکول سے نکلے تو فارغ وقت اسی شغل میں کٹتا۔ اس وجہ سے میں نے بے شمار جنگل گھومے اور جنگلوں سے بے شمار تاریخی نوادرات جمع کئے جن میں کئی فاسل کروڑوں اور باقی لاکھوں سال پرانے

ہیں۔ میں نشانے کے معاملہ میں بہت اچھا رہا اور بہت ماہر نشانہ باز مانا گیا۔ کار میں جاتے ہوئے تیتر سڑک سے گزرا تو ساتھ بیٹھے ہوئے دوست نے کہا بندوق ہوتی تو شکار کرتے میں نے کار روکی ریوالور نکالا اور تیتر گرالیا حالانکہ میں سٹیرنگ ویل کے پیچھے بیٹھا ہوتا تھا جہاں جسم کو موڑنا مشکل ہوتا ہے۔

شکار کھیل اور شوق کے لئے تو کیا مگر بے جا جانوروں کو مارنے کے لئے نہیں ایک ادھ ہرن' ہڑیال یا چند پرندے اور بس اسکے بعد جانور قریب پھرتے رہے گزرتے رہے نہیں مارے۔

ایک بار ایک سنولیپرڈ چین کے بارڈر کے قریب شکار کیا یہ بہت وحشی درندہ ہوتا ہے اور اپنے حلقے میں اکیلا رہتا ہے سیزن میں اگر نر مادہ چند روز اکٹھے مل کر رہیں تو پھر فوراً جدا ہو جاتے ہیں بہت عرصہ تک تو نیشنل جیوگرافی والوں کے پاس اس کی تصویر تک نہ تھی اب اسپر چھوٹا سا پروگرام ہے۔

ہم گلگت سے رات دو بجے مارخور کے شکار کے لئے گئے اور جب چین کے بارڈر کے ساتھ والی چوٹیوں پر پہنچے غالباً صبح کے ۹ بج رہے تھے تو سنولیپرڈ بھی شاید انہی کے شکار پر تھا ہمارے سامنے سے گزرا۔ اور منجمد دریا کو پار کر کے جو وہاں سے نالے کی صورت شروع ہوتا اگلی پہاڑی پر چڑھنے لگا میں نے جیپ روکی باہر نکلا ساتھی شکاریوں نے بہت روکا کہ بہت ظالم درندہ ہے اگر گولی خطا گئی تو تمہیں جیپ میں واپس نہ آنے دے گا۔ نیز اور کوئی اترا بھی نہیں مگر میں نے جیپ کے پاس بیٹھ کر نشانہ لیا اور لبلبی دبادی گولی شکار کا سینہ چیرتی ہوئی ایسی نکلی کہ جدھر سے نکلی ادھر پھیپھڑا باہر لٹک گیا میرے سفرنامے میں کہیں شاید اس کی تفصیل ہے۔

میرا شکار کا طریقہ یہ رہا ہے کہ علی الصبح تہجد کے بعد ایک کپ قہوہ پی کر نکل جاتا ایک نوکر ساتھ ہوا کرتا اور اسکی خوراک بھی یہی ہوتی تھی۔ اگر تو شکار مار لیتے

[illegible]

دوست کے ہمراہ

تو جنگل میں گوشت بھون کر کھاتے ورنہ واپسی عشاء کے وقت یا بعض اوقات بہت دیر سے ہوتی اور کھانا گھر آکر کھاتے۔ یہ سارا وقت انتہائی مشکل دشوار گزار بلکہ ''بے گزار' پہاڑی ڈھلوانوں پہ اترتے چڑھتے گزرتا جس کا اپنا ایک مزہ تھا۔

یاد رہے شکار مل بھی جائے نشانہ بہترین بھی ہو تو بھی ضروری نہیں کہ شکار مارا بھی جائے حیات و موت کا اپنا ایک نظام ہے جس میں بندے کی مداخلت ممکن نہیں صرف اور صرف کوشش کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔

گرمیوں میں پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور سرخ رنگے پتھروں کے ٹیلے بہت تپتے تھے مگر گرمیوں کے رمضان میں بھی کم از کم دوبار تو ضرور جایا کرتا تھا واپسی پر چشمے پر آم پھینک کر ٹھنڈے کر کے کھاتے۔ یوں افطاری کا بہت مزہ ہوتا تھا۔ مغرب کے بعد کہیں جنگل سے واپسی کا سوچا کرتے تھے۔

بہر حال جب تک ہمت جوان رہی فرصت کے لمحات شکار کرتے گزرے پرندے بھی ہمارے ہاں بہت ملتے تھے۔ سی سی' چکور' تیتر' بٹیر 'اور ایک زمانے میں تلوریں بھی ہوا کرتی تھی ہرن' اڑیال پہاڑی جانوروں میں بھیڑیا' لگڑ بگڑ اور چھوٹے قد کا پہاڑی شیر یا چیتا کہہ لیں مگر اس کا رنگ اور نقش چیتے کے، جسم اور طاقت شیر سے ملتی ہے۔ یہ سب ہمارے جنگلوں میں ملا کرتے تھے۔ اب وہ بات نہیں رہی ۔کوئلے کی کانوں اور پھر نمک کی کانوں سے جنگل آباد ہو گئے ہیں جہاں انسانی آبادی ہو جائے وہاں جنگلی حیات کا رہنا مشکل ہو جاتا ہے دوسری بہت سی وجوہات کے ساتھ ایک بڑی وجہ ہے۔

سیاحت کے رنگ

صبح ذکر اور نماز کے بعد ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر دوبئی کو چل پڑے۔ میرا خیال تھا کہ میں نے توبارہا ابو ظہبی کو دیکھا ہے بھلا نئی چیز کیا ہوگی، مگر یہاں تو ہر بار عجیب تبدیلیاں نظر آتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بادشاہت عام آدمی کو اپنی خوشیوں میں شریک رکھتی ہے سڑکیں، پل، راستے، پارک، بجلی، فون، ہسپتال اور کھانے پینے کی اشیاء غرض ایک ایک چیز خوبصورت، خالص، آرام دہ اور آسانی سے دستیاب رکھنے کی پوری پوری کوشش کی جاتی ہے، آپ ایک واقعہ سے اندازہ کر لیں کہ مجھے ایک عزیز نے بتایا چند سال پہلے انہوں نے حج کی تیاری کی۔ چھٹی آخری دنوں میں ملی۔ جدہ ایئر پورٹ بند ہونے میں صرف چوبیس گھنٹے باقی تھے کہ یہ لوگ احرام باندھ کر ایئر پورٹ پہنچے۔ سیٹیں کنفرم تھیں، دن بھر کے انتظار کے بعد فلائٹ ملی تو اسّی آدمی سوار ہونے سے رہ گئے جہاز چھوٹا تھا۔ اب مغرب ہو چکی تھی اور صبح بارہ بجے کے بعد جدہ ایئر پورٹ بند ہو جانا تھا لہٰذا بہت

پریشان ہوئے' ٹریفک مینجر سے بات ہوتی رہی' آخر گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد اس نے بتایا کہ جہاز نہیں مل سکتا۔ یہ لوگ بہت پریشان کہ احرام کیسے کھول دیں؟ چھٹی لی' روپے جمع کروا کے ٹکٹ لئے احرام باندھا' اب کیسے نہ جائیں؟

کوئی صورت بنتی نظر نہ آئی تو بس لے کر سب لوگ وزارت حج میں گئے کہ وزیر صاحب سے عرض کریں' تو وہاں بھی عید کی چھٹیاں اور مزے کی بات یہ کہ وزیر موصوف شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ بہت پریشان ہوئے تو اس بدو چوکیدار نے جو اکیلا وزارت کی عمارت کا نگران تھا' وجہ پوچھی اور سن کر کہنے لگا کہ آپ لوگوں کے جو ٹکٹ ہیں ان پر لکھا ہوا ہے کہ آپ کو لے جائیں گے؟

کہا "ہاں!"۔

تو کہنے لگا "پیسے دے کر خریدے ہیں یا ویسے ہی ملے ہیں؟"

کہا' بھئی! رقم دی ہے۔"

کہنے لگا' یہ تو پولیس کیس ہے' وزیر کا اس میں کیا کام؟ پولیس میں جاؤ!"

سب بس لے کر پولیس کے ڈیوٹی افسر کے پاس گئے جو اے ایس آئی قسم کا تھا کہ یہاں پولیس کے رینک بھی فوج کی طرح ہیں لہٰذا لیفٹیننٹ ہوتا ہے' جسے یہ ملازم "کہتے ہیں۔ اس نے ساری بات سنی اور کہا" میں اپنی جیپ پر جاتا ہوں تم لوگ گلف ایئر کا جو چیئرمین ذمہ دار ہے اسکے بنگلے پر آجاؤ!"

وہ ایک انگریز تھا جب یہ پہنچے تو وہ اس سے بات کر رہا تھا کہ ان لوگوں نے ٹکٹ خرید کر احرام باندھا' اب صبح بارہ بجے سے پہلے انہیں جدہ پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے اگر نہ کر سکو تو میری ذمہ داری ہے کہ فوج کو کہہ کر انہیں جہاز دلواؤں گا اور تمہیں مع بیوی بچوں کے جیل میں بند کر دوں گا۔ اور عید کی چھٹیوں کے بعد معاملہ قاضی کے سامنے جائے گا۔ اس نے کہا "انہیں ایئرپورٹ بھیجو!"

چنانچہ جب یہ لوگ ہوائی اڈے پر پہنچے تو کمپنی والے کہیں اور (غالباً بحرین) جانے والی فلائٹ خالی کرا چکے تھے جو انہیں لے کر جدہ گئی اور خالی واپس آکر بحرین کے مسافروں کو لے کر روانہ ہوئی۔

آپ اندازہ کریں کہ ریاست میں عام آدمی کا کتنا احترام ہے۔ یہی حال زندگی کی سب سہولتوں کا ہے حتیٰ کہ سڑکیں بھی پھولوں سے یوں لدی ہیں جیسی شاہی محل کی روشیں ہوں' بہر حال ہم دوبئی آگئے۔

دو رات قیام ہے اور پھر لندن' انشاء اللہ۔

جی! تو آپ ابھی منتظر ہیں کہ پھر کیا ہوا تو حضور ہوا یہ کہ میں تو لکھتا رہا اور جہاز میاں لندن پہنچ چکے تھے لکھنا چھوڑ' غسلخانے کی طرف لپکا کہ گزشتہ تین گھنٹے سے سیٹ سے اٹھا نہ تھا حالانکہ درمیان میں جہاز پر چائے بھی ملی۔

جنگِ عظیم دوم میں مندرہ جنکشن کی چائے مشہور تھی' ہمیں اس زمانے میں بہت کم تھیں سفر کا بڑا ذریعہ ریلوے ہی تھا اور راولپنڈی سے 20 میل پر مندرہ چکوال جنکشن تھا ہمارے علاقہ کا تقریباً سو فیصد پیشہ فوجی ملازمت کا تھا۔ لہذا مندرہ جنکشن بہت مشہور تھا اور وہاں بہت بھیڑ ہوا کرتی تھی۔ اس بھیڑ میں پلیٹ فارم پہ چائے ملا کرتی تھی۔ جس کا نیلا رنگ اور اٹھتی ہوئی بھاپ اس کے چائے ہونے کی شہادت دیتی۔ لوگ لپکتے' پیتے' ہونٹ بھی جلتے اور چند منٹوں بعد بڑے زوروں کا پیشاب بھی آتا مگر ذائقہ کوئی نہ جان سکا اور نہ کسی کو سمجھ آسکا۔ پھر یہ مزہ مدتوں بعد P.I.A. میں ملا تو سینکڑوں پرانی یادیں تازہ کر گیا۔" کرنل مطلوب صاحب ساتھ بیٹھے تھے۔

میں نے کہا۔ "مندرہ جنکشن اور جنگ عظیم دوم کا زمانہ یاد آگیا ہے۔"

وہ اگرچہ خود چائے بالکل نہیں پیتے مگر فتویٰ دے دیا" نہیں' آپ کو اتفاقاً پہلے چائے مل گئی لہذا یہ اوپر اوپر ہے نیچے سے مزیدار ہوگی۔"

چلو بھئی! اس خیال سے مان لیا کہ جو نہیں پیتے 'وہ بھی آشنا ضرور ہوتے ہیں کبھی پی کر ہی چھوڑی ہو گی۔ لہذا پھر منگوائی جو کیتلی کے نیچے تھی۔ واقعی وہ کچھ اور شے تھی کہ ٹھنڈی تھی اور کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔

اس سیلاب بلا سے گزر کر تین گھنٹے غسلخانے نہ جانا' پھر میرے جیسے بیمار اور شوگر کے مارے ہوئے بڈھے جوان کا' یہ صرف آپ حضرات کی محبت کا کرشمہ تھا۔ اور اب جو قلم رکھا تو مشکل بھاگ کر پہنچا جب اندر سے کنڈی لگائی تو ایک نغمہ سا گونجا'

"پیٹیاں باندھ لیں! سیٹیں سیدھی اور میزیں بند ہوں' سگریٹ بجھادیں کہ ہم ہیتھرو کے ہوائی اڈے پر اتر رہے ہیں۔"

غسلخانے میں کیا بیٹھی اور کونسی سیٹ' مگر بہت جلدی جلدی فارغ ہونے کا تجربہ ہوا۔ بھاگ کر ہی سیٹ پر پہنچا لڑھک کر ہی کہ لیں کہ اترتے وقت بھی جہاز کا اگلا حصہ بلند اور پچھلا نیچا ہوتا ہے اور غسلخانے سے سیٹ پیچھے کو تھی۔

ہاں! ایک بات قابل ستائش ہے کہ PIA میں نہ وہ فاشی تھی اور نہ عریانیت جس کا تجربہ برٹش ایئرویز میں ہوا تھا۔ کھانے کی بھی اگرچہ تہمت ہی لگائی مگر یہ اللہ کا شکر ہے کہ خنزیر اور شراب تو نہیں بٹتی اور فلم بھی ان کمپنیوں میں بالکل ننگی ہوتی ہے یہاں نہ صرف لوگوں کے لباس درست تھے بلکہ کہانی کا سر پیر بھی کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اور یہ خوبیاں ہمیں اس بات پر آمادہ کر گئیں کہ ممکن حد تک سفر PIA میں کیا جائے۔ بہر حال لندن پہنچ چکے تھے۔

تو حضور! کل ظہر کے بعد روانہ ہو کر نوٹنگھم گئے جو بریڈ فورڈ سے لندن کی طرف تقریباً اسّی میل ہے جبکہ یہاں سے لندن دو سو میل ہے۔ برطانیہ میں پندرہ بیس مقامات ایسے ہیں جو شہر کہلاتے ہیں باقی سب قصبے ہیں ان شہروں میں سے ایک

نوٹنگھم بھی ہے یہ ”شیر دل رچرڈ“ کا پایہ تخت تھا جب وہ مشہور صلیبی جنگوں میں حصہ لینے کے لئے مشرق وسطیٰ میں چلا گیا تو اپنے چھوٹے بھائی کو حکمران بنا گیا جس نے لوگوں پر ظلم ڈھائے تو مشہور زمانہ کردار ”رابن ہڈ“ ظاہر ہوا۔ یہ شخص شاہی خزانے کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کرتا۔ آخر کار شہزادے کو قید کر کے تقریباً نو ماہ تک حکومت کرتا رہا۔ کہ رچرڈ لوٹا تو اس کی آمد پر حکومت کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی جس نے اسے بہت سراہا اور اپنا درباری بنا لیا۔ اس شہر کے پاس تاحال مشہور جنگل باقی ہے۔ بہت بڑا شہر ہے۔

آج بریڈ فورڈ میں‘ دوستوں کے ساتھ ایک بات موضوع گفتگو رہی کہ سب ہی بوڑھے تو ہوسٹلوں میں نہ جاتے ہوں گے۔ کچھ تو گھروں میں بھی بستے ہوں گے۔ تو پتہ چلا‘ گھروں میں رہنے والوں کی تین اقسام ہیں‘ اول امراء جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہ بچوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں اور پیسے حاصل کرنے کے لئے اولاد ان کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ دوسرے وہ جو اولاد کا کام کر دیتے ہیں۔ اور ماہانہ وظیفہ پاتے ہیں۔ مثلاً کپڑے دھو کر تیار کر دیئے وغیرہ تو وہ ساتھ رہ کر بچوں کی ملازمت کرتے ہیں۔ اور تیسرے وہ جو اکیلے ہوں‘ بڈھا بڈھی ایک چھوٹا سا گھر لے کر رہتے ہیں۔ ایک مر جائے تو دوسرا خبر کرتا ہے‘ اس کی نعش دفن کرنے والا محکمہ لے جاتا ہے۔ مگر دوسرا مرے تو اس کا کتا بھوک سے مجبور ہو کر دوسرے دن شور کرتا ہے تو پولیس خبر لیتی ہے۔ یا پھر نعش کا تعفن اس کی اطلاع کا باعث بنتا ہے۔ یوں لاش تدفین کے لئے کمیٹی کہہ لیں یا میونسپلٹی والے لے جاتے ہیں اور گھر کا سامان ورثا۔

یہاں انسانوں کو ملانے والی صرف دو طاقتیں ہیں دولت یا جنس اور بس!!

صاف ستھرے شہروں‘ خوبصورت سڑکوں سجے سجائے بازاروں‘ مشہور

شہروں کی جگمگاتی روشنیوں میں یہ قابل رحم مخلوق بستی ہے حیثیت انسان سب سے ہمدردی تو ہوتی ہے مگر مسلمانوں کو اس سیلاب میں بہتے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے جن کو ڈبونے میں علماء اور پیروں کی کوششیں بھرپور کردار ادا کر رہی ہیں۔

اللہ کریم سب کو ہدایت دے' آمین۔

انسان کی تقسیم بھی عجیب ہے۔ آج ایک خاتون کا فون آیا کہ وہ ذکر الٰہی سیکھنا چاہتی ہے۔ اس کے خیالات سن کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس ظلمت کدے میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ ورنہ تو مسلمان عموماً دو طبیعتوں میں بٹ چکے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو مولویوں اور پیروں کے ہاتھوں رسومات میں پھنسے ہوئے ہیں اور پاؤنڈ دے کر خود فارغ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس سارے کھیل سے متنفر ہو کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی معاشرے کا حصہ بن رہے ہیں مگر اس بچی کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ مولوی اور پیر جو جبہ و دستار پہن کر درشن کراتے اور چپ چپ رہ کر نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ اپنی تنہائیوں میں اتنی عیش کرتے ہیں کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں۔ مگر صرف یہی کچھ نہیں' دنیا حق سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اہل حق کو تلاش کرنا اور ان سے دردِ دل اور دوائے دل حاصل کرنا بھی بہت ضروری ہے کہ اس کے بغیر عبادت بھی محض اداکاری ہی رہ جاتی ہے اور وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں۔

یہ وہ بات ہے جو بڑی محنت کر کے سمجھانی پڑتی ہے کسی خاتون کا تجزیہ بہت خوشی کا باعث بنا مگر ساتھ ایک خوف سا بھی ہے کہ غالباً اسکے میاں دینی اعتبار سے نہ صرف کمزور ہوں گے بلکہ شاید اسے بھی کام نہ کرنے دیں کہ اس طرح کے تجربے پہلے سے بہت ہیں جو خواتین کچھ کر سکتی ہیں ان کے شوہر راستے کی دیوار بن جاتے ہیں اور جو شوہر کسی قابل ہوتے ہیں ان کی بیویاں پاؤں کی زنجیر۔ بہت کم خوش

نصیب ایسے ہوتے ہیں کہ میاں بیوی دونوں میں کام کرنے کی تڑپ ہو۔ بہر حال مرد تو پھر بھی کچھ کر تا رہتا ہے مگر خواتین بہت مجبور ہوتی ہیں'

"مرد حضرات کلب جانے' بازار پھرنے اور سینما تک دیکھنے پہ خوش ہوتے ہیں مگر جب دین کی بات ہو تو کہتے ہیں کسی سے ملنا' بات کرنا اور سیکھنا شرعاً جائز نہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ اگر وہ ان کا یہ کام کر دیں تو یقیناً انہیں کسی سے ملنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔"

مگر مرد آخر مرد ہے اسے کون روک سکتا ہے۔

کل بعد عصر مانچسٹر جانا تھا۔ وہاں ایک ساتھی کے گھر پر ذکر تھا' یہاں سے روانہ ہونے میں کچھ دیر لگی۔ بریڈ فورڈ سے نکلے تو بارش نے آلیا بہت زوروں کی بارش تھی یہاں ضرب المثل ہے کہ '

Never trust the three ws,

Woman, Weather and Word in Britian,

کہ تین ڈبلیو پہ اعتبار کم از کم برطانیہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ موسم' عورت اور وعدہ۔

یہی ہوا سارا دن دھوپ تھی' شہر سے نکلے تو بارش نے آلیا۔ آگے گئے تو مطلع پھر صاف تھا۔ راستے میں باتوں باتوں میں بوڑھوں کی ایک اور قسم دریافت ہوئی جسے نہ لکھنا بہت زیادتی ہوگی۔ وہ ایسے بوڑھے جوڑے جو اولاد سے فارغ' کام کے قابل نہیں رہتے تو حکومت یا کونسل انہیں چھوٹا سا مکان مہیا کرتی ہے اور گزارے کی رقم بھی' مگر ان کی زندگی پھر بھی بہت دشوار ہوتی ہے۔

بہر حال مانچسٹر پہنچے تو پتہ چلا صبح بارش ہوئی تھی' دن بھر دھوپ رہی' آخر برطانیہ کے موسم ہیں ان کا مزاج بھی شاہانہ ہوگا۔

مزیدار سی خنکی تھی' اور شام بہت سہانی تھی مگر یہاں سر شام، ویرانیاں ڈیرہ جما لیتی ہیں ہر کوئی اپنے ڈربے میں گھس جاتا ہے کہ زندگی محفوظ نہیں رہتی' اگرچہ پولیس بھی چپے چپے پر پھرتی ہے مگر امن نہیں کوئی بے فکر ہو کر گھوم نہیں سکتا' بس بازار بند 'لوگ غائب' ہم مانچسٹر کے بازار سے گزرے تو دوست بتا رہے تھے کہ دن کو اسے عبور کرنے میں کم از کم دو گھنٹے لگتے ہیں۔

یہاں کپڑے کی بہت بڑی صنعت ہے۔ اسی لیے فیصل آباد کو "پاکستان کا مانچسٹر" کہا جاتا ہے۔ یہاں کی سات ایم کی رانفل بھی دنیا کی بہترین رانفل ہے۔ بہت بڑا شہر اور وہی بلند بالا عمارتیں کھلی سڑکیں اور روشن راہیں' جو بھیگی شام کو ویران کر رہی تھیں بس پورے شہر میں چند جوڑے نظر آئے جو تیزی سے کسی سمت جا رہے تھے۔

گھر پہنچے' مغرب ادا کی۔ مقامی ساتھی بھی چھ یا سات ہوں گے اتنے ہم بھی تھے' مل کر ذکر کیا' کھانا کھایا اور عشاء پڑھنے لگے کہ واپس پہنچنا تھا۔ نماز سے فارغ ہوئے تو کچھ لوگ ملنے آ گئے جنہیں مسجد میں ہمارے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ گھنٹہ بھر محفل رہی۔

پہلا سوال رشدی کے بارے تھا جس کے متعلق وہ میری رائے کے طالب تھے عرض کیا' کہ میرے خیال میں تو اسکی خرافات کا جواب ان مستشرقین کی تصانیف سے جنہوں نے اسلام اور آپ ﷺ کی ذات گرامی کے بارے میں محققانہ رائے دی ہے دیا جانا چاہئے تھا کہ یہ طریقہ جو لوگوں نے اپنا لیا ہے مناسب نہ تھا۔ اس سے نہ صرف اس کو شہرت اور دولت ہاتھ آئی بلکہ برطانوی لوگوں اور عالمی کفر کی ہمدردی بھی لے گیا' کتاب لوگوں نے خواہ مخواہ پڑھی اور مسلمانوں کی اپنی نئی نسل ڈگمگا رہی ہے کہ کیا واقعی اس کا کوئی جواب نہیں؟ دوسری طرف یہ مراد ہوا کہ اس نے نعوذ

باللہ ٹھیک لکھا ہے اب بھی یہ طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیے۔

رہی یہ بات کہ ۲۷ مئی کو لندن میں مسلمانوں نے مظاہرے کا پروگرام بنایا ہے 'تو اب چونکہ اعلان کر چکے ہیں لہٰذا اسے کامیاب بناؤ! ورنہ مسلمانوں کی کمزوری ثابت ہو گی۔ اس آگ کو بھڑکانے میں جہاں علماء کی سادگی تھی وہاں خمینی صاحب کی عیاری نے زیادہ کام کیا کہ جو کچھ انہوں نے "کشف الاسرار" اور "ولایت فقیہہ" میں لکھا ہے رشدی تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ مگر اس کے قتل کا فتویٰ دے کر سیاسی فوائد حاصل کر لئے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو بغیر اعلان اسے قتل کروا سکتے تھے۔

ایک مسئلہ ان کا یہ تھا کہ ایک معروف پیر صاحب نے جو عالم بھی ہیں فتویٰ دیا ہے کہ برطانیہ "دارالحرب" ہے یہاں شراب کا کاروبار جائز ہے 'لاحول ولا قوۃ الا باللہ' یہ سب پیٹ کے دھندے ہیں۔ بھئی 'دارالحرب ہے تو تم دارالاسلام میں چلے جاؤ! کیوں یہاں بیٹھے ہو؟ اور اگر یہاں ہو تو خود کو مسلمان ثابت کر دو کہ ان لوگوں کو بھی اسلام سے رغبت پیدا ہو' پیر کو چندہ دیتے رہو مگر شراب کو حلال مت جانو کہ حرام شرعی کو حلال سمجھنا کفر ہے اور حرام سمجھ کر مرتکب ہونا گناہ ہے۔

ہزار خرابیوں کے باوجود' ان ممالک کی حکومتیں صرف ٹیکس جمع ہی نہیں کرتیں عوام کو لوٹا کر بھی دیتی ہیں مثلاً بجلی یا پانی کے نہ ملنے یا لوڈشیڈنگ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ خاتون حاملہ ہو تو اسے مراعات ملنا شروع ہوتی ہیں اور بچے کی پیدائش' بچپن کی غذا' دوا' تعلیم اور بالغ ہونے تک الاؤنس ملتے ہیں۔ اگر بالغ ہو کر روزگار حاصل نہ کر سکے تو بے روزگاری الاؤنس پاتا ہے یہ بھی ایک سبب ہے کہ والدین اور اولاد کے رشتے کا تقدس ایک تجارت یا پیشہ بن چکا ہے اور وہ محبت جو اس کا خاصہ تھی' کھو بیٹھا ہے۔ بایں ہمہ یہاں کچھ لوگ وضعداری کے حامل ضرور ہیں' مثلاً ایک

خاتون جواب ذکر کرنے لگی ہے پہلے عیسائی تھی بتا رہی تھی کہ میرا لڑکا ہے اس کے بعد خاوند سے علیحدگی ہو گئی مگر میں نے اس کی خاطر پھر شادی نہیں کی 'بڑی محنت سے پالا پوسا۔ اب بالغ ہوا تو چھوڑ کر چلا گیا اور میں اسے روک نہیں سکتی۔ صرف ایک حسرت ہے جس نے میرے دکھوں کے احساس میں گہرائی پیدا کر دی ہے اسلئے کہ یہاں کی تعلیم کی دو خصوصیات ہیں' اول بچوں کو جوڑا جوڑا کر دیا جاتا ہے' دوم والدین سے بھی آزادی کا سبق دیا جاتا ہے اگر چہ سکول میں شکایت کرے کہ مجھے والدین نے جھڑکا ہے یا سزا دی ہے تو وہ پولیس کو اطلاع کرتے ہیں اور بعض والدین کو جیل جانا پڑتا ہے یا ان سے بچے لے لئے جاتے ہیں۔ اس کا اثر بچوں میں جدید تعلیمی کمالات کے ساتھ اخلاقیات کی تباہی پہ منتج ہوتا ہے۔

میرے پاس ییلو پیجز ڈائریکٹری (Yellow Pages Directory) میز پر پڑی ہے یہ اگر چہ بنگلہ دیش' ہندوستان اور پاکستان کے لئے ہے مگر اس میں امریکہ کے مختلف حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۶۴ پر تیرہ سے انیس برس کے عمر کے بچے اور بچیوں کی اخلاقی صورت بتائی گئی ہے۔ جو ۱۹۸۰ء کے مطابق یہ ہے کہ بہتر فیصد جنسی بے راہ روی میں مبتلاء پائے گئے۔ اب ۱۹۹۰ء کی آمد آمد ہے اور یہ دس سال بہت تیزی سے ترقی کرنے کے ہیں۔ اب صورتحال کیا ہوگی؟ اندازہ کرلیں۔ اگلے صفحہ پر بزرگوں کی حالت بتائی گئی ہے کہ بہت امیر لوگ والدین کو نرس مہیا کر دیتے ہیں' متوسط بوڑھوں کے ہوسٹل میں بھیج دیتے ہیں اور نچلے طبقے کے لوگ ان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

کم سنی میں اخلاقی بے راہروی کے نتیجہ میں حاملہ ہونے والی بچیوں کی تعداد دس لاکھ سالانہ بتائی جاتی ہے جس میں سے چھ لاکھ بچے پیدا کرتی ہیں اور چار لاکھ ضائع کرا دیتی ہیں۔ یہ بھی دس سال پرانی خبر ہے۔ یہاں بغیر باپ کے لوگوں کو گلیوں

کا ثمر (From Street) کہا جاتا ہے۔ چوری راہزنی اور قتل سے کسی وقت کوئی محفوظ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومت کے کارندے بھی رات دن دوڑ دھوپ میں لگے رہتے ہیں جیسے اب اپنے لوگوں کو چین سے نکالنے کے لئے حکومت پوری طرح کوشاں ہے۔

اب ہم اپنی حالت پہ نگاہ کریں تو یہ بے عملی کس بات کی غمازی کرتی ہے اور ہم نہ صرف عمل سے محروم ہوتے جارہے ہیں بلکہ الٹا کفار کی ادائیں اپناتے چلے جاتے ہیں جو ہماری محرومیوں کی دردناک صورت حال کا پتہ دیتی ہیں اگر یہ صورت حال رہی تو ہم شاید خیر اُمۃ نہ کہلا سکیں اور دوسرے لفظوں میں اس کمال سے دوری دراصل اسلام ہی سے دوری کا نام ہے۔ اس لئے ہمیں خلوص سے توبہ کر کے اپنے اس مقام پر مضبوطی سے قدم جمانا ہوں گے اسکے لئے ضروری ہے کہ ہر مسلمان اپنا جائزہ لے کر اپنی اصلاح کی فکر کرے اور دوسروں پر فتوئ بازی اور طعن و تشنیع سے اجتناب کیا جائے۔ بلکہ درد دل کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش جاری رکھی جائے۔

دہلی کے آخری ایام میں قلعہ کے اندر ہی تک شاہی اختیار سمٹ چکا تھا اور وہ بھی بادشاہ کی پھوپھی نے چھین رکھا تھا۔ خود پس پردہ دربار کرتی تھیں اور بہت سخت خاتون تھی۔ اس نے ایک رسم شروع کر دی "بی بی کی صحنک" روٹی کو گھی اور شکر میں گوندھ کر لوگوں میں بانٹا جاتا اور یہی شرط اسلام بن گیا تھا۔ امراء میں اور پھر عوام میں یہ رسم طاعون کی طرح پھیل گئی تو شاہ اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے ایک جمعہ کے خطبہ میں اسکے رد میں نہایت مدلل تقریر فرمائی۔ لوگوں نے بادشاہ بیگم کو خبر کی کہ یہ مولوی وہابی ہے اور "بی بی کی صحنک" سے منع کرتا ہے کچھ اپنے پاس سے لگا کر بتائیں۔ انہوں نے طلبی کر لی۔ دوسرے دن دربار میں پیش کیے گئے ملکہ

نے بر ہی سے پوچھا۔

"سنا ہے، تم بی بی کی صحنک سے منع کرتے ہو۔"

فرمایا "ہرگز نہیں، آپ کو غلط خبر دی گئی ہے۔"

اب خبر دینے والوں نے شور مچایا کہ جمعہ کی تقریر میں آپ نے ایسا کہا تھا، تو فرمایا،

"اچھا! وہ بات، بھئی! وہ میری ہرگز نہ تھی میں تو محض ایک خادم ہوں۔ بی بی جی کے والد ماجدؐ کے ارشادات سنا رہا تھا، اگر وہ منع کریں تو کر بھی سکتے ہیں، میری یہ مجال نہیں۔"

ملکہ نے کہا "پھر وہ ارشادات ہمیں بھی سناؤ!"

اور سن کر حسنایہ خرافات بند کرا دی۔

ایک معقول طریقہ کار نے کتنا بڑا کام کیا حالانکہ محض شہرت حاصل کرنے کے لئے تو سخت باتیں کر کے جیل بھی جا سکتے تھے مگر مقصد اصلاح کرنا تھا۔

O-------O-------O

یکم جون، نیویارک

مضمون ادھورا چھوڑ دیا تھا، اسلئے کہ میں تھک چکا تھا اور سر درد کرنے لگا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ کھانا بھی کھانا تھا جو جہاز میں تقسیم ہونے لگا مگر ہمارے ساتھ لندن کے دوستوں نے گھر سے پکا کر دے دیا تھا لہذا تہذیب مغرب کے حلال سے بچ ہی گئے یہ تو امریکن کمپنی تھی۔

خود لندن کے مسلمان جو سب سے بہتر حلال کرتے ہیں اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ کنویں کی مال کی طرح سے ایک زنجیر اوپر سے نیچے کو اتر رہی ہوتی ہے اوپر مرغا لٹکانے والے کھڑے ہوتے ہیں جو ایک ایک مرغ کی ٹانگیں اسکے کنڈوں میں پھنساتے جاتے ہیں اور یوں کنویں کے لوٹوں کی جگہ مرغ الٹے لٹکے آرہے ہوتے ہیں نیچے ذبح کرنے والا آدمی کھڑا ہوتا ہے جس کے سامنے سے مرغ گزرتے ہیں تو وہ فوراً چھری پھیرتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ مشین تو رکتی نہیں لہذا وہ جلدی جلدی بس ایک ہی بار چھری چلاتا جاتا ہے اور تڑپتے پھڑکتے مرغ زنجیر میں بندھے گرم پانی کے ٹب میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہاں سے نکلتے ہی دوسری مشین لے جاتی ہے جو کھال کھینچ کر پیٹ بھی صاف کر کے سٹور روم میں پہنچاتی چلی جاتی ہے اور خالی کنڈے نئے

مرغوں کو لینے چلے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کس کے حصے میں کتنی تکبیریں آتی ہے اور رگیں بھی کٹتی ہیں یا کوئی رہ جاتی ہے۔ نیز خون کے مکمل اخراج کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو ذبح کا اصل مقصد ہے آگے اندازہ خود کر لیجئے!

یا پھر مسلمان "کوشر" کھالیتے ہیں جو یہود کا ذبح ہے اور حلال جان کر کھاتے ہیں پتہ کرنے پر ظاہر ہوا کہ یہودی تو سبزی 'آٹا' دودھ' روٹی ہانڈی وغیرہ سب کچھ "کوشر" کرتے ہیں جس کا طریقہ یہ ہے کہ چیز بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ دودھ دوھ کر یا کھانا بنا کر یا مرغ کاٹ کر یا جانور کاٹ کر اور پھر ان کا ربی یعنی "پیر" آتا ہے اور ہر چیز کو چھڑی سے مس کرتا جاتا ہے ساتھ عبرانی میں کچھ پڑھتا جاتا ہے غالباً بسم اللہ ہی کا متبادل ہوتا ہوگا اور وہ ہر چیز کو شر یعنی حلال ہو جاتی ہے یہ حلال بہت عام استعمال ہوتا ہے مگر ذرا دوسرے درجے کا ہے اور اس سے آگے تو بقول ایک خالصہ کے "بھائی جی! موجاں" سب کچھ ہی ایک طرح کا ہوتا ہے۔ اگر گوشت مرغ کا ہو تو پکانے میں خنزیر کی چربی استعمال کریں گے اور سب کچھ پکانے اور کھانے کے برتن بھی ایک ہی ہیں اور گورے کالے ہاتھ بھی ایک جیسے' لہذا جہاز میں نہ کھانا ہی عافیت ہے یا پھر ساتھ کچھ رکھ لیا جائے یہ مسلمان ہوائی کمپنیوں کے علاوہ تو از حد ضروری ہے۔

اپنی ہوائی کمپنیاں کیا کرتی ہیں؟ تو گوشت تو وہ بھی درآمد شدہ ہی استعمال کرتی ہیں سوائے PIA کے خدا جانے' PIA والے کیسے ذبح کرتے ہیں' کبھی کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے آدمی چاول وغیرہ یا مچھلی تو مسلمان ہوائی کمپنیوں میں کھا ہی سکتا ہے مگر غیر مسلم کمپنیوں کا حال عجب ہے۔ دراصل مغرب کا اصلی مرض یہودی ہے جس نے ہوشیاری سے اقتصادی ڈھانچہ ایسا ترتیب دیا ہے کہ روپیہ سب سے نکل کر اس کی جیب میں گرتا رہتا ہے اور ان لوگوں کو شراب اور خنزیر کا عادی

کر کے ان کے اخلاق کا جنازہ نکال دیا ہے۔ سب کچھ بِکتا ہے مگر کھاتا نہیں بلکہ اپنا حلال جسے وہ کوشر کہتا ہے استعمال کرتا ہے اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مغرب پر اسقدر چھا چکا ہے کہ یہ لوگ اس ڈاکو کو اپنا نجات دہندہ سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ اس معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے جو نشے میں مدہوش اس کے اشارے پر ناچ رہا ہے۔

ڈزنی لینڈ

ڈزنی لینڈ دیکھنے گئے' جو دراصل ایک پرانا محل ہے' جہاں یہ تفریح گاہ بنائی گئی ہے۔ ڈزنی لینڈ میں بنانے والے نے کوشش کی ہے کہ بہت خوبصورت تفریح گاہ بنے۔

اندرون ملک شاداب وادیوں میں گھرا ہوا ایک قدیم محل جو سارا پتھروں سے بنا ہوا ہے اور انگلستان کے محلات کا مخصوص طرز تعمیر یہاں بھی نمایاں ہے گرداگرد باغ جھیل اور خوبصورت مناظر ہیں جن میں رنگارنگ تفریحی سامان لگا دیا گیا ہے خوبصورت کشتیوں اور بچوں کے بے شمار قسم کے مشاغل بجلی کی موٹروں اور جھولوں کے ساتھ کھانے پینے اور کھلونوں کی دکانیں ہیں۔

جب ہم پہنچے' تقریباً ڈیڑھ بج رہا تھا اور تین کار پارک بھر چکے تھے۔ چوتھے میں ہمیں جگہ ملی۔ پچاس گاڑیاں ایک رو میں تھیں اور ہماری باری چوبیسویں رو میں آئی۔ اندازاً تیس روہن سکتی تھیں۔ اس طرح کاروں کی اوسط چھ ہزار بنتی ہے اور ہزار کے قریب بڑی بسیں بھی کھڑی تھیں۔ اس قدر بھیڑ شاید دیگر ایام میں تو ممکن نہ ہو مگر چھٹی کے دنوں میں اوسط یہی ہے کم و بیش بیس ہزار مرد خواتین تو ہوں گے

جن میں خال خال بچے اور اکا دکا عمر رسیدہ تھے سب جوان لڑکے لڑکیاں ہی تھیں۔ لباس نام ہی کے تھے چھوٹی سی جنگیا اور انگیا یا ہلکی بنیان' اور جوانوں کا لباس ایک مختصر جانگیا تھا۔

زمین کے خوبصورت قطعات پر انسان کی غیرت ابلیس کے پاؤں تلے تھی' اور تہذیب مغرب کی بد تہذیبیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر کوئی ایک ہی رنگ میں مست تھا اور کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ مگر ایک بات ضرور ہے کہ اپنی تمام تر بے حجابیوں کے باوجود ابھی امریکی معاشرے سے یہ لوگ پیچھے ہیں۔ وہ اس ذلت میں بہت آگے نکل چکے ہیں۔

ہم نے بھی ساری سیر گاہ کا ایک چکر لگایا اور واپس روانہ ہوئے۔ کار پارک سے سیر گاہ تک تو نئی قسم کی ریل کار کا سفر تھا۔ پھر بھی ہم چار بجے کار کے پاس پہنچے کھانا نکالا وہیں پارک میں کھانا کھایا ظہر ادا کی اور واپس چلے۔ عصر گھر پہنچ کر ادا کی اور بہت سی تھکاوٹ ساتھ لائے' ذہن اور ضمیر بھی تھک چکا تھا اور بدن بھی چور چور ہو رہا تھا۔

دراصل ان لوگوں کا مقصد حیات ہی آزاد سیر گاہیں بن چکی ہیں اور یہ اسی لئے پس انداز کرتے ہیں جو زیادہ بچالیتا ہے وہ کسی دوسرے ملک چلا جاتا ہے۔ ورنہ ملک کے اندر ایک دن مل جائے یا زیادہ' بڑے پر جوش انداز میں چھٹی منا کر خوش ہوتے ہیں' سیر کرتے ہیں کھاتے ہیں اور غم زمانہ کو خود سے دور رکھنے کے مختلف حیلے بھر پور طریقے سے کرتے ہیں اگر متعہ عبادت ہے تو یہ سارے اول درجے کے مقبول بندے کہے جاسکتے ہیں۔ یہ حال مقامی لوگوں کا ہے۔

حرف لکھے خیال لکھے ہیں!!

ملک محمد اکرم اعوان! نے خیال کو حرف اور حرف کو صبح یقین کی طرح مجسم کر دیا ہے انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑے انوکھے انداز میں بات کی ہے! راہ سلوک کا بیان ہو' یا تصوف کے اجالے کا ذکر ہو' زندگی کی بات ہو یا حیات بعد الموت کی فکر ہو' روح لطیف کا قصہ ہو' یا جسم کثیف کا تذکرہ' ہر ایک موضوع پر انہوں نے واضح اور ٹھوس انداز میں بات کی ہے' ایسے کہ سننے اور پڑھنے والا' اپنی ذہنی سطح کے مطابق نہ صرف سمجھ جاتا ہے بلکہ متفق بھی ہو جاتا ہے' یہی ایک اچھی اور مکمل تحریر کا کمال ہے۔ چھ عدد شاعری کی کتابیں' تین عدد سفر نامے' اور ''اسرار التنزیل'' کے نام سے کلام پاک کی تفسیر اک ایسا کام ہے جس کا اتنی مصروف زندگی میں ہو جانا ہی جائے خود ایک کارنامے سے کم نہیں! اس پر مستزاد یہ کہ یہ تمام تصانیف مصنف کی بھرپور توجہ کی پوری پوری عکاسی کرتی ہیں۔ کوئی کام بھی جلدی میں کیا ہوا نہیں لگتا۔

تصانیف کے باب میں ان کی شاعری کا مختصر تعارف' معہ چند اچھے اشعار سفر ناموں سے چند مختصر گوشے اور آراء۔

دیار حبیب میں چند روز

مقال خیال

محبت کی ایک مجبوری ہے کہ زبان نہیں رکھتی اور دل کی یہ خواہش کہ حاشیہ خیال میں گلہائے گفتار سجائے-----واردات و احساسات کی ترجمانی کا حق الفاظ میں کس طرح ادا ہو' ظلال معانی ان آبگینوں میں کیسے جھلک جائیں :

ہر آن معنی کہ شداز ذوق پیدا
کجا تعبیر لفظی یا بد اُو را

یہ سب درست لیکن خلوص دل اور محبت خود ایسی دولت ہے کہ جس کا دل اس کے جلوؤں سے رنگین اور جس کی فطرت اس کے انوار سے مزین ہو' اسکے الفاظ سحر جلال کا کام کرتے ہیں'----- مختصر بلکہ ادھورے بیانات بھی بڑے بڑے مقالات کا کام کر جاتے ہیں محبت کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب ہیں :

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بس کیں آتش از گفتار خیزد

مجرد سماع سے ہی اللہ چاہے تو روح کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہی منظر وہی

احساسات وہی واردات دل میں سما جاتے ہیں'

صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسے فیضان صحبت اور انعکاس نسبت کہتے ہیں

حضرت مولانا محمد اکرم مدظلہ العالی' جن کی رشحات فکر زیب اشاعت ہیں نہ تو کوئی پیشہ ور ادیب ہیں اور نہ ہی باقاعدہ انشاء پرداز' اللہ کی رحمت بے پایاں اور اس کی کرم نوازی کہ دل درد آشنا و چشم بیدار رکھتے ہیں' اللہ کریم نے وہ درد اور وہ بصیرت عطا کر رکھی ہے کہ جن لوگوں کو فیضان صحبت نصیب ہوا ہے بس وہی کچھ اسکا اندازہ کر سکتے ہیں۔

من ذاق ذاق و من وجد وجد:

ذوق ایں مے نشناسی خدا تانہ چشی

دیار حبیب ﷺ (حرمین شریفین) کی زیارت اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمتوں میں سے ہے' پھر اس سعادت کے انوار برکات سے قلب و روح کی تشنگی بجھانا' اور لذت مشاہدات سے سرفراز ہونا' نور علیٰ نور ہے'

ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

تحریر کا کمال یہ ہے کہ بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جیسے پڑھنے والا بھی اس سفر میں مصنف کے ہم رکاب ہے اور اسکی روح بھی اس اہتزاز میں مست و سرشار ہے کہ جس سے حضرت مصنف کو بہرہ وافر ملا ہے۔

شیخ کامل کی توجہ کی سی صورت ہے کہ ادھر زبان فیض ترجمان سے کوئی لفظ نکلا اور ادھر سالک کی روح ان مقامات کی سیر سے سرفراز ہوئی۔ بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم عہد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوۃ والسلام میں پہنچ گئے ہیں ہم ان واقعات کے صرف شاہد ہی نہیں بلکہ ان میں شامل ہیں' زمان و مکان کی وسعتیں گوشہ دل میں کہیں سمٹ آئی ہیں۔

غزوات بدر و احد' ہجرت مدینہ' فتح مکہ' خلوت حرا' اسرار غار ثور' خطبہ حجۃ الوداع سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں' دور خلافت راشدہ نگاہوں میں پھر جاتا ہے'-----جب مطالعہ سے فارغ ہوتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتے ہیں:

اینکہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے قارئین کرام کو بھی اس نعمت سے نوازے:

دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے

اللھم ارزقنا زیادة الحرمین الشریفین بحرمته النبی الکریم علیه وعلیٰ اله و اصحابه التسلیم

ابوالحسن نقوی

غبارِ راہ پہ تبصرہ

مصنف کو دنیا ایک کامل صوفی کی حیثیت میں پہچانتی ہے اور بحیثیت مصنف بھی وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔اب وہ ایک غیر معمولی سیاح کی حیثیت میں سامنے آئے ہیں ان کی تحریر ''غبار راہ'' سفر نامہ بھی ہے۔مختلف تہذیبوں کا مطالعہ بھی ہے اور وہ لا فانی پیغام بھی پہلو میں لئے ہوئے ہے جو قوموں کو بناتا اور سنوارتا ہے۔باطل تہذیبوں کو مٹاتا ہے۔اور پاکیزہ معاشرے اور تہذیب کی تشکیل کر کے پروان چڑھاتا ہے۔

انہوں نے نگری نگری اور دیس دیس کی سیاحت کی ہے۔محض سیر کی خاطر نہیں' ایک مقصد' ایک مشن لے کر۔مختلف ممالک اور علاقوں کے قدرتی نظارے دیکھے ہیں تو ان کی تہذیب و تمدن کو بھی دیکھا ہے۔لوگوں کو دیکھا ہے تو ان کے دلوں کی گہرائیوں میں جھانک کر بھی دیکھا ہے۔

''غبارہ راہ'' کے مصنف کو اللہ نے ایسی نگاہ بخشی ہے کہ ان کی اس تحریر میں نظاروں کا حسن بھی ہے تو ان ہی نظاروں میں رہنے والے انسانوں کے شکستہ دلوں کا حال بھی ہے۔سیاح تو عموماً انسان کی بنائی ہوئی شاہکار عمارتوں کو دیکھتے ہیں۔پارکوں

اور تفریح گاہوں کو دیکھتے ہیں۔ سڑکوں اور قدرتی مناظر کو دیکھتے ہیں۔ لوگوں کی ظاہری خوشحالی یا بدحالی کو دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن قوموں کی تہذیب او ان کے قلوب کی سیاحت کرنا ایک بالکل نیا اور منفرد تجربہ ہے۔ مغرب کی عریانی دیکھ کر مصنف نفرت کا اظہار نہیں کرتا (وہ تو سب ہی کر لیتے ہیں) بلکہ اپنی سوچ کے مختلف انداز کو یوں بیان کرتا ہے ۔" یہ نوجوان لڑکیاں جو ننگی پھر رہی ہیں۔ جن کو دیکھ کر آپ خوش ہوتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ میری اور آپ کی بیٹیاں ہیں۔ ان تک اللہ کا' اور اللہ کے رسول کا پیغام پہنچانے کے ہم مکلف ہیں۔ ہم ان کے ننگے بدن دیکھنے کے مکلف نہیں ہیں۔ ہم ان کے بدن ڈھانپنے کے مکلف ہیں۔ ہم سے یہ حساب ہوگا ہم سے یہ پوچھا جائے گا کہ ان ننگے جسموں کو ڈھانپنے کے لئے ہم نے کیا محنت کی ہے۔ جن کو دیکھ کر تم کہتے ہو۔ یہ انگریز کی بیٹی ہے۔ یہ امریکن کی بیٹی ہے۔ یہ سویڈش کی بیٹی ہے۔ یہ ناروے کی لڑکی ہے۔ میں انہیں آدم علیہ السلام کی بیٹیاں سمجھتا ہوں۔ میں انہیں محمد رسول اللہ ﷺ کی امت دعوت تسلیم کرتا ہوں۔ کیونکہ ان سب کی طرف حضورؐ مبعوث ہوئے ہیں۔ میں اور آپ ان کے برہنہ جسم دیکھ کر انجوائے کریں گے تو انہیں اللہ کا پیغام کون پہنچائے گا۔ کافر اور مسلمان میں فرق کیا ہوا"۔

ہم مغرب کی سوچ کو اپنے پاکستانی معیار پر تولتے ہیں۔ خود کو ان کے سامنے چھوٹا محسوس کرتے ہیں اس لئے ان سے نفرت کرتے ہیں اور اس نفرت کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن مصنف اس سوچ کے قائل نہیں۔ ان کی فکر کا معیار' تمام معیاروں سے بہت ہی بلند ہے۔ پاکستان ہو یا اقوام مغرب' سب کو ایک جج کی طرح تولتے ہیں اور پھر ایک تجربہ کار معالج کی طرح علاج تجویز کرتے ہیں۔ اس کا اظہار یوں کیا ہے۔" آپ کہتے ہیں مغربی اقوام مسلمانوں کی عزت نہیں کرتے۔ میں یہ

عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلمان کی اپنے گھر میں کوئی عزت نہیں ہے۔ اگر مسلمان کی امریکن عزت نہیں کرتے تو مسلمان کی پاکستان میں کیا عزت ہے .... شاید اس لئے کہ ہم اس پائے کے مسلمان رہے ہی نہیں جس پائے کا مسلمان عزت کا مستحق ہوتا ہے"۔ یہ جو ہم دوسری اقوام کے مقابلے میں کمتری کا شکار ہیں تو کیوں؟ مصنف نے اس کا علاج یوں تجویز کیا ہے۔ "ہمیں اپنا تعارف تلاش کرنا ہے۔ کہ ہم کون ہیں؟ اپنے آپ کو پرکھنا ہے۔ اپنے متعلق صحیح رائے قائم کرنا ہے۔ کہ ہمیں کہاں ہونا چاہئے اور ہم کس جگہ کھڑے ہیں۔"

کسی نے سوال کیا کہ اگر آپ نے مغرب کی بے حیائی میں حصہ نہیں لینا ہے تو اسے دیکھنے کیوں جاتے ہو؟۔ جواب میں لکھتے ہیں "ہم دیکھنے نہیں جاتے۔ ہم اس کا مقابلہ کرنے جاتے ہیں۔ اور الحمد اللہ! یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہم نے ایک مہینے میں چودہ ممالک میں ذاکرین کی جماعتیں پیدا کی ہیں۔ اور یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہر ملک میں غیر مسلموں کو مسلمان بھی کیا ہے۔"

اس غیر معمولی سیاح کی سیاحت صرف مغربی ممالک پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اپنے ہی دیس کے ان علاقوں کی سیاحت بھی شامل ہے۔ جہاں تک اسی ملک کے شہری پہنچ ہی نہیں پاتے ہیں۔ اگر کوئی سیاح پہنچا ہے تو وہ صحیح عکاسی نہیں کر پایا ہے۔ جہاں کے متعلق پاکستان کے لوگ صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ اونچے اونچے برفانی پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور بس۔ "دیس اندر پردیس" ملک کے اس حصے کی عکاسی ہے۔ جہاں کے بسنے والے انسان ہمارے لئے اجنبی اور پردیسی ہیں۔

"شیروں کی کچھار" اس علاقے کی سیاحت ہے۔ جسے ہم علاقہ غیر کہتے ہیں۔ اور ڈاکوؤں اور قاتلوں کی پناہ گاہ سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ ہم سے بہتر اور کھرے مسلمان ہیں۔ اور برصغیر میں اسلام پھیلانے میں ان کا کتنا بڑا کردار

ہے۔ کیونکہ کسی مسلمان سیاح نے وہاں جانے کی جرأت ہی نہیں کی۔ اس لئے اب تک ہم نے ان غیور مسلمانوں کے ماضی کو اور نہ حال کو جانا ہے۔ انگریز نے ان کا جو تصور ہمارے ذہنوں میں ڈال دیا ہے ہم اسی کو سچ سمجھ کر سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔ لیکن مصنف شیروں کے اس کچھار میں گھسنے سے بھی باز نہ آئے۔ وہاں کے پہاڑوں کی سختی اور وادیوں کی خوبصورتی کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی لائے کہ وہ بھی ہم ہی ہیں کوئی غیر نہیں۔

بنگلہ دیش جو کبھی پاکستان تھا۔ اب کیا ہے؟ کس حال میں ہے؟ ہم نے ان کو بھلا دیا جو کبھی ہمارے بھائی تھے۔ جو ہم خود تھے۔ ہم سب مسلمان تھے۔ مگر اب وہ کون ہیں؟ کس حال میں ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہاں کا ہر چہرہ ایک سوال ہے جواب کون دے گا؟ یوں تو ہر تہذیب ایک سوال ہے۔ مغرب ہو یا مشرق کوئی شخص جواب دینا ہی نہیں چاہتا یا شاید کسی کو جواب معلوم ہی نہیں لیکن جواب تو موجود ہے۔ اسی تحریر میں قدم قدم پر آپ کو وہ جواب ملے گا۔ اسی جواب کو لے کر دنیا کے گوشے گوشے تک ہر تہذیب اور ہر فرد تک پہنچانے کے لئے ہی تو مصنف نے صحرا نوردی اختیار کی ہے۔

اس کتاب میں چند صفحات پر مشتمل سفر نامے بھی ہیں۔ اور "ابھرتے ڈوبتے سورج" کا طویل سفر نامہ بھی انداز بیاں کو نہ صرف دلچسپ بلکہ ادب کا ایک حسین شاہکار کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

تاج رحیم

امریکہ ایک بار پھر!!

"امریکہ ایک بار پھر" غبار راہ کا دوسرا حصہ ہے۔ پہلے حصے میں بھی امریکہ کا تذکرہ تھا لیکن یہ تمام تر سفر امریکہ ہی کے بارے میں ہے۔ ہمارے یہاں لوگ امریکہ جاتے ہیں تو مشرقی حصے یعنی نیویارک واشنگٹن دیکھ کر آجاتے ہیں یا پھر سان فرانسسکو وغیرہ۔ جنوب میں نیو میکسیکو تک کم ہی پاکستانی جاتے ہیں آخر ان ریڈ انڈین کے مسکنوں تک پہنچنے کے لئے جہاں سیاہ رنگ کے عقاب پہاڑوں پر مسکن بنائے ہوئے ہیں' اقبال کے بقول شاہین کا جگر چاہئے چیتے کا تجسس یہ وہ علاقے ہیں جہاں سب سے پہلے مسلمان آکر آباد ہوئے اور جہاں ان کے قیام کی گواہی ان کے شہروں کے نام آج بھی دے رہے ہیں۔ یہاں ان کی حکومتیں بھی رہیں۔ کہ شہروں کے نام افراد کی وجہ سے نہیں حکومتوں کی وجہ سے رکھے جاتے ہیں۔ ان سے شروع ہونے والے بے شمار نام امریکی تاریخ کا چہرہ مسخ کئے جانے کے باوجود مٹائے نہیں جا سکے۔

یہ سفر نامہ انسانی احساسات و جذبات کی قوس و قزح ہے۔ یہاں آپ کو انسانیت کے ساتھ وہ پیار بھی ملے گا۔ جو مصنف کو ساڑھے چھ ہزار میل کی مسافت

تقریریں ذکر اذکار کے پروگرام کو صرف پندرہ دن کی تھکا دینے والی مشقت کو آسان کر سکتا تھا۔ اور دوسری طرف ہزاروں میل دور پالتو ہرن کی موت پر چھلکے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ زندگی اور موت ہجر و وصال کی تمام ترکیفیات پر محیط بھی ہے۔

ان صفحات میں جہاں امت مسلمہ کو اس کا کھویا ہوا سبق یاد دلانے اور دلوں کی بھٹیاں از سر نو گرم کرنے کی روداد ہے۔ وہاں اس کے لئے عملی کوششوں کی ایک جھلک بھی ملتی ہے۔ اس سفرنامہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف سخت کوشی ہے نہ کہ آرام طلبی کا نام۔ مغرب کے گمراہ مستشرقوں کی کہی ہوئی باتوں کو دہرانے والے تصور کی حقیقت سے کس حد تک بے خبر ہیں۔ قصور ان کا بھی نہیں کہ انہیں تو جن نام نہاد نمائندوں سے واسطہ پڑا وہ تعیش کی زندگی گزارنے کے عادی تھے جس کا تذکرہ اس کتاب میں بھی ہے۔

— زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

امریکہ "نئے عالمی نظام" کی بات کر رہا ہے۔ اصل میں اس نظام کے بالکل برعکس اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ایک اور "عالمی نظام" کا نقشہ ابھر رہا ہے۔ امریکہ میں اذان کی آواز اس صبح نو کا پیغام ہے اس سے افق پر روشنی پھیلی ہوئی نظر آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

یہ کتاب اسی صبح نو کی نقیب ہے۔ تاریخ جس نئے موڑ پر آن کھڑی ہے اس میں اس مرد خود آگاہ کی راتوں کی مناجاتوں اور دعاؤں کا بہت بڑا دخل ہے۔ پھر یہ دعائیں ان ہونٹوں سے نکلی ہیں جنہیں اللہ کا پیغام جاپان سے سان فرانسسکو اور

افریقہ سے ماسکو اور پیکنگ تک پھیلانے کی توفیق ملی ہے۔ تصوف کی تاریخ میں شاید ہی کسی نے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے انسانوں کو اس قدر تھوڑے عرصے میں اس طرح متاثر کیا کہ ان کے دلوں کی دنیائیں بدل دی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ دیر تک ہمارے سر پر قائم رکھے اور ان کے دل کی بے تابیوں کا کوئی ذرہ ہمارے دل میں بھی اتر جائے کہ ملت اسلامیہ کے لئے دلسوزی سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا نے اس کتاب کو اشاعت کے لئے دینے سے پہلے منارہ طلب فرمایا تو تصوف کی چند اہم باتوں کی طرف رہنمائی فرمائی۔ اس دورہ میں جب دینی جماعتیں کئی کئی دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ اور حب جاہ ہماری سیاسی اور دینی افق کو گہنائے ہوئے ہے یہ باتیں مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مناصب کی طلب سے بے نیازی ہی ہمیں عالمی قیادت کے اہل بنائے گی۔ یہ بے نیازی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچے اور کھرے تعلق کے ذریعہ ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے ارشادات درج ذیل ہیں :-

ملاقات شیخ المکرم یکم جولائی ۹۱ء

تعلق باللہ معاملے میں سالک' شیخ اور محبوب حقیقی اللہ تعالیٰ کا آپس میں کیا تعلق ہے فرمایا کہ روح انتہائی لطیف اور انتہائی قوی چیز ہے۔ خارج کی چیزیں کتنی ہی مضبوط نظر آئیں۔ اس معاملے میں انتہائی کمزور ہیں۔ جہاں تک سالک کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ سورج کی طرح انوارات و برکات برساتے ہیں اس روشنی کو پوری طرح جذب اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس ذات بے ہمتا کے سامنے قلب کے شیشے کو صاف کر کے بالکل سیدھا کر کے رکھا جائے۔ اگر اس کی سمت درست نہ ہو گی تو انجذاب نہ ہو گا اگر الٹی ہو تو معاملہ ہی الٹ جائے گا اور ٹیڑھی ہوئی تو بھی بات نہ بنے گی۔ اسی طرح اگر شیشے کے بجائے پتھر سامنے رکھا جائے تو بالکل ہی کام نہ بنے گا۔

شیخ کے ساتھ سالک کا معاملہ انتہائی خالص ہونا چاہئے۔ اگر یہ خلوص ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اگر خالص نہیں تو کسی دنیاوی کوشش سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ حضرتؒ جی رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی کے آخری سالوں میں حاسدوں نے اپنی پوری کوشش کی کہ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کو میری طرف سے بدگمان کریں۔ کئی افراد نے باقاعدہ سازش کے تحت آپ کو طرح طرح کی باتیں بتائیں۔ حضرتؒ چونکہ دنیا کے ان ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے اور آپ کی طبیعت میں انتہا درجے کی سادگی اور معصومیت تھی۔ جو تصوف کا خاصہ ہے۔ خود مجھ میں بھی کچھ عرصے سے بچوں کی سی معصومیت پیدا ہو چلی ہے حالانکہ ہم میں نہ تو حضرتؒ جیسا ورع تقویٰ ہے اور ہمیں دنیا کے بکھیڑوں میں بھی خاصا ملوث رہنا پڑتا ہے۔ حضرت بظاہر اس پراپیگنڈا سے متاثر ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے اس حد تک معاملہ پہنچا دیا تھا کہ خیال یہ پیدا ہو چلا تھا کہ لنگر مخدوم کے آخری اجتماع کے موقع پر حضرتؒ جی رحمتہ اللہ علیہ جماعت سے میرے اخراج کا حکم صادر فرما دیں گے کہ خود اللہ کرے لیکن جماعت سے تعلق نہ ہوگا۔ مجھے کئی لوگوں نے آکر کہا کہ یہ حالات ہو چکے ہیں۔ لیکن میں نے ایک ہی بات کہی کہ میں جانتا ہوں کہ حضرت سے میرا قلبی تعلق کیا ہے اور یہ کہ اسمیں کسی قسم کی کمی نہیں۔ پھر مجھے اس کی کیا پرواہ کہ لوگ میرے بارے میں کیا کہتے پھرتے ہیں۔ مزید برآں مجھے جماعت میں اگر کوئی منصب یا عہدہ نہ ملے تو پھر کیا ہوا۔ میں تو آزاد منش شخص ہوں اور ذمہ داریاں اٹھانے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ کہاں تو صورت حال یہ تھی کہ حاسد مجھے جماعت سے خارج کروانے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کر کے حضرتؒ کو تیار کر چکے تھے اور امید لگائے بیٹھے تھے کہ لنگر کے اجتماع پر یہ اعلان ہوگا اور کہاں صورت یہ بنی کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ اعلان فرما دیا کہ ان کے بعد

میں ان کا قائم مقام ہوں گا اور یہ کہ بیگ صاحب اور شاہ صاحب کو بھی روحانی بیعت کے لئے میرے پاس ہی بیٹھنا پڑے گا۔

دراصل خود شیخ کے اختیار سے بھی یہ معاملات بالاتر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ شیخ کسی کو کوئی چیز دینا چاہے اور عملاً اگر اللہ تعالیٰ کی رضا نہ ہو تو وہ دوسرے کو وہی چیز دے دے۔ بہت بڑی حد تک معاملہ سالک کی اپنی نیت اور اپنے تعلق پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو شیخ بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ معاملے ہیں ہی انتہائی نازک اور حساس۔ روح کی دنیا کو ظاہر کی دنیا پر قیاس نہ کرنا چاہئے۔"

محمد حامد
۵/جولائی ۹۱ء
دارالعرفان منارہ

O-----O-----O

بابِ دل

گرد سفر

گرد سفر' ملک محمد اکرم اعوان کا پہلا شعری مجموعہ ہے' اپنی بات میں ملک صاحب نے شاعری کے حوالے سے بڑی اچھی باتیں کہی ہیں۔ سخن ہائے گفتنی میں' حافظ عبدالرزاق صاحب نے گرد سفر کی شاعری' اور شاعر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے' اس کے بعد ڈاکٹر محمد حامد کا دیباچہ ہے۔اور سید ضمیر جعفری کا خوبصورت مضمون ہے۔اس کتاب میں نقش کف پا کی روشنی' غزلیات اور بزم یاراں کے سرنامے کے تحت' شاعری کے مختلف انداز نظر آتے ہیں۔اور یہ محبت کے مختلف رنگوں سے سجی ہوئی 55 عدد' نعتیں' غزلیں قطعے اور نظمیں پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف بڑے مختلف انداز میں کھینچتی ہیں۔

O-----O-----O

گردِ سفر

منتخب اشعار!

حسن ظاہر سے تیرے روشن جہان رنگ و بو
پر جمال باطنی کی ضو فشانی اور ہے
دیکھتی ہے آنکھ گنبد کو کبھی در کو کبھی
دل نے جو دیکھا ہے آقا وہ کہانی اور ہے

O-----O-----O

قطعہ

ان سے ملنا بری ہی بات سہی
ان سے ملتے نہیں تو کیا کرتے
کیسے ممکن تھا اک ہتھیلی پر
زر کو پارے سے ہم جدا کرتے

O-----O-----O

وصل کی لذت کیا ہوتی ہے یہ پوچھو ان لوگوں سے
جن کو ہم نے دو عالم سے ہاتھ جھٹکتے دیکھا ہے

O-----O-----O

شکوہ یہ نصیبوں کا اک رسم ہے ورنہ
افتاد ہے کردار کی جو ہم پہ پڑی ہے

O-----O-----O

ہے کلی اس بات تک سے بے خبر
پھول بننے میں تو اس کی مات ہے!!

گردسفر

اپنی بات

''بندہ نہ تو شاعر ہے اور نہ ادیب محض اپنے احساسات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے اور وہ بھی صرف اس امید پر کہ شاید کسی ایک انسان کو بھی میرے یہ تجربات یا مجھ پر بیتے ہوئے حالات کسی صحیح سمت کو رہنمائی کر سکیں اور یوں وہ خود پر تجربہ کرنے سے بچ سکے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ خود پر تجربہ کرنے سے پہلے دوسروں پر بیتے ہوئے تجربات سے سبق حاصل کرو۔ نیز اپنا حساب کرتے رہا کرو۔ اس سے پہلے کہ تم سے حساب لیا جائے۔''

میں نے پچھلے مختلف سفروں کو مضامین کی صورت میں لکھنے کی کوشش کی 'جگہ' موسم 'لوگ' عقائد و نظریات کردار اور اس کے مقابل اسلامی اقدار یا پھر مسلمانوں کے حالات اور ان کے مسائل کسی حد تک ان سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ اور سلیقہ ،اپنی استعداد اور ناقص علم کے مطابق جو سمجھ سکا وہ تحریر کیا اور یوں ایک سفر نامہ کہہ لیجئے۔ ''غبار راہ'' کے نام سے وجود میں آیا۔ بے شمار لوگوں نے اسے پڑھا اور پسند

بھی کیا اور یوں کچھ اور لکھنے کا حوصلہ ملا۔ اس بار امریکہ کے سفر کے دوران میں نے کچھ اشعار کہے 'اور یوں نعتوں' نظموں اور غزلوں کے حوالے سے اپنے جذبات کو احباب تک پہنچانے کی کوشش کی۔ عین ممکن ہے کہ میری شاعری معیاری نہ ہو اوزان میں کمی بیشی ہو یا بحر درست نہ ہو مگر۔ ایک بات ضرور ہے کہ میں نے جو محسوس کیا اور کہنا چاہا' کہہ گزرا۔ سرائیکی زبان میں کہے گئے چند اشعار میں نے اپنے شیخ محترم کی جدائی میں کہے۔ نعت کے اشعار میں نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرنے کی کوشش کی جو عموماً نعت کا اسلوب ہے' بلکہ اپنے احساسات پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ یوں شائد نعت پیش کرنے میں بھی ایک نیا اسلوب ہو نیز اکثر اشعار دوران سفر موزوں کئے کبھی جہاز میں اور کبھی کار میں سفر کرتے ہوئے چونکہ میں نے بہت زیادہ سفر کئے یہاں سے امریکہ آنا جانا بھی ایک لمبا سفر ہے۔ پھر خود امریکہ کے اندر بہت بڑے فاصلے ہیں جن میں تقریباً ۳۶ روز میں، میں نے اوسطاً ۲۰۰۰ میل روزانہ کے حساب سے سفر کیا۔ ہر روز تین چار تقاریر، محافل ذکر اور لوگوں سے ملاقات تو اس ہجوم میں سفر کے وقت کو شعر موزوں کرنے پہ صرف کیا اور شاید میں اچھے شعر نہ کہہ پایا ہوں گا' مگر بڑی حد تک جو کہنا چاہتا تھا وہ ضرور کہہ گزرا۔

کچھ احوال دل، کچھ مشورے کچھ اندیشے اور کچھ دعائیں اب یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے اگر اس میں کوئی خوبی ہے تو اللہ کی عطا ہے اور خرابی ہے تو میرا قصور ہے در گزر کیجئے اور اپنے مفید مشورے سے سرفراز کیجئے۔ اپنی اصلاح کی پوری کوشش کروں گا۔ انشاء اللہ۔

فقیر سیماب اویسی

لاہور۔ ۲۸۔۵۔۹۳

سخن ہائے گفتنی

مقفیٰ اور موزوں کلام واقعی ایک خوبی ہے بلکہ ایک نعمت ہے مگر ہر ایسے کلام کو شعر نہیں کہتے۔ شعر کہے نہیں جاتے۔ شعر نازل ہوا کرتے ہیں' چنانچہ شعر کی ایک خصوصیت بقول حسرت موہانی یہ ہے کہ ؎

شعر دراصل ہے وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

اور شعر کا نازل ہونا علم پر موقوف نہیں بلکہ بقول اکبر الہ آبادی

عشق کو دل میں دے جگہ اکبر
علم سے شاعری نہیں آتی

اور فانی کا عشق' عشق نہیں عشق کی تہمت ہے عشق وہ ہے جو حیّ لا یموت کے ساتھ ہو۔ اسی لئے ارشاد ہوا۔ والذین آمنوا اشد حبا للہ۔ اور رب العالمین کی محبت کا ذریعہ اور راستہ رحمت العالمین کی محبت ہے۔ جسے جتنی یہ نعمت حاصل ہو جائے وہ اسی درجے کا کندن بلکہ پارس بن جاتا ہے پھر اس کے وجود سے اس کے افکار سے اس

کے کلام سے انوار محبت کے ایسے سوتے پھوٹتے ہیں کہ اہل دل کھنچے چلے آتے ہیں اور اس کی باتیں اس کی نہیں ہوتیں' بلکہ ان کی حیثیت یہ ہو جاتی ہے کہ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یہ مجموعہ کلام جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے یہ کچھ ایسی ہی واردات کیفیات اور نوائے سروش کی ہی مختلف صورتیں ہیں۔ حضرت سیماب نے نہ تو علم عروض پڑھا نہ کسی قادر الکلام استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ سخن گوئی کی مشق کرنے اور اساتذہ سے اصلاح لینے کا کوئی موقع آیا بلکہ آپ کی 58 سالہ زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اچانک یہ شعری چشمہ ابل پڑا ممکن ہے اس میں فنی اعتبار سے کوئی جھول ہو مگر بات یہ ہے کہ

نالہ پابند نے نہیں ہے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

قلبی واردات' ذہنی کیفیات' ذاتی مشاہدات' شعر کی زبان میں ڈھلنے لگے تو ڈھلتے ہی گئے۔ محبت کے جذبات ابلنے لگے تو ابلتے ہی چلے گئے' اور حال یہ ہو گیا کہ

آئی جو تیری یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

مگر اس کے ساتھ کہیں کہیں ظرافت بھی ہے لطافت بھی ہے اور یہاں وہاں دینی' قومی' سیاسی حقائق بھی شعر میں سمو دیئے گئے۔ غرض مجموعہ کلام ایک سدابہار گلشن ہے جس میں ہر رنگ کے پھول ہر ذائقہ کے پھل اور ہر قسم کے بیل بوٹے پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میں نہ سخنور نہ سخن سنج ہاں سخن فہمی کی نعمت جو اللہ کریم نے عطا کی ہے اس کا

انکار کفران نعمت ہے اس لئے اس مجموعہ کلام کے مطالعہ سے جو محسوس کیا' سپرد قلم کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حافظ پروفیسر عبدالرزاق۔ ایم اے

بلا عنوان

"گرد سفر" اردو شاعری کی جھیل میں پھینکا ہوا وہ پتھر ہے جو ارتعاش کی لہریں پیدا کرتا رہے گا۔ یہ ایک نئی سوچ اور نئی آواز ہے۔ عجب بات یہ ہے کہ یہ روایتی ادبی حلقوں کی بجائے تصوف کے سلسلے کے ایک شیخ کے رشحات قلم ہیں۔ پھر اس میں تصوف کے روایتی مضامین نہیں بلکہ یہ بیسویں صدی کی آخری دہائی کے تناظر میں ملت اسلامیہ کے درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے۔ یہ زندگی سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے اور اس کے ہر پہلو پر اظہار رائے کرتی ہے' لیکن اس طرح کہ قاری کو شعر کی لطافت دم توڑتی نہیں بلکہ تازہ تر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نعت سے لے کر ملکی سیاست تک اور گل و بلبل کی حکایت سے لے کر ملت کے مسائل تک ایک وسیع کینوس ہے جس پر شاعری کی گلکاری ہے۔

یہ ردیف و قافیہ کے التزام کے باوجود فاعلات فاعلات کی تنگ نائے کی پابند نہیں، اور نہ ہی روایتی انداز میں شاعری کا مجموعہ ہے"۔ نالہ پابند نے نہیں ہے"۔ درد بھری چیخ سات سروں میں نہیں سما سکتی۔ شاعر کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ تلخ حقائق کے ساتھ ساتھ بشاشت طبع کا بھی خیال رہے' چنانچہ لطیف پیرائے

میں بھی یہاں بات نظے گی۔ یہ سخن یار دل نواز کی طرح مگن کر دینے والی اور جذب کی کیفیت میں پہنچا دینے والی شاعری ہے۔

اردو ادب اور شاعری کا دامن اب تک اس انداز کی تحریر سے خالی تھا کیا عجب کہ یہ رنگ ایک الگ دبستان کو جنم دے اور اردو شاعری میں نئی روائیت کا پیش خیمہ ثابت ہو۔اس سے پہلے انہوں نے سفر نامے "غبار راہ" کے ذریعے اردو نثر کو تازگی اور بے تکلفی کے نئے انداز سے آشنا کیا تھا۔ یہ سفر نامہ مضامین نو بہ نو کے خرمن کی حیثیت رکھتا تھا۔بیرونی دنیا کے سفر سے ہمارے لئے یہ نہایت لذیذ سوغات تھی، لیکن اس بار اس کی شیرینی دو چند ہو گئی ہے کہ شاعر نے تو اسے "گرد سفر" قرار دیا ہے،لیکن یہ گرد سفر آنکھوں پر رکھنے اور چومنے کی چیز ہے کہ اس میں مدینہ منورہ کی راہ کے درخشاں ذرے بھی ہیں۔ مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ نقشبندیہ اویسیہ کے مشائخ میں سے ہیں ہوا کو اپنا پیام لے جانے کو کہتے ہیں یہی روایت نعت میں یہاں آئی ہے لیکن اس طرح کہ یہاں بات اپنی ذات سے بڑھ کر پوری ملت کے لئے کی گئی ہے اور نہایت ہی دردمندی اور مؤثر لہجے کے ساتھ یہاں نعت بھی روایتی انداز سے ہٹ کر ایک نیا پیرایہ اختیار کر گئی ہے۔ مختصر یہ کہ "گرد سفر" شاعری کا مجموعہ بھی ہے، اور درد کی ایک لہر بھی جو ہر دردمند دل کو خود اپنی آواز محسوس ہو گی۔

ڈاکٹر محمد حامد۔پی ایچ ڈی

نشان منزل

گرد سفر کے بعد نشان منزل کے نام سے 'ملک محمد اکرم اعوان کا دوسرا شعری سفر' جذبوں کی پوری سج دھج سے سامنے آیا' توان کی شاعری کو وقتی شوق سمجھنے والے چونکے' ظاہر ہے دوران سفر یا ایسے ہی فارغ وقت میں کہے جانے والے اشعار' فل ٹائم جاب ہو بھی کیسے سکتے ہیں۔ایک عام آدمی تو اسی طرح سوچتا ہے' اور اس پر طرہ یہ کہ خود صاحب کتاب بھی اپنی شاعری کے بارے میں گاہے بگاہے ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔وہ علی الاعلان اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ مگر ہم ان کی اس بات سے بھلا کیسے متفق ہو سکتے ہیں کہ ہمارے سامنے تو ان کی شعری واردات کے ان گنت رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔

گرد سفر میں 'سمبر شوق' حرز جاں اور بزم یاراں تین حصے ہیں شاعری کے' جن میں اول حصے میں حمدیہ اور نعتیہ کلام ہے' جو حقیقتاً کتاب کی جان ہے۔دوسرا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے' اور تیسرے حصے میں قطعے اور نظمیں شامل ہیں۔

کتاب ۱۹۹۴ء میں طبع ہوئی۔

نشانِ منزل

منتخب اشعار!

ہے نرالی سی قید الفت کی
یہی قیدی امیر ہوتے ہیں

O-----O-----O

امتوں میں تیری امت خیر امت ہو گئی
دین اب ادیان میں تیرا فقط کامل ہوا

O-----O-----O

زینہ تھا محبت کا بڑھے جوش میں ہم بھی
دیکھا تو بلندی پہ بڑی تیز ہوا ہے

O-----O-----O

گھٹ کے مر جانے کا سیماب نہیں ہے قائل
سر ہتھیلی پہ ہے مقتل کو سجانا چاہے

O-----O-----O

جل گیا جب دل تو آئینہ بنا
ایک جیسے ہو گئے ہجر و وصال

حرفے

گرد سفر کے بعد نشان منزل تو ایک فطری بات ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا سفر آخر منزل ہی کے لئے تو کیا جاتا ہے۔ مگر کیا میرے یہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس خوابیدہ قوم کو آمادہ سفر کر بھی سکیں گے۔ کیا یہ نعتیں نظمیں اور غزلیں جو ایک فن شاعری سے ناآشنا اور ادب سے بیگانہ اور محض درد مند دل سے نکلے ہوئے نالے کو شعر کہنے والے کی صدائیں وہ کام کر جائیں گی جس کے لئے انہیں چھپوانے اور نوجوانان قوم تک پہنچانے کی سعی کر رہا ہوں۔ اگر ایسا ہو جائے تو مجھے اس بات کی فکر نہ ہو گی کہ میرے شعروں کے اوزان اور غزلوں کی بحر میں کیا کمی رہ گئی یا میرے شعر واقعی شعر تھے بھی یا محض شعر کے نام پر افکار پریشان کو جمع کرتا رہا۔

اور اگر میری یہ گزارشات کوئی بیداری پیدا نہ کر سکیں، کسی آنکھ کو نم نہ کریں، کسی دل میں ٹیس نہ اٹھے تو پھر شعروں کی تعریف بھی ہو گی تو مجھے کوئی خوشی نہ ہو گی۔

اللہ کرے یہ الفاظ اگرچہ اس قابل تو نہیں مگر دلوں کو عظمت الٰہی عشق

رسول ﷺ اور حقانیت اسلام کی طرف متوجہ کر سکیں۔ اللہ قادر ہے اگر وہ چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور اسی کی بارگاہ سے امید کرم ہے۔

نعت میں بھی بصد ادب قوم کا احوال اس بارگہ عالی میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی گئی ہے۔ نظر کرم کا امیدوار ہوں۔

فقیر سیماب اویسی

دار العرفان ضلع چکوال

پاکستان

۲۱۔ دسمبر ۱۹۹۳ء

متاعِ فکر

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان دام برکاتہ کی بصیرت افروز دینی تصانیف کا راقم الحروف دیرینہ مداح و معترف ہے۔۔۔۔ان کے روحانی تصرفات کا شہرہ بھی۔۔۔۔اپنے احباب کے واسطے سے۔۔۔۔زبان در زبان۔۔۔۔باعث کشش ہے۔ آپ الاخوان جیسی وسیع اور طاقت ور بین الاقوامی تحریک کے بانی اور داعی بھی ہیں۔ اس حوالے سے دین کی تبلیغ، اتحاد عالم اسلامی کے لئے ان کی مساعی اب دیواروں سے نکل کر دلوں پر دستک دے رہی ہے۔ دنیا بھر میں جہاں جہاں پاکستانی موجود ہیں آپ کے ارادت مند بھی موجود ہیں۔

ذاتی طور پر یہ خاکسار ان کے "کاغذی متاثرین" میں شامل تھا۔ اور ان کی شخصیت کا تصور میرے ذہن میں ایک بھاری بھر کم ثقہ شیخ طریقت کی ڈیل ڈول کا تھا۔ لیکن دو ڈھائی برس قبل اسلام آباد کی ایک تقریب میں حضرت موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو جہاں ان کے علمی تبحر اور دینی فضیلت کا تاثر اور گہرا ہوا وہاں آپ کی شخصیت کی غیر رسمیت نے۔۔۔۔سچ تو یہ ہے۔۔۔۔کہ ہمیں خاصا حیران کیا۔۔۔۔نہ وہ جبہ قبہ۔۔۔۔جس میں علماء و مشائخ عموماً ملبوس و

مستور نظر آتے ہیں۔ نہ گفتگو میں بوجھل پن گھیرے یادائرے۔۔۔۔۔۔۔یوں لگا جیسے سرگودھے کا کوئی قدر آور کسان ہے جو کھیت میں کپاس کی فصل کی طرح دلوں میں دین کے پھول بھی اگا رہا ہے۔

طبیعت کی بے ساختہ شگفتگی۔۔۔۔۔۔ جیسے چو آسیدن شاہ کا چشمہ چھلک رہا ہو، جو ان کے آبائی پہاڑوں کے دامن میں بہتا ہے۔ادبی حوالے سے ان کی پہلی تحریر امریکہ اور بلاد مغرب کے سفر نامے "غبارراہ" کی صورت میں نظر سے گزری۔ رواں دواں بشاشت سے ایک غیر متوقع مگر خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔

بعض جگہوں پر تو یوں لگا جیسے حضرت مولانا نہیں بلکہ کرنل محمد خان (اردو کے صاحب طرز مزاح نگار) منرگشت پر نکلے ہوئے ہوں۔

یہ زندگی کا وہ عمومی رچاؤ ہے۔۔۔۔۔۔ جس کو بر قرار رکھنا ان جیسی مذہبی تشخص کی حامل بزرگ شخصیتوں کے لئے آسان نہیں ہوتا۔

مجھے تو یہ لگتا ہے کہ وہ جس "ولایت" میں بھی پہنچے ہیں۔ادب کے رستے سے ہو کر گزرے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ دینی اور ملی مصروفیات کے ہجوم میں ادبی تخلیقات پر زیادہ توجہ نہیں دے سکتے۔

نثر کے علاوہ آپ نے گاہے گاہے شعر میں اپنے افکار کا اظہار کیا ہے۔ زیر نظر کتاب ان کی شاعری کا اولین مجموعہ ہے۔۔۔۔۔۔۔اس مجموعہ پر چند تعریفی سطور لکھنا میرے لئے باعث سعادت ہے۔ یہ شعری ثمرات' نعت' غزل' قطعات' جیسی اصناف سخن پر محیط ہے۔اور بنیادی طور پر یہ تخلیقات ایک اہل دل کے سوز وگداز کی مظہر ہیں۔ سب سے بڑی متاع فکر عشق رسولؐ ہے۔ادبی حوالے سے ایک اور قابل ذکر پہلو درد مندانہ پیرایہ اظہار کے پہلو بہ پہلو شوخ مگر بلیغ طنز کی وہ چمکیلی دھاری ہے جو ان کے قطعات میں سیاسی اور معاشرتی موضوعات پر ہلکے پھلکے

تبصروں کی صورت میں ابھرتی چلی گئی ہے۔۔۔۔۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس شاعری کا مطالعہ دل و نگاہ کی بالیدگی اور آسودگی کا باعث ہوگا۔

O-----O-----O

اسلام آباد

۱۸ رمضان المبارک ۱۴۱۴ء

سید ضمیر جعفری

متاعِ فقیر!

متاعِ فقیر' ملک محمد اکرم اعوان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ اسکا دیباچہ نامور لکھاری کرنل محمد خان نے لکھا ہے۔ کرنل صاحب کہتے ہیں!

مولانا سکہ بند شعراء کی طرح شعر کہنے کے لئے "فکر" کرنے نہیں بیٹھ جاتے' نہ عروضی باریکیوں میں الجھتے ہیں۔ مولانا کی شعر گوئی میں غضب کا ارتجال ہے۔ شعر کے بعد شعر نازل ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود ان کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں!

اس کے بعد چند باتیں شاعر نے اپنے بارے میں کہی ہیں! اور پھر ہمیں اپنے بے ساختہ کلام کے سپرد کر کے وہ خود وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ اور پڑھنے والا' حمدیہ' نعتیہ' اور غزلیہ اشعار پر مبنی اس کتاب میں شامل جذبوں کی روانی اور تسلسل میں کھو سا جاتا ہے۔

متاعِ فقیر میں 67 عدد شعری واردا تیں' نعتوں غزلوں' نظموں اور قطعات کی صورت میں موجود ہیں۔ جو دوائے دل' ذرِ دردِ دل اور جذبِ دروں' دعوت کامرانی اور

تلخ تیریں جیسے کھٹ مٹھے عنوانات کے تحت چھپی ہیں۔ آیئے آپ کو ان کے مختلف ذائقوں سے ملواتے ہیں۔

یہ کتاب 1994ء میں شائع ہوئی۔

متاعِ فقیر!!

منتخب اشعار!

نہ تھا کوئی طالب تیرا اس جہاں میں
ہمارے زمیں پر اترنے سے پہلے

O-----O-----O

نعت لکھنے کا قرینہ چاہئے
نور ہو جس میں وہ سینہ چاہئے
عرش کی راہوں پہ ہیں ان کے نقوش
دیکھنا جا کر وہ زینہ چاہئے!!

O-----O-----O

تنہائی کا روگ برا ہے سارے رنگ لٹاتا ہے
نیلے چشمے تک پی جاؤ دل پیاسا رہ جاتا ہے

O-----O-----O

بک گئے ہم نام پر تیرے فقیر
تم چلے ہو آزمانے کے لئے

O-----O-----O

بچھڑ کے تجھ سے سبق ملا ہے کہ منزلیں تو سفر سفر ہیں
جنہیں محبت نہیں کسی سے جہاں میں دیکھا انہیں کے گھر ہیں!!

O-----O-----O

قیام کیا ہے مقام کیسا یہ زندگی ہے یونہی رہے گی
یہ خود سفر ہے ہمیشگی کا یہ چلتے چلتے یونہی کٹے گی!!

O-----O-----O

فیضان نظر

متاع فقیر یوں تو تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ گرد سفر اور نشان منزل اس سے پہلے نذر قارئین ہو چکے مگر حق یہ کہ یہ سب محض میری کیفیات اور میرے جذبات کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں یہ اشعار کیسے ہیں۔ ان کا معیار کیا ہے بلکہ یوں کہیے کہ یہ اشعار ہیں یا نہیں اسکی مجھے خبر نہیں اس لئے کہ میں نے یہ فن سیکھا ہے اور نہ اس کے اسرار و رموز۔ میں نے جتنا بھی سیکھا سب کچھ محض اپنے عظیم شیخ کی توجہ اور نگاہ کا حاصل ہے۔

اگر ان اشعار میں واقعی کوئی کمال نظر آئے تو یہ اللہ کی عطا اور شیخ المکرم کا فیضان نظر ہے اور اسکے سارے سقم کی ذمہ داری میری کمزوریوں کا نتیجہ ہے۔

اللہ کرے میں جو چاہتا ہوں وہ کہہ سکا ہوں اور جو کہہ گیا ہوں وہ کسی کی سمجھ میں آسکے تو میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا کہ بندہ صرف بات پہنچا سکتا ہے باقی سب توفیق اللہ کی ہے۔

والسلام

سیماب اویسی

۲۴ رمضان المبارک ۷ مارچ ۱۹۹۴ء ۱۴۱۴ھ

مولانا محمد اکرم کی شاعری

مولانا محمد اکرم پیشہ ور شاعر نہیں۔ شوقیہ شعر کہتے ہیں۔ اپنے مشن اور مقام کی وجہ سے مولانا کی مصروفیات بے کراں ہیں۔ لہذا شعر گوئی ان کی بے حد کمیاب فرصتوں کا مشغلہ ہے۔ یعنی زمینی یا ہوائی سفر کے دوران یا "کچھ دیر پہلے نیند سے"۔

مولانا سکہ بند شعراء کی طرح شعر کہنے کے لئے "فکر" کرنے نہیں بیٹھ جاتے' نہ عروضی باریکیوں میں الجھتے ہیں۔ مولانا کی شعر گوئی میں غضب کا ارتجال ہے۔ شعر کے بعد شعر نازل ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی عدیم الفرصتی کے باجود مولانا کے کلام کے تین مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

مولانا کا محبوب ترین موضوع' حسب توقع' نعت ہے۔ یوں تو وہ دوسرے موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی جا بجا خوبصورت نعتیہ اشارے اور کنائے کئے جاتے ہیں' تاہم خالص نعتیہ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ عشق رسولؐ میں کس قدر ڈوب کر لکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں آپ نے ایک نعت میں اس بات کی پوری توضیح کی ہے۔ "نعت کیا ہے؟" آپ بھی پڑھیں اور سر دھنیں۔

مولانا نے تقریباً ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے مگر آپ کا بیشتر کلام غزلیات پر مشتمل ہے اور آپ کے اس کلام کو ایک ہی عنوان دیا جا سکتا ہے : محبت! محبت کا کوئی پہلو، کوئی گوشہ ایسا نہ ہوگا جس پر مولانا نے یکسر دلربا انداز میں اظہار خیال نہ کیا ہو۔ ہر چند کہ مولانا کے ان بظاہر عشقیہ اشعار میں جا بجا معرفت کا پہلو پنہاں ہے جن تک خاص قاری ہی پہنچ پاتا ہے مگر ان کی غزل میں وہ دلفریب کشش بہت نمایاں ہے جو مومن اور داغ جیسے اساتذہ کے کلام میں ملتی ہے۔ چنانچہ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے کلام سے 'عامی ہو یا عالم' یکساں طور پر محظوظ و مسحور ہوگا۔

کرنل محمد خان

راولپنڈی

آس جزیرہ

آس جزیرہ کا دیباچہ ڈاکٹر اجمل نیازی نے تحریر کیا ہے یہ شاعر سیماب اویسی کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ یہ 1995ء میں شائع ہو کر پڑھنے والوں کے ہاتھوں میں پہنچا۔ اسی میں سینتیس عدد نعتیں اور غزلیں ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں نور جاوداں' دشت ہجراں اور قرینۂ محبت کے عنوانات کے تحت چھپنے والی شاعری' پڑھنے والے کو اپنے سادہ و پرکار حسن سے مسحور کرتی چلی جاتی ہے۔ ابتدا نور جاوداں کے عنوان سے تین بہت خوبصورت نعتوں سے ہوئی ہے اس کے بعد غزلیں رنگ باندھتی چلی جاتی ہیں۔ ہم یہاں اس کتاب سے نعتوں اور غزلوں کے کچھ چنیدہ اشعار پیش کر رہے ہیں۔

ترے نور سے ہی روشن میری راہیں دو جہاں میں
تیرا نام بن کے سورج دل میں چمک رہا ہے
تیری یاد ہمسفر ہے' تیری یاد دلربا ہے
وہ جگہ ہے میری منزل جہاں تیری خاک پا ہے

O-----O-----O

آپؐ نے وہ اوج انساں کو دیا
بندہ طالب بن گیا معبود کا
آپؐ سورج جس سے نکلا دن نیا
مٹ گئے دنیا سے سب جور و جفا

آ بھی جاؤ کہ ڈھل رہا ہے دن
دشت ہجراں میں شب نہ ہو جائے

O-----O-----O

آس جزیرہ ڈوب چلا ہے گر آؤ تو بات بنے
بچھڑے ملیں تو منجدھاروں کو ہٹ کر چلتے دیکھا ہے

O-----O-----O

آنکھ میری لے کے دیکھو، دیکھنا چاہو اگر
گلشن محبوب کی ابدی بہاروں کا سماں

O-----O-----O

منارۂ نور سے ایک آواز

حضرت مولانا محمد اکرم صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ پہلی نظر میں آدمی ان کی بلند وبالا ہستی سے مرعوب ہوتا ہے۔ جب ان کی دلربائی اور دلآویزی منکشف ہونے لگتی ہے تو ہر کوئی انہیں اپنا محبوب بنالینا چاہتا ہے۔ وجاہت اور وقار ان کے سراپے میں رقص کرتا ہے۔ یہاں وجد کرنا زیادہ مناسب ہے اگرچہ رقص اور وجد میں خاص فرق نہیں۔ وجد بھی وجود کی کوئی ادا ہے۔

پہلے پہل ان کے لئے میرے دل میں عقیدت کی خوشبو بیدار ہوئی۔ جو محبت بنتی چلی گئی۔ اسکے بعد سارے رابطے ایک دوستانہ کشادگی میں سمٹ گئے۔ ان کی وضعداریاں اور رواداریاں بھی رشتہ داریوں کی طرح ہیں۔ ان کے لئے یہ چند سطور لکھتے ہوئے میں بری مشکل میں ہوں اور آسودگی بھی محسوس کر رہا ہوں۔

ملک اکرم صاحب سے پہلے میں چکڑالہ کے ایک جاٹ کا نیاز مند ہوا۔ کچے کوٹھے میں رہنے والا یہ شخص اتنے مضبوط دل کا آدمی تھا کہ اس نے دلوں کو تڑپنا سکھا دیا۔ میرے اور جناب اکرم صاحب کے مرشد عظیم مولانا ملک اللہ یار خان نے بھیڑ بکریاں بھی چرائیں۔ یہ صاحب مقام آدمی اپنی آواز کی بلندی کو سربلندی بنا دینے پر قادر ہوا۔ دل ونگاہ کا سوز ساز ان کی آواز میں دمکتا تھا' اور سننے والے جھومتے تھے۔ وہ دلوں کے اندر جھانکنے کا فن جانتے تھے۔ نا معلوم کو معلوم میں لانے کا ہنر ان کے

پاس تھا۔ ان کی بلند آہنگ آواز میں وہ سارے راز تھے جو ہم نے فضول بول بول کے گم کر دیئے ہیں۔ ایک انوکھی گھن گرج ان کے لہجے میں تھی۔ اس نجیب آدمی کی صحبت جسے حاصل ہوئی وہ کچھ اور آدمی بن گیا۔

حضرت مولانا اکرم صاحب اعلیٰ حضرت کے سچے جانشین ہیں۔ ان کی ہم نشینی کی رازداری اکرم صاحب کے حصے آئی۔ وہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کی بہت قدر و منزلت ان روحانی صحبتوں میں ہوئی تھی۔ حضرت ہمیشہ گرمیوں کی چھٹیوں میں اکرم صاحب کے مہمان ہوتے تھے۔ ساتھیوں کا ایک قافلہ بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ میں بھی اکرم صاحب کی مہمان نوازی کی سعادت پا چکا ہوں۔ دھن دولت والے سیر و تفریح کے لئے سوات اور مری جاتے ہیں دل و جاں والے کیف و سرشاری کے لئے منارہ ضلع چکوال جاتے تھے منارہ ان دنوں میں منارۂ نور بن جاتا تھا۔ قلب و باطن کے اسرار و رموز ان محفلوں میں سکھائے جاتے تھے۔ ذکر و فکر کی یہ محفلیں زندگی کا حاصل ہیں آج بھی یہ محفلیں منارہ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں برپا ہوتی ہیں۔ حضرت اکرم صاحب کی قیادت کو مرشد مرحوم کی زندہ جاوید یادوں کی طاقت حاصل ہے۔ پرنور راتوں کے پچھلے پہر کی سرشاریوں کی ساری گواہیاں ملک صاحب کے دل میں تڑپتی ہیں۔ یہ تڑپ ان کی شاعری میں بھی سرسراتی ہے۔

حضرت اکرم صاحب نے دینی تعلیم باقاعدہ حاصل نہیں کی۔ دنیاوی تعلیم کے لئے بھی خاص اہتمام نہیں کیا مگر عشق و علم کا اشتراک ان کے خاک و خون میں گھل مل گیا ہے کہ جب وہ بولتے ہیں تو دلوں کے بند دروازے کھولتے ہیں۔ ان کی گفتگو سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے لہو میں آرزو اور جستجو کے کئی رنگ اکٹھے کر دیتی ہے۔ ایسی پرتاثیر بات چیت کا اسلوب کم کم لوگوں کو ملتا ہے۔ جیسے وہ خوابوں کی تعبیر بیان کرتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے خوابوں کی تعبیر میں تعمیر کی جھلک پیدا ہو جاتی

ہے۔ عام بات بھی ان کی زبان سے ادا ہو کر خاص بن جاتی ہے۔ جب وہ اپنے آقا و مولا حضرت رسول کریمؐ کو یاد کرتے ہیں تو دین و دنیا کے علوم ان کے لفظوں میں بکھرتے نکھرتے ہیں جیسے اندھیری رات میں نجوم چمکتے ہیں۔ آدھی رات کے تازہ دم ستارے ان کے دوست بنتے ہیں۔ انھیں ان ستاروں کی روشنی پسند ہے جو نظر نہیں آتے۔ معلوم اور نامعلوم کے ملاپ کے لئے آپ کے اندر کچھ ہوتا رہتا ہے۔

ان کے لئے کیا کہا جائے کہ ان کے دل میں آتش فشاں ہے اور ان کی جھولی میں گنگناتی ہوئی ندی ہے۔ اونچے لمبے سیدھے بلند و بالا انسان جن کی آنکھوں میں دیکھنے کے لئے سر کو اوپر اٹھانا پڑتا ہے، وہ صفات کے کوہسار ہیں۔ جذبوں اور یقینوں کی مستحکم چٹانیں ایسے انسانی پیکر میں سر بفلک ہوتی ہیں۔

تنے پیدا کن از مشت غبارے
تنے محکم تراز سنگین حصارے
درون او دلِ درد آشنائے
چوں جوئے درکنارِ کوہسارے

دینداری کو ایک عزت مندانہ مقام عطا کرنے کے لئے اکرم صاحب جیسی شخصیت کوئی قیادت فراہم کر سکتی ہے۔ زمانے بھر کی امامت صرف انہی کا حق ہے۔ یقیناً علامہ اقبالؒ نے ان کے لئے ہی کہا تھا۔

؎ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اتنی قد آور شخصیت اور کون ہے؟ وہ ظاہری اور باطنی دونوں حقیقتوں کے سامنے خزانوں سے بھرے ہوئے پہاڑ جیسے ہیں۔ وہ دین و دنیا کے سانجھے راستے پر جلال و جبروت اور ملال و محبت کا استعارہ ہیں۔ اس بات میں ذرا بھر مبالغہ نہیں کہ حجاز کے نو مسلموں نے حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے پر حوصلہ اور آسودگی

محسوس کی تھی۔ آج کی بے چارگی اور بے بسی کے ماحول میں اکرم صاحب کو دیکھ کر تھکی ہوئی امیدیں دل نیم مردہ میں زندہ ہو بیٹھتی ہیں۔ کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ پگڑی اور داڑھی آدمی کے وقار اور وجاہت میں اس قدر اضافہ کر سکتی ہے۔ دردمندی اور دانش مندی' دبدبہ اور طنطنہ' دین اور دنیا کا ایسا انوکھا امتزاج ان کے مزاج کا حصہ ہے کہ رشک آتا ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

دنیا بھر کے کھرے مسلمانو! دل ونگاہ والے تخلیقی لوگو!

جناب ملک اکرم صاحب کی موجودگی سے استفادہ کرو۔ کھوئی ہوئی عظمتوں' روایتوں اور برکتوں کا خزانہ ان کے دل میں چھپا پڑا ہے۔ اپنے دلوں کا رخ ان کی طرف کر لو' پھر دیکھو کہ کیا کیا انقلاب ظاہر ہوتے ہیں۔ خواب اور انقلاب کی سرحدیں اسی علاقے میں کہیں ملنے والی ہیں۔ ذکر و فکر کی محفلیں اور ان کی صحبتیں آباد کرو۔ سرگی ویلے والی سنگت کو تازہ کرو۔ ایک صبح نوید ہمارے ساتھ ملاقات کرنے چل پڑی ہے۔ مظلوم اور محروم' بدقسمت اور لاوارث مسلمانوں کو جس روحانی توانائی اور وجدانی رہبری کی ضرورت ہے اس کی ساری نشانیاں ملک صاحب کی ذات وحیات وکائنات میں اکٹھی ہو گئی ہیں۔

کہا گیا کہ قرآن اسطرح پڑھو جیسے تم پر اترا ہو۔ ہم نے اکرم صاحب سے تفسیر قرآن سنی۔ ایسا ہی کیفیات کا تانتا بندھ گیا۔ دل کے آگے تعبیر بنتی چلی گئی۔

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر

اور ہم نے آنکھیں بند کر کے دیکھا تو جو نظر پڑا اسے بیان کر دیں تو کوئی یقین ہی نہیں کرے گا۔ تقریر کی لذت آشنائی کے بعد ان کی تحریر دیکھی۔ ان کی لکھی

ہوئی تفسیر کتابی صورت میں دستیاب ہے۔اس تفسیر میں بھلائی گئی قوموں کی تقدیر کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ میں نے مفہوم کے ہجوم کو کارواں بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر ازل شناس اور ابد مقام امیر کارواں ﷺ کے لئے جذبوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر احساس کے اندر بہنے لگا۔

اظہار آدمی کے اختیار کو بڑھاتا ہے۔ جبکہ اکرم صاحب تو فطرتاً بااختیار آدمی ہیں۔ان کی بے اختیاریاں بھی بانصیب ہیں۔ مجبوری اور مختاری کے درمیان کوئی مقام ہے جہاں دل زندہ ایک نیا جہان بلکہ کئی جہان تلاش کر لیتا ہے۔ اکرم صاحب کی شاعری ان کی شخصیت کے ساتھ ہم سفر ہو کے مجھے کئی جہانوں کی سیر کرانے لے چلی۔

میں سوچتا رہا کہ انہیں شاعری کرنے کا خیال کیسے آگیا۔ خیالات اور جذبات ان کی صوابدید پر رہتے ہیں۔ یہ شاعری کی خوش نصیبی ہے کہ انہوں نے اسے اپنے اظہار کے لئے منتخب کیا ہے۔ شاعر ہونا ان کے لئے اعزاز نہیں۔ ہم شاعروں کے لئے اعزاز ہے کہ اس قبیلے میں وہ شخص شامل ہوا ہے جو استقامت کردار اور حسن عمل کا پیکر ہے۔

فوری مطالعے میں یہ شاعری سادگی میں لپٹی ہوئی لگتی ہے۔ یہ ادب ان کے پڑھنے کا ہے جو اپنے اندر محبت بھر ادل رکھتے ہیں اور اکرم صاحب کے لئے تعلق خاطر پر محسوس کرتے ہیں۔ اسے دل سے پڑھا جائے تو سرشاریاں ہی سرشاریاں ہیں۔ یہ شاعری لکھنے کے لئے کوئی تردد نہیں کیا گیا۔ جیسے لفظ خود بخود اس ترتیب میں آجمع ہوئے ہیں۔ مسافر پرندوں کو شفاف میٹھے اور کشادہ پانیوں پر اترنے کے لئے دیر نہیں لگتی۔ جذبوں کو کہیں ٹھکانہ بناتے ہوئے مستحق ثابت کرنے کے لئے منتظر نہیں رہنا پڑتا۔ زور لگا کر کہے گئے اشعار میں پختہ کاری کا غرور تو ہوتا ہے معصومیت کی

غیرت نہیں ہوتی۔ کشش کبھی کوشش سے پیدا نہیں ہوئی۔ کیفیت اور کیف باوقار دریاؤں کی بے ساختہ روانی اور باوفا ہواؤں کی برجستہ آسانی جیسی خصوصیات والی شاعری میں پیدا ہوتا ہے۔ شاعری پڑھنے والے کو ایک پیغام دیتی ہے۔ پھر سلام و پیام میں فرق مٹ جاتا ہے۔

عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے
تیرا پیام اور ہے میرا پیام اور ہے

ایک قدیم یاد کو اپنے لہو میں گھول کے اکرم صاحب جدید زمانے کے منظروں کو اپنی آنکھوں میں سموئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے منارہ میں ایک سکول جدید و قدیم رنگوں کی سانجھ سے تعمیر کیا ہے۔ یہ مدرسہ صرف نماز پڑھنے والے پیدا کرنے کا کام نہیں کرتا۔ نماز قائم کرنے والے لوگ ڈھالنا چاہتا ہے۔ اور مسجد' مدرسہ اور محاذ جس ایک مرکزی نقطے کے گرد اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ وہی ! محدود دائرہ ان کی منزل ہے۔ ان کی ذات میں ایک لیڈر' ایک امام' ایک سپہ سالار' ایک مدبر' ایک عالم' ایک خطیب' ایک ادیب و شاعر عجیب و غریب سلیقے سے جمع ہوئے ہیں' یکجا ہو کر یکتا ہوئے ہیں۔ وہ دشوار گزار راہوں کو سیدھا راستہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ سیدھے راستے کو صراط مستقیم بھی کہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ کا انعام نازل ہوتا ہے اور جن کی تقلید کے لئے تاکید کی گئی ہے۔ فطرت و قدرت کا انعام پایا ہوا آدمی دیکھنا ہو تو اکرم صاحب سے ملئے۔ وہ خود بھی الف کی طرف سیدھے ہیں۔ ؎

اکو الف ترے درکار

انہوں نے ایک بار الف' ل' م کی تشریح کرتے ہوئے الف کی تعبیر کی تھی کہ میری آنکھیں کھل گئیں اور دل میں انشراح پیدا ہوا۔ پھر یوں ہوا کہ مسلسل ملاقاتوں کے بعد برسوں ان سے ملاقات نہیں ہوئی' مگر ان سے وابستگی دل کے کسی

محفوظ مقام پر تڑپتی رہی۔ وہ ہمیشہ ایک قومی آئیڈیل کے روپ میں نظر آئے جس کا عکس بین الاقوامی منظر نامے پر پڑتا رہتا ہے۔

میں ان کی شاعری کے لئے تنقیدی بات کیا کہوں مجھے وہ صرف شاعر کی حیثیت میں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ تو ذوق و شوق اور جوش و خروش کی بے نیازی ہے جو نت نئے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی قرینہ اختیار کرتی رہتی ہے۔ طوفانوں سے آشنائی رکھتے ہوئے دریا میں موجیں بے قابو بھی ہوتی ہیں۔ اکرم صاحب نے علمی و ادبی' تخلیقی و تہذیبی' دینی و دنیاوی حوالے سے کسی لہر کو بے مہار نہیں ہونے دیا۔ شاعری آسانی سے اور پوری طرح مغلوب نہیں ہوتی۔ اکرم صاحب کی شاعری سیل وفا کی یلغار نہیں۔ بکھرتے ہوئے پانیوں کو کناروں میں رکھنا کسی بے کنار جذبوں والے آدمی کا کام ہے۔ شاعری میں ضابطے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس لئے یہ پیغمبروں کا شعار نہیں رہا۔ اور شاعری کو شیوہ پیغمبری بھی کہا گیا ہے۔ اس کے آگے کچھ کہنے کے لئے جس احتیاط کی ضرورت ہے مجھ سے اس کا پورا اہتمام نہیں ہو سکے گا۔ بات کہنے کے لئے احتیاط چاہئے تو سننے کے لئے بھی اتنی ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔

شاعری جزو ایست از پیغمبری

اکرم صاحب سے بڑھ کر پیغمبروں والا کام اور کون کر رہا ہے کاش ہمارا زمانہ انہیں سچی طرح پہچان لے تو یہ زندگی کچھ اور زندگی بن جائے۔

عربی زبان کی ایک ضرب المثل ہے کہ "شاعر اللہ کے شاگرد ہوتے ہیں" جب شاگردوں کی جماعت جلسہ عام بن جائے تو خاص خاص لوگ کم کم ہو جاتے ہیں۔ خاص الخاص لوگوں کی بھی کئی قسمیں بن جاتی ہیں' میر' غالب اقبالؒ' راشد' مجید امجد اور فیض' زندوں میں ندیم' منیر نیازی اور ظفر اقبال مختلف مقامات پر نظر آتے

ہیں۔ اس سے آگے چلیں تو مجھے آفتاب اقبال شمیم' ثروت حسین اور شوکت ہاشمی اچھے لگتے ہیں۔ جو نام لئے گئے ہیں ان میں بھی الگ الگ رنگوں کی دھول اڑ رہی ہے۔ سب سچے شاعر غیب سے اترنے والے لمحوں کو اپنا ساتھی بناتے ہیں۔ خیال کا تعلق غیب سے ہے۔ ہر شخص کا اپنا غیب ہوتا ہے۔ غیب کو اپنے ظاہر میں برپا کرنے کی استعداد اپنی اپنی ہوتی ہے اور فطرت ہر کسی پر مہربان نہیں ہوتی۔

میرا خیال ہے کہ جو بھی شاعری کر سکتا ہے وہ شاعری کرنا چاہتا ہے اسے بہر حال شاعری کرنا چاہئے۔ شاعری سے متاثر ہونے کا اپنا اپنا انداز ہے۔ کیا پتہ کس وقت کوئی کس علاقے میں کھڑا ہو۔ وہ لوگ جو اہل خبر سے کچھ کچھ باخبر ہیں وہ اس شاعری کی برکتوں' سعادتوں اور نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شعر و ادب کے قبیلے والے اس علاقے میں آجائیں جہاں اکرم صاحب کے دوسرے ناقابل تسخیر اور ناقابل فراموش کارنامے تخلیق ہوتے رہتے ہیں۔

میرا افتخار یہ بھی ہے کہ میں ایک بہت بڑے تخلیقی بہت معرکے کے آدمی کا شاعری کے صدر دروازے پر خیر مقدم کر رہا ہوں۔ انہوں نے کئی میدانوں کو ایک میدان میں اکٹھا کر لیا ہے۔ ایک صاحب دل اور صاحب کمال اور صاحب میدان کے خیال و خواب ایک تحفہ ہیں۔ شاید یہ واقعہ دین و دنیا کے کسی انوکھے ملاپ کا ذریعہ بنے۔ دو باتیں میرے لئے اذیت ناک شرمندگی کا باعث ہیں۔ ایک یہ کہ فنون اور شعر و ادب کے لوگ گمراہی اور آگاہی کو ملاتے رہتے ہیں اور یہ کہ دنیا بھر میں مسلمان کربناک ذلت و خواری کا بڑا آسان شکار بنے ہوئے ہیں۔ کسی طرح یہ ہو کہ مسلمان ہونے اور اچھا انسان ہونے میں فرق نہ رہے۔ اور فطری غیرت مندی ایک بار پھر ہمارا نصیب ہو جائے۔ شاعر ہونا بھی ایک سچا اعزاز ہو۔ شاعر تو قوموں کی پہچان ہوا کرتے ہیں۔ پھر وہ یہاں پامال مخلوق کیوں بن گئے۔

تقسیم ہندوستان کے بعد عظمتیں گم ہو رہی ہیں۔اب تو تقسیم پاکستان بھی ہو چکی ہے۔اس لمحے میں تاریخی کردار کو تخلیقی کردار کے ساتھ منسلک کرنا ہو گا۔ حضرت مولانا محمد اکرم صاحب ہر عمل کو حسن عمل اور عمل کثیر بنا دینا چاہتے ہیں۔ کیا ہم ان کا ساتھ دینے کی خواہش بھی نہیں کر سکتے۔ خواہش اور کوشش کے درمیان فاصلے کسی فیصلے کے منتظر ہیں۔

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
لٹا دے مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے!!

ڈاکٹر اجمل نیازی
آس جزیرہ ۱۹۹۵ء

O-----O-----O

دیدۂ تر!!

حضرت مولانا محمد اکرم اعوان کی شاعری کا پانچواں پڑاؤ' دیدۂ تر کے نام سے 97ء میں سامنے آیا' اس میں ایک سو بارہ غزلیں' نعتیں اور نظمیں شامل ہیں۔ حسن رضوی' اصغر ندیم سید اور عمر زمان کی آراء سے بھی اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر اجمل نیازی نے لکھا ہے۔ اس میں کی جانے والی شاعری بے ساختگی اور تازگی کا خوبصورت امتزاج لئے ہوئے ہے۔ تصنع اور بناوٹ کی آلائش سے پاک اس شاعری کو شاعر نے جذبوں کی سادگی کی آرائش سے مالا مال کر دیا ہے!

آیئے چند شعر دیکھیں!!

اے خوشا روز تیرے شہر کو دیکھوں میں بھی
ہو کبھی سر پہ میرے تیری گلی کا سایہ

کان آہٹ پہ نظر در پہ لگی رہتی ہے
آ کے کہہ دے یہ کوئی تیرا بلاوا آیا

☆☆☆

آؤ اس رحمتِ عالم کی کوئی بات کریں
آج ہم عشقِ نبیؐ میں بسر رات کریں

مل کے بیٹھے ہیں کریں آج نچھاور دل کو
آؤ اس در پہ کبھی خود سے ملاقات کریں

☆☆☆

دے سکا شہر نہ شب بھر کا ٹھکانہ جن کو
تھے وہی لوگ تیرے ناز اٹھانے والے

☆☆☆

اپنا فسانہ بس اتنا تھا نام سے تیرے شروع ہوا
اپنی کہانی بس اتنی ہے ذات پہ تیری ختم ہوئی

☆☆☆

نقدِ جاں ہے تمہاری ہی خاطر
دوسروں سے ادھار کرتے ہیں

دیدہ ور

حضرت ملک محمد اکرم اعوان اپنی فطرت میں ایک بلند پایہ لیڈر ہیں۔ ان کی شاعری ان کے اس وصف کا عکس ہے۔ برعکس بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاعری ان کا ایک الہامی مشغلہ ہے۔ ان کی پوری زندگی ایک روحانی واردات کی طرح گزر رہی ہے۔ تخلیقی واردات بھی روحانی واردات ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی لگتا ہے کہ یہ وارداتیں مشترک اثرات رکھتے ہوئے بھی مختلف کیفیات رکھتی ہیں۔ لگتا ہے جیسے کوئی اور آدمی ان کے اندر بیٹھ کر شاعری کرتا ہے مگر پھر ان کے باہر نکل کر شعر کہنے لگتا ہے۔ وہ گفتگو کرتے ہیں تو کوئی جانی پہچانی آرزو ان کے لفظوں کی آنکھوں میں رقص کرتی ہے۔ یہ رقص جب رقص نیم بسمل بنتا ہے تو شاعری بن جاتی ہے۔ ملک صاحب کی پرکشش اور پراسرار شخصیت پر جلال بھی ہے۔ ایسے میں سوز و گداز بھی ایک راز کی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ وہ خوابوں کی تعبیر بیان کرتے ہیں تو جیسے اس جہان کے اندر ایک اور جہان تعمیر کر رہے ہوں وہ تصور کو تصویر کرتے ہیں مگر جیسے تصویر کو بھی بیان کر رہے ہوں جیسے تقدیر بیان کر رہے ہوں۔ بیقراریوں اور سرشاریوں کی سب جھلکیاں ان کی شاعری میں جھلملاتی نہیں۔۔۔ چھب دکھا کر چلی جاتی ہیں۔

مولانا حسرت موہانی دونوں دریاؤں کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ ایک دریا میں ڈوب کے دوسرے دریا میں جا نکلتے رہے۔ مگر دونوں پانیوں سے الگ الگ سیراب ہوئے۔ ملک صاحب کے لئے یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ وہ کئی زندگیاں گزار رہے ہیں اور کئی دریا ان کی ذات میں ٹھاٹھیں مار رہے ہیں۔ ان سے ہر بار مل کے انہیں سن کے محسوس ہوتا ہے کہ

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

مجھے لگتا ہے کہ جب وہ شاعری کرتے ہیں تو کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس کچھ اور میں بھی بہت کچھ ہے۔ جب جب میں ان کے لئے سوچتا ہوں تو کچھ اور سوچنے لگ جاتا ہوں۔ وہ کچھ اور ہی انسان ہیں۔ کچھ اور ہی شاعر ہیں۔

ان کے لئے روایتی طریقے سے بات کرنا بے ادبی تو ہے ایک غیر ادبی حرکت بھی ہے۔ ان کی شاعری میں کبھی کبھی ان لمحوں کی آہٹ سنائی دیتی ہے جو راستوں کی طرح ان کی زندگی میں بچھے ہوئے ہیں۔ یہ آہٹ کبھی گنگناہٹ بنتی ہے کبھی جگمگاہٹ بنتی ہے۔ ہر طرح کے جمال کا دائرہ چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ جلال و کمال اور شان و شکوہ جو ان کی بلند و بالا شخصیت کا شعار ہے۔ ابھی کم کم شاعری بنتا ہے۔ یہ شاعری پورا چاند بنی تو اس کی روشنیاں ان دیکھی دنیاؤں کو بھی فتح کر لیں گی۔

اپنی آسودگی کے لئے وہ ذکر کرتے ہیں فکر کرتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ یہ ان کے فرصت کے لمحوں کی فراست ہے۔ فراغتوں کو فروغ دینے کے لئے یہ مشغلہ انہوں نے اختیار کیا ہے۔ شاید وہ ریلیکس ہونا چاہتے ہیں تو شعر کہتے ہیں۔ لوگ اس کام کے لئے تفریح کے کیا کیا سامان ڈھونڈتے ہیں۔ مگر ملک صاحب کی تفریح بھی ترفع سے خالی نہیں۔ ان کی شاعری ان کے اعلیٰ وارفع معمولات کا ایک بانکا بھلکا روپ ہے۔ ان کی شاعری شاعری کے

ملا وہ بھی کچھ ہے۔ اس شاعری سے کچھ لینے کے لئے حضرت اکرم صاحب کے پاس کچھ دیر بیٹھنا بہت ضروری ہے۔ پھر پڑھنے والوں کو ایک اور ہی لطف آئے گا۔

اپنے نئے شعری مجموعے کا نام انہوں نے دیدہ تر رکھا ہے۔ بھیگی ہوئی آنکھوں سے کسی منظر کو دیکھا جائے تو وہ بدل جاتا ہے۔ ملک صاحب منظروں کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ ایک اور زندگی' بچی سوہنی زندگی' جو ملک صاحب گزار رہے ہیں۔ ان کی شاعری ایک اور طرح کے جذبے اور سلیقے سے پڑھی جانے والی شاعری ہے۔ یہ اعلی شاعری ہے کہ یہ ان کی شاعری ہے۔ ہزاروں سال رونے والی نرگس کے اضطراب اور انتظار کی خوشبو رلا ملا کے اپنے ٹوٹے پھوٹے دل میں بھر بھر کے اس دیدہ ور کو دیدہ تر سے دیکھیں۔ دیکھتے رہیں' ان کی باتیں سنیں پھر ان سے ان کی شاعری سنیں اور پھر یہ شاعری پڑھیں۔ ایک ایسا خواب ہے کہ اضطراب اور انقلاب کا فرق مٹ جائے۔

مل کے بیٹھے ہیں کریں آج نچھاور دل کو
آؤ اس در پہ کبھی خود سے ملاقات کریں"

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

O-----O-----O

کونسی ایسی بات ہوئی ہے!

امیر محمد اکرم اعوان کی نازک احساسات میں بھیگی ہوئی شاعری کا چھٹا مجموعہ' ایک بالکل مختلف عنوان کے تحت سامنے آیا ہے! جس کا انتساب ہے!

نسل نو کے نام

جن سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں!!

اس میں ان کے دوسرے شعری مجموعوں کے برعکس' صرف ایک عدد نعت شامل ہے۔ باقی تمام کی تمام شاعری' خوبصورت لب و لہجے میں کہی گئی غزلوں پر مشتمل ہے!

چھوٹی چھوٹی باتیں' آخر شب میں نور کی پھوار کی طرح گرتی ہوئی اوس میں لت پت ہو کر' اپنے قاری پر اک ایسے جہان کا در کھولتی ہیں' جہاں لفظ و معنی اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہیں۔ جہاں جذبے روایتی نہیں ہوتے' روائتیں جذبے بن جاتی ہیں۔ جہاں روشنی فقط سورج کا نام نہیں ہوتی' دردل کے طاق پر ٹمٹمانے والا چھوٹا سا دیا بھی روشنی کا بھرپور استعارہ بن کر سامنے آتا ہے'

جہاں دعا کی چوکھٹ پر آنسو سجدے کرتے ہیں' اور پیشانیاں ادائے عشق میں گم نظر آتی ہیں۔

کیا لکھوں' کیا کہوں' اس وقت بات مختصر ہی اچھی ہے کہ اس شعری کتاب میں دو اچھے لوگوں نے اپنی اچھی باتیں 'بڑے سلیقے سے کہی ہیں۔ منیر نیازی اور علی اکبر منصور کی آراء کے بعد 'ورق الٹیئے تو سامنے 'لطیف جذبوں' باتوں اور سوچوں کی ایک ایسی دنیا ہے 'جس میں گھوم پھر کر 'دیکھے بھالے بغیر 'آپ باہر نہیں نکل سکتے 'یہی اس اچھی کتاب کی خوبی ہے!!

منتخب اشعار

ملی ہیں خوبیاں انسان کو مدینے سے
چرائی پھول نے خوشبو وہاں پسینے سے
در حبیبؐ سے سیماب کو تلاش تو کر
وہ اور جائے گا اٹھ کر کہاں مدینے سے

☆☆☆

آج کسی سے بات ہوئی ہے
آدھی سی ملاقات ہوئی ہے

☆☆☆

نہ مل مجھ سے نہ الفت کا صلہ دے
نہ لکھ نامہ نہ تو عہد وفا دے
محبت کی نہیں تھی ہو گئی تھی

بھلاؤں کس طرح اتنا بتا دے

☆☆☆

اے ساکنان قرینۂ دل آؤ تو کبھی
اشکوں کی رہبری میں رہ انتظار تک
اک سلسلہ شکست کا ہوتا گیا دراز
نظروں کی بے رخی سے دلوں کے قرار تک

☆☆☆

شب دراز کو آخر سحر بھی ہونا تھا
کبھی تو آہ میں اپنی اثر بھی ہونا تھا

☆☆☆

تم اعتراف شکست وفا ہی کر لیتے
کسی کو زیر کسی کو زبر بھی ہونا تھا

☆☆☆

O-----O-----O

کونسی ایسی بات ہوئی ہے

ایک نئی فکر

امیر محمد اکرم اعوان کی شخصیت میں ایک عجیب سحر ہے ان کی موجودگی میں حاضر لوگوں کو ایک نئی طرح کی فکر اور بصیرت حاصل ہوتی ہے جو مروجہ افکار سے الگ اور بے حد پرکشش محسوس ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے مذہب اور عقل کو محض لباس کی طرح پہنا ہوا ہے اور خلق خدا کو دین اور علم نو سے خائف رکھنا جن کا پیشہ ہے امیر محمد اکرم اعوان کا عہد حاضر میں ہونا ایسے لوگوں اور ان کے پھیلائے ہوئے خیالات کی الجھنوں سے نجات کا سبب ہے۔

منیر نیازی

صوفی شاعر

مشرقی ادب میں تصوف کی شعری روایت اتنی جاندار ہے جسے عالمی ادب کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ رومی، بلھے شاہ، بابا فرید، باہو اور شاہ لطیف جیسے صوفی تخلیق کاروں نے عالمگیر انسانی قدروں سے مزین شعری روایات کو جنم دیا۔ ان صوفیاء کی زندگی انتہائی متنوع، عمیق اور رنج و الم کے حامل تجربات کا مرقع تھی۔ انکی زیست کا ہر لمحہ، انکی ہر سانس کربناک ریاضتوں سے وجود میں آئی۔ انکے اندر روح کی ایک وسیع کائنات ہوتی ہے جو ان کے باطن پر انفس و آفاق کے تمام تخلیقی در کھول دیتی ہے۔ اسی بنا پر ان کا کلام کسی مخصوص خطے اور وقت سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی ان حدود سے ماورا ہوتا ہے اور عالمگیر انسانی معنویت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی ذات، اپنی مٹی اور اردگرد کے انسانی ماحول سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور اپنے غموں کو دوسرے انسانوں کی مسیحائی اور روحانی بالیدگی اور تضادات میں گھرے ہوئے انسانوں کی بے سمتی کو سمت دینے کے لئے عمل میں لاتے تھے۔ صوفی ایک باعمل تخلیق کار ہوتا ہے جو شعور و عمل کی اعلیٰ ترین سطح پر فائز ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں اردو زبان میں ایسی متصوفانہ روایت کا وجود نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ اردو کی اساس میں کسی گہری معنوی اور علاقائی ثقافت یعنی مستحکم، مستقل ثقافت جیسی کہ پنجابی، سرائیکی اور سندھی کو عطا ہے، کا وجود ماننا مشکل ہے۔ اسی بنا پر اردو شاعری میں ابھی تک کسی عالمگیر روایت کا آغاز نہیں ہوا۔ پھر یہ ہوا کہ ہم متصوفانہ شعری روایت سے کٹ گئے اور ایک عرصہ تک اسی خلا میں بھٹکتے رہے۔ ہماری تہذیب ایک ایسے کردار سے محروم ہو گئی جو صوفی، شاعر اور مسیحا کا کردار تھا چنانچہ انسان "تنہائی" "اکلاپے" مغائرت اور تضادات کی صلیبوں پر جھولنے لگے۔ وہ اپنے سینے میں محبت ایمان اعتقاد کے چراغ جلانے کے بجائے ایک

بے سمت اور تاریک خلاء کے ہو گئے۔

فطرت کے قوانین میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب معاشروں، قوموں، تہذیبوں اور انسانی باطن میں خلاء در آئے اور بڑھتا ہی چلا جائے تو اسی خلاء سے کسی درخشاں ستارے کا ظہور ہوتا ہے جو کائنات کے انسانوں کے منتشر اجزا کو پھر سے جوڑ دیتا ہے۔

ہمارا ملک اور قوم دور حاضر میں اپنی تمام ملکی و قومی تاریخ میں ایک عذاب ناک انسانی بحران اور سماجی آشوب سے گزر رہے ہیں اور ہم تہذیبی زوال کے آخری کنارے پر پہنچے ہیں جہاں سے آگے اندھا خلاء ہے۔ اسی عصر میں امیر محمد اکرم اعوان جیسی روحانی شخصیت کا ظہور لازماً فطرت کے فیصلوں کی طرح ہے۔ ملک صاحب کی تمام زندگی کٹھن ریاضت سے عبارت ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو اور تنوع کا تجربہ اپنی ذات میں سمویا ہے۔ انہوں نے ترک دنیا کی روش یا بدھ کی ریاضت کا انداز نہیں اپنایا بلکہ انسانی رشتوں اور سماجی تغیرات کی چکی میں پس کر اور ہر منظر زیست کو جذب کر کے ریاضت کی جوت جلائی ہے۔ اس ریاضت نے انہیں ایسی بصیرت اور حکمت سے نوازا ہے جو دنیاوی اور ظاہری علوم سے ماوراء اور ارفع ہوتی ہے۔ یہ خود شناسی سے خدا شناسی کا سفر ہے۔ اور ایک خاص متصوفانہ وجدان و آگہی کا زندہ ہونا ہے۔ ملک صاحب کے ہاں دین و مذہب کا تصور محض نفسیاتی دفاع اور یک طرفہ سوچ کی طرح نہیں۔ وہ کہیں بھی دین کو ایک سماجی و نفسیاتی آڑ کے طور پر نہیں لیتے بلکہ ان کے ہاں ایک خداداد، واضح اور عملی نقطۂ نظر موجود ہے جس سے وہ زندگی کے تمام اداروں اور انسانوں کی تعبیر و تفہیم اور تطہیر کرتے ہیں۔

میرے نقطۂ نظر کے مطابق زیست نے اولاً ملک صاحب کے باطن پر درد و الم کے دروازے کھولے۔ انہوں نے ہر انسانی کرب کو اپنی اذیت کی طرح قریب سے دیکھا، محسوس کیا اور بھیگتا۔ ہمارے نزدیک اسی درد کی کائنات کا انسان کے باطن میں افشا ہونا ہی تخلیقی عمل کی اساس ہے جو روحانیت، تخلیق اور انسانیت کی معراج کی طرف لے جاتی ہے۔ ملک صاحب کی ساری بصیرت ان کی شخصی واردات عمیق مشاہدہ اور عملیت پسندی ہے۔ اور یہی عناصر ان کی تخلیق شعر میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری تصوف کی شعری روایت کا ایک جدید ترین احیاء ہے جس میں انسانی ذات سے لے کر معاشرے اور انسانی تہذیب تک کو

بالیدہ کرنے کی قوت موجود ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

جل گیا جب دل تو آئینہ بنا
ایک جیسے ہو گئے ہجر و وصال

☆☆☆

کئی درد دریا ہیں جو زندگی میں
ہمیں غم کا ساگر بنا ڈالتے ہیں

☆☆☆

طبیبوں کو سیماب کیا ہو گیا ہے
کہ مردے کے منہ میں دوا ڈالتے ہیں

☆☆☆

اڑ رہا ہوں بادلوں سے بھی پرے
گرچہ میں اک طائر مجبور ہوں

☆☆☆

ٹوٹ کر اشکوں کی لڑیاں جب گریں
ان کو سینے پر سجا لیتا ہوں میں

☆☆☆

دوجہاں کی وسعتوں کو بعض وقت
اپنی بانہوں میں چھپا لیتا ہوں میں

☆☆☆

ہنس کے ملتا بھی ہوں لوگوں سے فقیر
چھپ کے آنسو بھی بہا لیتا ہوں میں

☆☆☆

علی اکبر منصور

مرشد محمد اکرم اعوان

منیر نیازی

شیزان میں مرشد محمد اکرم اعوان کا لیکچر تھا اور مجھے محمد اجمل نیازی کی معرفت اس محفل میں شرکت کا موقع ملا۔ میں اور میرے جیسے کئی اور لوگ دنیاوی اور دینی امور سے ناواقفیت کے احساس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے عام زندگی میں اکھڑے اکھڑے اور بے چین سے رہتے ہیں ایسی مجالس میں شرکت سے انہیں کچھ تسکین اور ذہنی اور روحانی ادھورے پن کے احساس سے کچھ نجات حاصل ہوتی ہے۔ اس محفل میں شہر کے دانشور خاصی تعداد میں موجود تھے اور سبھی حضرت محمد اکرم اعوان کی گفتگو سے متاثر تھے۔ دوسری مجلس ڈاکٹر چیمہ کے گھر پر ہوئی جہاں ملک اکرم اعوان آئے اور مشہور گلوکار آصف جاوید نے ان کا کلام گا کر سنایا ہمارا مذہبی شخصیات کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ مذہبی اور اخلاقی نظریات کے سلسلے میں بہت سخت اور متعصب ہوتے ہیں اور ان کی شخصیت اور ان کی موجودگی خوف کا باعث بنتی ہے ان کی صحبت میں ان سے کچھ حاصل کرنے والے

خواہش رکھنے والے Tense رہتے ہیں۔ مگر اکرم اعوان صاحب کشادہ دل اور لوگوں میں ان کی سطح پر ان میں گھل مل جانے والوں میں سے ہیں ان کی علمیت سے مرعوب ہونے کے بجائے ان کی دانش سے اپنائیت کی خوشبو آتی ہے ڈاکٹر چیمہ نے بتایا کہ وہ لوگوں کے مسائل میں بہت دلچسپی لیتے ہیں اور ان کے مشکل وقت میں ان کے کام آتے ہیں۔ وہ ایسے مسلمان ہیں جو دنیا میں اسلام کا غلبہ چاہتے ہیں اس کے لئے مسلمانوں کو لڑنا ہی کیوں نہ پڑے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ان کے مرید دنیا کے ہر ملک میں ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں لاہور باکمال لوگوں کے سلسلے میں ہمیشہ سے خوش نصیب رہا ہے۔ مرشد نے لاہور میں بھی اپنا گھر بنایا ہے ٹاؤن شپ میں اویسیہ کالونی میں۔ ان کے وفاداروں میں ادیب شاعروں کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کی کثیر تعداد ان کی تعلیمات سے فیض یاب ہوتی ہے۔ کرنل مطلوب۔ کرنل قیوم شوکت خانم ہسپتال کے چیف پیتھالوجسٹ ڈاکٹر چیمہ۔ اجمل نیازی۔ فرحت عباس شاہ۔ خاص عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ مشہور شاعرہ بشریٰ اعجاز ان پر ایک کتاب مرتب کر رہی ہیں۔

O..........O..........O

سیماب رنگ

بشریٰ اعجاز کا بھیجا ہوا نو کتابوں کا ایک بنڈل بہت دن سے میرے پاس دھرا ہے
کچھ ریزہ ریزہ کام اور کچھ رمضان المبارک کے خصوصی معمولات' میں اس بنڈل کو کھول نہیں سکا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ نظم و نثر کی یہ نو کتابیں مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے نتائج قلم پر مشتمل ہیں اور بشریٰ اعجاز صاحبہ کا حکم ہے کہ میں ان پر ایک عمومی تاثر سپرد قلم کروں۔

مولانا سے میری دو ایک سرسری ملاقاتیں پہلے سے تھیں اور ایک نسبتہً تفصیلی ملاقات کچھ ہی عرصہ ہوا، بشریٰ اعجاز صاحبہ ہی کے دولت کدے پر ایک محفل شعر و سخن میں ہوئی جس کی صدارت مولانا نے فرمائی۔ یوں مجھے ذرا قریب سے ان کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ مولانا کی شخصیت کا مجموعی تاثر تنوع' وسیع المشربی' فراخ دلی اور ایک تپاں سیمابیت کا تھا جس کی تصدیق ان کے تخلص "سیماب" سے بھی ہوئی۔

آج میں نے اس بنڈل پر بندھا ہوا خوبصورت ربن کھول ہی لیا اور کچھ وقت اس "نہ افلاک" کی سرسری سی سیر میں بسر کیا۔ خاکسار اور خاک نشین کو بالآخر خاک پر ہی اترنا تھا۔ مگر سیر افلاک نے مزاج میں ایک تحرک ضرور پیدا کر دیا جس سے قلم تھامنے اور تشنہ و بے ربط مگر بے ساختہ سے چند تاثرات لکھ ڈالنے کا حوصلہ ملا۔

مولانا کی شخصیت فن اور پیغام کے حوالے سے ان کتابوں کے دیباچوں میں سید ضمیر جعفری کرنل محمد خاں' منیر نیازی' کرنل محمد حامد' اور ڈاکٹر اجمل نیازی جیسے اہل قلم نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں کسی اضافے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اجمل نیازی صاحب کی تحریر دیکھتے ہوئے' مولانا کی لطافت احساس اور صلابت کردار کے حوالے سے میرا ذہن علامہ اقبال کے اس قطعے کی طرف منتقل ہوا۔

تنے پیدا کن از مشت غبارے
تنے محکم تراز سنگین حصارے
درون او دل درد آشنائے
چو جوئے درکنار کوہسارے

دیکھتا کیا ہوں کہ دو سطر بعد یہی قطعہ اجمل نیازی صاحب نے درج کر رکھا ہے۔ محسوس ہوا کہ اگر میں نے ان سب دیباچوں کو تفصیل سے پڑھ لیا تو میرے پاس شاید کہنے کو کچھ نہ بچے لہٰذا سرسری سی نگاہ بھی موقوف کی اور ذاتی تاثر کو قلم برداشتہ لکھ ڈالنے کی ہمت کی۔

مولانا سے ملاقات کے دوران جس تنوع کا احساس ہوا تھا ان کتابوں میں اس کا مزید پھیلاؤ سامنے آیا۔ مثلاً یہ کہ یہ صوفی شاعر سیر کے علاوہ شکار سے بھی شغف رکھتا ہے اور شکار کی روداد ایسی تصویریت کے ساتھ رقم کر سکتا ہے کہ پڑھنے والا خود اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس رواروی میں بھی میں برفانی چوٹیوں کے ہیرو سے آنکھ چرا کر نہیں گزر سکا۔ میں نے برف زار کے یخ بستہ ماحول میں اس کے گرم خون کے نشے کو محسوس کیا جس کے زور میں وہ ایک کھلنڈرے بچے کی طرح پنجوں سے برف کے گولے بناتا ہوا نشیب سے فراز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر پے در پے گولیوں کی زد میں آنے کے بعد بھی اس کی نگاہوں نے دم توڑنے سے پہلے اس سمت کا جائزہ لیا جدھر

سے یہ حملہ ہوا تھا۔

محسوس ہوا کہ مولانا اصل میں شکاری ہی ہیں اور یہ نظم و نثر سب ان کے تیر و نشتر اک ہیں جہاں ملے وہ دل زندہ کا شکار کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال نے بھی تو فرمایا تھا۔

حرف پیچا پیچ و حرف نیشدار
تا کنم عقل و دل مرداں شکار

مولانا کی شخصیت کے پھیلاؤ اور سمٹاؤ دونوں کی کلید ان کے سفر ناموں میں ملتی ہے ان کی وسیع المشربی دراصل خود اعتمادی سے پھوٹتی ہے جو انہیں کسی بھی ماحول میں درانہ در آنے، لیکن اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

سازی اگر حریف یم بے کراں مرا
با اضطراب موج سکون گہر بدہ

ان کے یاں وسعت میں ایک مرکزیت ہمہ وقت موجود رہتی ہے یوں جیسے مختلف محیطوں کے بہت سے دائرے بنا دے جائیں لیکن پرکار کا قدم ایک ہی جگہ جما ہوا ہو۔

آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور یہ نشیمن وہی ہے جس کا ذکر اقبال یوں کرتے ہیں

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نواخواں از سرور عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ

چنانچہ دیار حبیب کی روداد سفر میں ان کا سارا پھیلاؤ سمٹ کر ایک نقطے میں گم ہو تا نظر آتا ہے اور وہ اساسی زاویہ نمایاں ہو جاتا ہے جس کے روزن سے وہ تمام وسعتوں کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھ سکتے ہیں اس سرزمین میں پہنچ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا کے ہاں عقل اور عشق کا کردار وہی ہے جو اقبال نے متعین کیا تھا۔

عقل ہے تیری سپر ' عشق ہے شمشیر تری

اب یہ جری شکاری خود ایک بسمل کے روپ میں دکھائی دیتا ہے جو ہر پرانی چیز کو پہچان کر واد یتا ہے' جسے چٹانوں کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ النور نے وہ قدم دیکھے جن تک رسائی اس کے لئے معراج کی حیثیت رکھتی ہے' جو احد کے دامن میں کھڑے ہو کر گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑاتا ہے۔ غبار جنگ میں ٹاپوں سے اڑتی چنگاریوں کو دیکھتا ہنہناہٹوں کو سنتا اور تنوں سے جدا ہو کر گرتے سروں کا مشاہدہ کرتا ہے۔

مولانا اپنی شاعری کے بارے میں بار بار یہ کہتے ہیں کہ معلوم نہیں یہ شاعری ہے بھی یا نہیں۔ انہیں شدت سے احساس ہے کہ لغت و عروض کی فروگزاشتیں ان کے کلام میں پائی جا سکتی ہیں۔ تاہم انہوں نے یہ بکھیڑا نہیں پالا کہ وہ اپنے بہت پڑھے لکھے ارادت مندوں میں سے کسی سے ان برجستہ جذبوں کی نحو کا پیٹی کرا لیں۔ انہوں نے اس لالہ صحرائی کو اپنے زور پر کھلنے دیا ہے۔ انہوں نے شعر کے وزن یا لفظ کے تلفظ میں کہیں کہیں فرق آجانے کو گوارا کر لیا ہے لیکن اپنے دل کی فطری لے کو شعوری صدابندی سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جنگل میں اپنے جوش باطن سے پھوٹ آنے والے درخت کی کج مج ہیبت باغبانوں کی تراش خراش سے مجروح ہو جاتی ہے۔ مولانا کی شاعری کی اثرانگیزی اسی فطری ابال کے سبب سے ہے جو حسن تزئین سے نہیں۔ شدت احساس سے پیدا ہوئی ہے۔

مولانا کے کلام کا تمام تر تنوع بھی دراصل اسی ایک محور پر گردش کرتا ہے جوان کا مرکزۂ ذات ہے اور اسی سے وہ ساری تڑپ پھوٹتی ہے جو ان کے مزاج کو سیمابیت اور کلام کو کسی مشاطگی کے بغیر تاثیر عطا کرتی ہے۔

بادل اٹھے ہیں قطار اندر قطار
دیکھ ویرانوں یہ انڈی ہے بہار
کار خورشید تپاں پیہم سفر
کر نہیں سکتا یہ اک پل انتظار
کون روکے گا عنان وقت کو
چلتے چلتے بیت جائے گی بہار
یہ تڑپ سیماب کی قسمت میں ہے
آ نہیں سکتا کبھی اس کو قرار

خورشید رضوی

۲۸۔رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

۶۔جنوری ۲۰۰۰ء

ایک خوش نوا فقیر

کہتے ہیں کہ شاعر تمید الرحمان ہوتا ہے۔ مولانا اکرم اعوان شاعری کی دنیا میں فقیر بیماب اویسی کے نام سے معروف ہیں' دین اور شاعری دونوں میں تمید الرحمان ہیں۔ یوں ان کی شخصیت دو آتشہ ہو گئی ہے میں ان کی تحریک کا دیدہ اور شاعری کا دیدہ گرویدہ ہوں۔ مولانا کی دونوں حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔

اپنے اولیں مجموعہ کلام ''نشان منزل'' میں حرفے چند کے عنوان سے مولانا رقم طراز ہیں۔ ''کیا یہ نعتیں، نظمیں اور غزلیں جو ایک فن شاعری سے ناآشنا' اردو ادب سے بے گانہ اور محض درد مند دل سے نکلے ہوئے نالے کو شعر کہنے والے کی صدائیں وہ کام کر جائیں گی جس کے لیے انہیں چھپوانے اور نوجوانان قوم تک پہنچانے کی سعی کر رہا ہوں؟ اگر ایسا ہو جائے تو مجھے اس بات کی فکر نہ ہو گی کہ میرے شعروں کے اوزان اور غزلوں کی بحر میں کیا کمی رہ گئی یا میرے شعر واقعی شعر تھے بھی یا شعر کے نام پر افکار پریشان جمع کر تا رہا'' آگے چل کر لکھتے ہیں ''اللہ کرے یہ الفاظ اگرچہ اس قابل تو نہیں مگر دلوں کو عظمت الہی عشق رسول اور حقانیت اسلام کی

طرف متوجہ کر سکیں۔۔۔۔۔۔۔۔"

ان اقتباسات کے بین السطور مولانا کی شاعری کا مقصد و منہاج اور حدود (Par-ameters) صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ جو ہمارے نزدیک کچھ یوں ہیں۔

ا۔ مولانا نے شاعری برائے شاعری نہیں کی بلکہ یہ تین مقاصد اس کے محرک بنے ہیں

(الف) عظمت الٰہی (ب) عشق رسول (ج) حقانیت اسلام

سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ مقاصد وہ اپنی انقلابی تحریک کے ذریعے بھی حاصل کر سکتے تھے تو پھر ان کو شاعری کے میڈیم کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اور شاعری بھی وہ جو روائتی شاعری ہے اور بیشتر رنگ مجاز میں رنگی ہوئی ہے۔ اس کا جواب مولانا کے متذکرہ بالا اقتباسات میں موجود ہے۔ اس کے پس منظر میں فکر اقبال کام کر رہی ہے۔ اقبال نے بھی تو یہی کہا تھا کہ۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

مولانا نے اپنے شعروں کو افکار پریشان گردانا ہے تو ایک طرح سے یہ موقف فکر اقبال سے ہم آہنگ ہے علامہ اقبال کے مخاطب زیادہ نوجوانان قوم ہے۔ اسی طرح مولانا بھی اپنی فکر کو شاعری کے (مقبول اور معروف) میڈیم کے وسیلے سے نوجوانان قوم تک پہنچانے کی سعی کر رہے ہیں۔

مولانا کے کلام پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بیشتر نظمیں اور غزلیں زمینی یا ہوائی سفر کے دوران لکھی ہیں یا کسی ریسٹ ہاؤس میں قیام کے دوران قلم بند کی ہیں۔ یوں مولانا نے اپنے "فارغ" اوقات کو کار آمد مشغلے کے حوالے کر دیا ہے۔ ان کا کلام خواص کے لیے نہیں عوام کے لیے لکھا گیا ہے اور اس میں جذبہ، فکر، مشاہدہ اور تجربہ سب ایک تناسب اور توازن کے ساتھ آمیز ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں

از دل خیزد بر دل ریزد۔ بقول اقبال۔

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

سو مولانا کا کلام جوان کے قلب ذہن اور روح کی گہرائیوں سے نکلا ہے' قاری کے قلب' ذہن اور روح کو مس کرتا ہے تو قاری عجیب کیف و سرور محسوس کرتا ہے۔ مولانا جانتے ہیں کہ نئی نسل شاعری خصوصاً غزلیہ شاعری کی دلدادہ ہے۔ اس لیے یہ نسل مولانا کی اولین مخاطب ہے۔ آپ کے مجموعہ کلام "کون سی ایسی بات ہوئی ہے" کا انتساب دیکھئے۔

"نسل نو کے نام

جن سے ہماری امیدیں وابستہ ہیں"

ہم نے اس مجموعے کو کھنگالا تو بظاہر اس میں نسل نو کے نام کوئی پیغام نہ پایا شروع سے آخر تک رنگ مجاز غالب ہے۔ بلکہ ایک غزل تو حسرت موہانی کی "فاسقانہ" شاعری کے ذیل میں آتی ہے ایک مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

ہم کو حسن و عشق کا اب تک فسانہ یاد ہے

ساتھ تیرے جو گزارا وہ زمانہ یاد ہے

پوری غزل حسرت کی اس غزل کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے

ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

مولانا حسرت کے اس فلسفے پر کاربند نظر آتے ہیں

کیا حسن پرستی بھی کوئی عیب ہے حسرت

رہنے دو جو اخلاق کی تقید کڑی ہے

مولانا نے مختصر سے عرصے میں پانچ چھ شعری مجموعے یونہی ترتیب نہیں دیے ان مجموعوں کے انتسابات پر غور کیجئے تو ان کی معنویت اور مقصدیت کھل جاتی ہے۔

دیدہ تر کا انتساب دیکھئے۔

"اللہ کے اس بندے کے نام جس نے مجھے جینا سکھایا۔"

سواس مجموعے کے ذریعے ایک طرح سے مولانا اپنے قاری کو جینے کا قرینہ سکھا رہے ہیں۔ جینا ایک مشکل فن ہے دوسروں کو جینا سکھانا تو مشکل تر ہے۔ سو مولانا نے اس مقصد کے موثر اظہار اور اپنی فکر کے ابلاغ نامہ کے لیے شعر کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ فرماتے ہیں "اللہ کرے جو چاہتا ہوں وہ کہہ سکا ہوں اور جو کہہ گیا ہوں وہ کسی کی سمجھ میں آسکے تو میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا کہ بندہ صرف بات پہنچا سکتا ہے باقی سب توفیق اللہ کو ہیں"

اب آس جزیرے کا انتساب ملاخط کیجئے

"اس کے نام جسے میں نے سوچا بہت ہے ابھی دیکھا نہیں"

اس کے باوجود دیدار یار کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر لیتے ہیں مثلاً کہتے ہیں

تیرا نام لب پر، تیری یاد دل میں
چلو آج کی عید ہم بھی منائیں

یارات کی سنتا ہے جب سر گوشیاں۔۔۔۔۔پاس تجھ کو اس گھڑی پاتا ہے دل

معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا مسند وعظ و ارشاد سے نیچے اترتے ہیں۔ تو کسی موٹر کار کسی جہاز یا کسی گوشہ تنہائی میں۔ فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اور اس کیفیت میں اپنے محبوب سے زبان شعر میں ہم کلام ہو جاتے ہیں۔ بقول فراق

تو مخاطب بھی ہے قریب بھی ہے۔۔۔۔تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

فرماتے ہیں۔ آبھی جاؤ کہ ڈھل رہا ہے دن   دشت ہجراں میں شب نہ ہو جائے

جب محبوب نظر نہیں آتا تو مولانا دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں

ہے دعا تیرے لیے میری ندیم رب کرے تو عشق میں ہو مبتلا
(میری ندیم کی ترکیب پر قارئین ضرور چونک اٹھیں گے)

معلوم ہوتا ہے کہ دین' اخلاق اور ہندو عظمت کے حصار سنجیدگی میں رہتے رہتے کبھی کبھار مولانا ایکدم یہ حصار توڑ دیتے ہیں اور اس لیے پاسبان عقل کو رخصت دے کر حضرت عشق کے ہم جلیس بن جاتے ہیں۔ انھی وجدانی لمحوں میں مولانا کی کشت جاں میں شعر اگتے ہیں اور مولانا کا کشکول ان بو گلوں پھولوں اور پھلوں سے بھرا جاتا ہے۔ تو مولانا یہ سوغات لے کر اپنے عقیدت مندوں کے درمیان پہنچ جاتے ہیں۔ جن کے مشام جان ان پھولوں کی خوشبو سے معطر ہو جاتے ہیں۔ میاں محمد بخش صاحب سیف الملوک میں ایسے ہی فقیر منش درد مندوں کے بارے میں کہتے ہیں

درد منداں دے سخن محمد دیہن گواہی حالوں
جس دے پلے پھل بدھے ہوون آوے باس رومالوں

ذرا دیکھئے اس خوش نوا فقیر کے کشکول میں اپنوں کے لیے کیسے کیسے گوہر یک دانہ موجود ہیں

غم عاشقی سلامت یہ غضب کا فتنہ گر ہے
مری آرزو چرالی، مرا دل بدل دیا ہے

آجاؤ موسموں میں آ جائے گا نیا پن
ورنہ گلوں کا موسم ویران جا رہا ہے
آنکھ بیمار محبت کی کھلے تو اس کو
دے کے وعدے کی دوا آپ سلا دیتے ہیں

آ کبھی دیکھ فقیروں کی جدائی کا سماں = بزم تو بزم ہے جاتے ہیں جہاں سے کیسے ؟

راہ میں بیٹھے ہیں تری خاطر
کیا غرض کون آتا جاتا ہے
نقد جاں ہے فقط تری خاطر
دوسروں سے ادھار کرتے ہیں
دل بیلے میں کتنی ہیریں بیٹھی کریں سنگار کتنے راگ الاپے مرلی رانجھے کئی ہزار
نعت لکھنے کا قرینہ چاہیے
نور ہو جس میں وہ سینہ چاہیے
زندگی مانند گرداب بلا
نام کا ان کے سفینہ چاہیے
دنیائے محبت کی روایات پڑھی ہیں گزری ہیں جو عشاق پہ آفات کڑی ہیں
کہہ دو اک بار میں تمہارا ہوں میں تمہارا ہوں میں تو کہتا ہوں
ہم ہی ظالم ہیں ٹھیک کہتے ہو اپنے دامن پہ بھی نظر کر لو
یہ کس کے عارض گلگوں کا ہے داغ اپنے دامن پر
ابھی تو سو کے اٹھے ہیں' یہ کون آیا تھا خوابوں میں

پروفیسر محمد اکرم طاہر
ڈین(ر)
یونیورسٹی آف آزاد جموں وکشمیر

اکرم اعوان + مولانا + پیر!!

زبیر رانا

اکرم اعوان صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات نوجوان نسل کے شاعر فرحت عباس شاہ نے کروائی، میں نے ملاقات سے پہلے اسکے ساتھ جاتے ہوئے اسے کہا تھا لگتا ہے تم مجھے ایک ایسے مولوی سیاستدان کے ساتھ ملوانے جا رہے ہو جس نے اپنی جماعت کا نام ہی مذہبی رکھا ہے اور عربی زبان میں رکھا ہے جبکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں قرآن شریف بھی پنجابی میں پڑھنا چاہئے۔ انہی باتوں میں میں نے فرحت سے کہا دیکھو پیپلز پارٹی کی قیادت نے اگرچہ عوام کے ساتھ بے وفائی کی ہے لیکن عوام کی اصل جماعت پیپلز پارٹی ہی ہے اور وہ اس لئے کہ اس جماعت کے ووٹروں اور کارکنوں کے پاس ایک تال (Rhthem) موجود ہے جو ہمارے کلچر کی بنیاد ہے باقی جماعتوں کے پاس وہ نہیں ہے۔ یہی بات میں نے اکرم اعوان سے یوں کی کہ مذہبی جماعتیں جب تکبیر کا نعرہ لگاتی ہے تو ان کا ردھم ایسا ہوتا ہے جیسے پارٹی

لیفٹ رائیٹ لیفٹ رائیٹ کے بول پر پریڈ کرتے ہوئے فوجی بینڈ بجایا جاتا ہے۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے لوگ جب ڈھول ڈال کر نعرے لگاتے ہیں تو ان کا ردھم بھی اس ڈھول کا ہوتا ہے جو دھمال کے ساتھ بجایا جاتا ہے اور پھر ان کا ردھم محرم میں تعزیہ کے جلوس میں ہونے والے ماتم کی زنجیروں کا ردھم بن جاتا ہے۔ جبکہ ملاں ازم میں ایسا ردھم نہیں ہوتا۔

اکرم اعوان نے کہا" ملاں کے پاس دل کے جذبات و احساسات نہیں ہوتے کیونکہ ملاں پتھر ہوتا ہے اسلئے اس کا ردھم بھی پتھریلا ہے۔

میں نے کہا"ملک صاحب گورو نانک کے ساتھ آپ کے کیسے تعلقات ہیں انہوں نے کہا ہر فقیر کے ساتھ میری یاری ہے' میں تو یہ کہتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ بھی یاری لگانی چاہئے' اللہ ہمارا یار ہے اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے اپنے پنجابی گیت سنائے اور پھر اکرم اعوان، فرحت عباس اور میرے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔

اس کے بعد میں نے ان کی کتابیں پڑھیں اور ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی پڑھیں ملکی معاشیات کے بارے میں ان کے جریدہ المرشد میں ان کے خیالات بھی پڑھے اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ تصوف کے تو بہت سے نقطہ ہائے نظر ہیں کئی قسم کے تصوف پائے جاتے ہیں ان میں سے کوئی ایک اکرم اعوان نے بھی چن لیا ہو گا۔ میں نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے تضاد کے حوالے سے ان کی جو باتیں پڑھیں اور سنیں ان سے یہی محسوس کیا کہ وہ وحدت الوجود کے نظریہ کے علمبردار ہیں اس کی مختلف لہروں شاخوں اور کڑیوں پر بات کرنے کے لئے بہت طویل مضمون چاہئے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بلھے شاہ کی ملامتی "فکر" اور وارث شاہ کی لکھی ہوئی "ہیر" میں پیش کئے گئے فلسفہ کو ایک ہی تسلسل میں دیکھنے والا ایک چھوٹا سا طالب علم ہوں اور اسی سے باہر نہیں نکلا' اس لئے میں نے اکرم اعوان کی شاعری اور نثر کو

اسی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اکرم اعوان کے نظریات کا بلھے شاہ اور وارث شاہ کے ساتھ ہمدردانہ رشتہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اکرم اعوان میں بلھے شاہ قطعاً نہیں پایا جاتا اور نہ ہی اکرم اعوان اس نظریہ کے علمبردار ہیں جو وارث شاہ نے ہیر میں پیش کیا ہے۔

میں نے ان کی شاعری میں جو رومانویت دیکھی ہے اسکے کئی پہلو اردو شاعری کی اس سائیکی میں پائے جاتے ہیں جو ہمارے شہروں کی مڈل کلاس پر چھائی ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ ان کی پنجابی شاعری میں کہیں کہیں لوک شاعری کا اثر موجود ہے۔

اپنے اس چھوٹے سے مضمون میں، میں ان کے شعروں کے حوالے دینے لگوں تو یہ بہت طویل ہو جائے گا تاہم مڈل کلاس کی اردو شاعری کے معیاری رشتوں پر انھوں نے طنز بھی بڑے دلچسپ کئے ہیں اس لئے ان کی بزم یاراں میں ہرجائیت کوئی دکھ بن کر نہیں آئی اور وہ اردو پرستوں سے متاثر ہو کر اپنا تخلص سیماب اویسی رکھنے کے باوجود اسی مڈل کلاس کی ہرجائیت کا تمسخر بھی اڑاتے ہیں۔

ہم ڈھونڈتے رہے تجھے کوئے رقیب میں
بیوی نے راہ دیکھی ہماری تمام رات

یوں پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل کی معاملہ بندی میں ملک صاحب نے محبوب کو بھی ہرجائی سمجھا تو ٹھیک ہی سمجھا اور عاشق کو بھی ہرجائی کہا تو ٹھیک ہی کہا۔

اکرم اعوان نے نعت لکھتے ہوئے نبیؐ آخر الزمان کے ساتھ ایسا تعلق نہیں بنایا کہ ان کی سیرت کو کسی آمر کا کردار بنا دیں اکرم اعوان کی نعت میں نبی کریمؐ کو خیرات بانٹنے والے اس سخی پیر کی طرح نہیں پیش کیا گیا۔ جس کی امت اس کے سامنے گداگر نظر آتی ہو۔ کیونکہ اکرم اعوان جب خدا سے یاری لگانے کی بات کرتے ہیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ نبی کریمؐ کو ایسا آقا سمجھیں جو امت کو غلام بنا لیتا ہو بلکہ ان

کی نعتوں میں جگہ جگہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی کریمؐ تو غلاموں کو آزادی دلانے والی ہستی ہیں ان کی امت کارواں ہے اور وہ میر کارواں ہیں۔

سمندر شوق میر کارواں ہے
یہ عاصی پھر تیرے در کو رواں ہے

اس کے ساتھ ہی یہ خصوصی امر سامنے آتا ہے کہ اکرم اعوان نے تمام نبیوں کو ایک کارواں ہی سمجھا اور ان کے میر حضرت محمدؐ کو سمجھا ہے اگرچہ یہ کارواں چاندوں کا ہے جس کی قیادت سورج کے پاس ہے۔

ہر چاند روشن اپنے اپنے عہد کا
تو وہ سورج جس سے رخ ہر چاند کا روشن ہوا

ان نعتوں اور کئی نظموں میں نبی آخر الزماں کے ساتھ اکرم اعوان وہ رشتہ نہیں بنا سکے جو بلھے شاہ وارث شاہ اور مادھو لال حسین کے کلام میں پایا جاتا ہے کیونکہ ان ملامتیوں نے استعارہ استعمال کیا اس کو رانجھن یار اور جوگی کے لفظوں میں بیان کیا۔

اکرم اعوان نے اپنی شاعری میں ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ تصوف کے جنوں میں انھوں نے دنیاوی رشتے ترک کر دیئے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے گیت غزل اور نظم میں اپنے دنیاوی محبوب کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں اور کئی بار اس سے بچھڑ جاتے ہیں تو اپنی خالی اداس بانہوں کا کرب بیان کرتے ہیں، اپنے جسمانی رشتے کو قائم رکھتے ہیں اور تصوف کے نام پر شاعری کو بے اثر نہیں کرتے۔ ان کا محبوب شرارت بھی کرتا ہے اور غلطیاں بھی کرتا ہے اور گپیں بھی مارتا ہے اور لاڈ بھی کرتا ہے اس لئے ہر ایک محبوب کو خدا یا نبی کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

شاعری میں اکرم اعوان کے اندر ایک نو عمر لڑکا بھی موجود ہے اور لڑکی بھی۔

تھا کبھی ایسا بھی جب ہم نے تجھے دیکھا نہ تھا
وہ بہانے سے تیرا ہر بار آنا یاد ہے
وہ ملاقاتیں بدل کر ڈھل گئیں تھیں عشق میں
اور پھر ہر بار ملنے کا بہانہ یاد ہے
وہ ترا رو رو کے آخر چھوڑ جانا ایک دن
اور وہ چٹھی کہ اب یاں، پر نہ آنا یاد ہے

کل چلتے چلتے پوچھا تھا کیا آپ بھی ہم سے روٹھ گئے
وہ زیر لب مسکائے تھے نہیں ایسی کوئی بات نہیں

ایسی اور بہت سی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر ملایان دین اکرم اعوان کو ایک کھلنڈرا نوجوان کہہ سکتے ہیں مجھے تو تب اچھا لگتا اگر مجھے دیہاتی کلچر میں عالم بننے کی راہ پر چلتا ہوا نوجوان وارث شاہ کی ہیر رانجھے کی پیروکاری کرتا نظر آتا یہ کام واقعی مشکل ہے یہاں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے عشق میں دھمالیں ڈال ڈال کر رقص فنا کرنے والے لوگوں کی تال میں مجھے بلھے شاہ کے یہ لفظ سنائی دیتے رہتے ہیں۔

اک رانجھا مینوں لوڑی دا

کن فیکونوں اگے دیاں لگیاں نیوں نہ لگڑا چوری دا
پیاراں والیاں دے نین سلونے سوہا دوپٹہ گوری دا۔

میرے ساتھ اکرم اعوان نے جو باتیں کی تھیں وہ مجھے یوں اچھی لگی تھیں کہ بندہ ملازم کے مقابلے میں تصوف کا نعرہ لگا رہا ہے لیکن ملک صاحب کی اردو شاعری کا ڈکشن، لہجہ اس مفعول سی رومانویت میں پھنس گیا ہے۔ جس کا رعب ہم پر سرکاری ریڈیو، ٹیلی ویژن اور مہاجر اردو بازوں نے نافذ کر دیا اور ہم شہروں کے مڈل کلاس کی خاطر اپنے رانجھے جوگی کو شہری بابو بنانے کے چکر میں پڑ گئے

اکرم اعوان کے پنجابی شعروں میں اپنے کلچر کا اثر موجود ہے انہیں کوئی رانجھا جوگی دکھائی دے گیا تو شاید ادھر چل پڑیں تاہم میرا جی کرتا ہے اکرم اعوان کو یہ مشورہ دوں کہ مرزا جٹ بن کر تیروں کی جنگ لڑنے کے بغیر عشق نہیں ہو سکتا رانجھے کی مواج مرزا بن کر ہی ہوتی ہے۔

O..........O..........O

بابِ صحافت

جناب امیر ملک محمد اکرم اعوان

کے گاہے گاہے ملکی اخبارات میں چھپنے والے بیانات سے سرخیاں' مختلف موضوعات پر کہی گئی بصیرت افروز باتیں' دانش اور حکمت میں گندھی باتیں۔ باتیں دلکش ہیں' قیمتی ہیں' اچھی ہیں' مگر کیا کریں۔

کتاب کی ضرورت' ہماری مجبوری ہے' سو ان اچھی باتوں کو دانش' حکمت اور بصیرت کے بولوں کو کاٹ چھانٹ کر پیش کرنا پڑ رہا ہے' ایسے کہ ان کا مفہوم متاثر نہ ہو' اور مختصر بھی ہو جائے۔ دیکھئے معجز بیانی کے کرشمے کہ' ہماری کاٹ چھانٹ' ان کے حسن کو متاثر کرنے میں کتنی ناکام رہی ہے۔

موجودہ نظام

آج حکومت کو انگریزوں کے دور کی سرکار کی طرف سے دی جانے والی تمام جاگیریں واپس لے لینی چاہیں۔

"جنگ" ۔ "جرات"۔

85 سے 96 تک چار اسمبلیاں ٹوٹ چکی ہیں لیکن آج پھر وہاں وہی لوگ بیٹھے ہیں اور اب قوم کو خانہ جنگی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

"نوائے وقت"۔ "وفاق"۔

'بابو' ہو یا 'ٹی ٹی' موجودہ نظام کی بساط لپیٹنے کے بعد ہی ملک اور قوم کے مسائل حل ہو سکیں گے۔

موجودہ نظام کا ساتھ دینے کا مطلب جہنم کا پیٹ بھرنا ہے۔ اس نظام کو اٹھا کر بحیرہ عرب میں پھینک دیں۔

۔ "خبریں"۔

ہمارے ہاں جمہوری نظام اس لئے کامیاب نہیں کہ یہاں شرح خواندگی بہت کم ہے۔

۔ "جنگ"۔

جب عدالتیں غیر اسلامی ہوں' شہادت کا نظام غیر اسلامی ہو' تفتیش کا طریقہ کار غیر اسلامی ہو پھر فیصلہ اسلامی کیسے ہو سکتا ہے۔

۔"نوائے وقت"۔"وفاق"۔

ملک میں وسائل کی کمی نہیں بلکہ ان کی تقسیم میں بد دیانتی ہے۔

"جنگ"۔"نوائے وقت"۔"وفاق"۔"خبریں"۔"یارن"۔

گھر گھر ڈا کے غیر عادلانہ نظام کا پھل ہیں' جب امیر آدمی فرانس سے پینے کا پانی منگوائے اور عام شہری جوہڑ کا پانی پینے پر مجبور ہو ایسا ہی ہو گا۔

۔"وفاق"۔"ڈیلی یارن"۔

موجودہ سیاسی نظام معاشی اور معاشرتی برائیوں کی جڑ ہے۔

"نوائے وقت"۔"جنگ"۔"آج"۔"وفاق"۔

اسلامی نظام کے سوا تمام نظام باطل ہیں۔

۔جھنگ ٹریبون"۔

We are not against the P.M.L or P.P.P but we are against the system which is un-Islamic, Secular and class-based.

"The Frontier Post", "The Nation" "Dawn"

نفاذ اسلام

تنظیم الاخوان سے وابستہ ہونے والا ہر شخص کم از کم اپنے آپ پر تو اسلامی نظام کا نفاذ کرے پھر اس کی بعد دوسروں کو دعوت دے۔

"ڈیلی یارن"۔"پیغام"۔

ہر شہری ایک ایک یونٹ ہے۔ اگر ہم ایک ایک یونٹ پر قرآن و سنت کا نفاذ کرتے چلے جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی معاشرہ قائم نہ ہو سکے۔

۔"جنگ"۔

ہم اس منی پاکستان (اپنے جسم) پر اسلام نافذ کرلیں گے تو پورے پاکستان میں بھی نافذ کرسکیں گے۔

۔"وفاق"۔"جنگ"۔

نہ ہمیں حکومت چاہئے' نہ ہم نے الیکشن میں حصہ لینا ہے بلکہ ہمارا مطالبہ نظام مصطفےٰ ہے۔ ہمیں یہ بھی غرض نہیں کہ کون نافذ کرتا ہے۔

۔"نوائے"۔"خبریں"۔

'نفاذ اسلام کون کرے گا؟' یہ کیسا سوال ہے جو مسلمان کرتا ہے۔ ایک شہری سے لے کر سربراہ تک 'ایک پڑھے لکھے سے لے کر ان پڑھ تک' وکیل سے لے کر عالم تک سب یہ سوال کرتے ہیں۔ "کون کرے گا؟" "وہ کرے گا جس کا رشتہ اللہ اور رسولؐ سے ہے۔ وہ کرے گا اور سر میدان کرے گا۔

ابو جہل کو قتل کرنے والے دو کم سن نوجوان تھے۔ کیا آج کلمہ گو مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو کسی ابو جہل کر گرا سکے۔

میں اپنے ان سب دوستوں سے مخاطب ہوں جو کہتے ہیں کہ اسلام کون نافذ کرے گا؟ لوگو! اپنے دلوں کے دروازے کھولو اور یہ سوال اپنے آپ سے کرو۔ اپنا سینہ کھول کر اپنے دل سے پوچھو اگر وہ کہتا ہے میں کروں گا' تو تمہاری بات بن جائے گی آگے اسلام کو نافذ کرنا' نہ کرنا اللہ کا کام ہے اور اگر یہ کہتا ہے 'مجھے رہنے دو' کوئی اور کرے' تب اپنی فکر کرو'

۔وفاق۔

اسلام کی راہ روکنے کے لئے استعماری صیہونی طاقتیں ایک منظم سازش کے تحت پاکستان میں دہشت گردی کروا رہی ہیں۔ کوئی دینی جماعت دہشت گردی میں ملوث نہیں۔

۔"آج"۔"پاکستان"۔"خبریں"۔

اسلام تشدد سے نہیں آتا لیکن اگر اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو پھر اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو بزور شمشیر ہٹایا جائے گا۔

۔"جنگ"۔"نوائے وقت"۔"ڈان"۔"ڈیلی پارن"۔

ہم اپنی تنظیم یا ذات کے لئے اقتدار کی جنگ میں شریک نہیں۔ ہماری جدوجہد اور کوششیں اسلامی اقدار کے لئے ہیں۔

۔"نوائے وقت"۔"آج"۔"وفاق"۔

قیام پاکستان کے وقت ہی اسلام نافذ ہو جاتا تو ملک ٹکڑے نہ ہوتا۔

۔"ڈان"۔

اسلام کے نفاذ کا مطلب سرکاری سطح پر صلوٰۃ اور زکوٰۃ کمیٹیوں کی تشکیل نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے سارے نظام اور ہر شعبہ زندگی پر مبنی قوانین کا اطلاق ہو گا۔

۔"نوائے وقت"۔

Implimentation of Islamic system in the country would help in iradicating in justice from the society.

"The News"

He urged Prime Minister to implement Islamic system in the country. Tanzeem Al-Akhwan would provide him a team of experienced and learned men to achieve the sacred goal.

"Pakistan Observer" ` "Dawn"

ارباب اقتدار

ہمارے ارباب بست وکشاد نے وسائل کو سرکاری بھینس سمجھ رکھا ہے اور عوام کی حیثیت کٹے (بھینس کا بچہ) کی سی ہے۔ بھینس کے کٹے کو جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے ضروری خوراک (دودھ) بھی فراہم نہیں کی جاتی اور اگر وہ مر جائے تو اس کی کھال میں بھوسہ بھر کر رکھا جاتا ہے۔

(ملی یکجہتی کونسل کی کانفرنس کو نظر انداز کرنے کے حوالے سے کہا)۔

کٹے کو جینے کا حق نہیں۔ ہماری یہ کانفرنسیں بھی کٹا کانفرنسیں ہیں۔ اس قسم کی کانفرنسیں برداشت نہیں کی جاتیں۔

۔"نوائے وقت"۔"وفاق"۔

ہم جن افراد کو قانون سازی اور ملکی دفاع کی خاطر اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں وہ قانون کی بجائے سڑکوں اور نالیوں کی بات سناتے ہیں عوام پر آئے روز نت نئے ٹیکس مسلط کئے جا رہے ہیں۔ خود اسمبلیوں میں جانے والے کروڑوں کا قرضہ حاصل کرتے ہیں اور ٹیکس معاف کروا لیتے ہیں۔ آئین کی پاسداری کرنے والے قانون کی

دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ایم۔پی۔اے اور وڈیروں کے بچے یورپ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور غریبوں کے بچے آج بھی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

"نوائے وقت"۔ڈیلی بزنس رپورٹ۔"جنگ"

اسلام کے نام پر بننے والی پہلی ریاست جو وجود میں آئی وہ ریاست مدینہ تھی۔دوسری ریاست مملکت پاکستان ہے جو اسی نظریئے کے تحت وجود میں آئی۔پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے اسلام کے نام پر بننے والی اس مملکت کے جاگیرداروں' انگریز کے حاشیہ برداروں' ملت کے غداروں' میر جعفر اور میر قاسم کی اولادوں نے مخالفت کی تھی مگر جب پاکستان قائم ہوا تو اسی ٹولے نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور تب سے اب تک ان چند گھرانوں نے بدر بانٹ کے ذریعے اقتدار کو قائم رکھا ہوا ہے۔

۔"نوائے وقت"۔"وفاق"۔

ہر رکن اسمبلی پر آٹھ سے دس لاکھ خرچ ہو رہا ہے اور عوام دال روٹی کو ترس رہے ہیں۔انھیں بیرون ملک علاج کی سہولتیں میسر ہیں وہ بھی سرکاری خرچہ پر اور یہاں عوام کو دواتک نہیں ملتی۔

۔"جنگ"۔"نوائے وقت"۔"ڈیلی یارن"۔

لندن کا محل ایک طرف اگر ان حکمرانوں کی وراثت کی تفصیل شمار کی جائے تو قومی بے حسی پر شرم آئے گی۔

۔"ڈیلی یارن"۔

ظالم جاگیرداروں کی موجودگی میں عوام کو انصاف نہیں ملے گا۔

۔"وفاق"۔نقاش ٹائمز"۔

برسراقتدار طبقہ گولڈن جوبلی قتل وغارت کی منا رہا ہے۔حکمران معاشی بدحالی

. کا جشن منا رہے ہیں۔ انگریزوں کے مسلط کردہ نظام کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ ہماری مساجد لاشوں سے بھری ہیں اور حکمران ناچ گانے کے طائفے بلوا کر دوسرے ملکوں کی ثقافت کو اپنا کر اپنی روایات سے انحراف برت رہے ہیں۔

۔ "ڈیلی پارن"۔ "وفاق"۔

ہمارا حکمران طبقہ 'ہمارے سیاستدان اس ملک میں اسلامی نظام نافذ نہیں کریں گے تو ہم بھی ان سے مطالبہ نہیں کریں گے بلکہ اپنے زور بازو سے اس ملک پر اسلام نافذ کریں گے۔

۔ "نوائے وقت"۔

میاں صاحب! آج قوم کی بیٹیاں آپ سے اسلامی انصاف کی طالب ہیں' آج نوجوانوں کے تڑپتے ہوئے لاشے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں' آج لٹتے ہوئے گھر اسلامی عدل کا تقاضا کرتے ہیں اور آج مہنگائی کا مارا ہوا غریب آپ سے اسلامی معیشت کا طالب ہے۔ اللہ آپ کو توفیق دے۔ اللہ کریم ان سازشوں کو ناکام کر دے جو پچھلی دفعہ آپ کے راستے کی دیوار بنی تھیں۔ میاں صاحب! نفاذ اسلام کی راہ میں ہم آپ کے خادم ہیں لیکن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اسلام اور نظام اسلام وطن عزیز کا مقدر ہیں۔ انشاء اللہ۔ یہاں اسلام نافذ ہو کر رہے گا۔ اگر آپ نہیں کریں گے تو اللہ کریم کسی دوسرے کو توفیق دے دے گا۔

۔ "جنگ"۔ "خبریں"۔ "نوائے وقت"۔

پاکستان میں وزارتیں خاندانوں کو الاٹ کی جاتی ہیں جس کی دنیا بھر میں مثال نہیں ملتی۔

۔ "نوائے وقت"۔

وزیر اعظم نواز شریف نے انتخابات سے پہلے اللہ کی قسم کھا کر خلافت راشدہ کا

نظام رائج کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر اب وہ اپنے وعدے سے مکر گئے ہیں۔ انھوں نے قوم سے دھوکہ کیا ہے اور اس وقت خود نواز شریف ہی ملک میں نفاذ اسلام کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ کشکول توڑ نعرہ لگانے والے اس وقت کشکول جوڑ کر عالمی فقیر بن چکے ہیں۔ دونوں پارٹیاں پیٹ پوجا منشور پر متفق ہیں۔

۔"نوائے وقت"۔"وفاق"۔"ڈیلی پارن"۔

دنیا کے بدترین عیاش اور شرابی لوگوں کو ہم اقتدار میں لاتے ہیں۔ بدکردار لوگوں کو ہم قیادت دیتے ہیں۔

۔"چکوال پوائنٹ"۔

ہمیں انگریزوں کے جوتے دھونے اور ان کی گود میں پلنے والے حکمران نہیں چاہییں۔

۔"جہاد"۔

موجودہ سودی نظام امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر کرتا ہے یہ کونسی جمہوریت ہے جس میں ایک طبقہ تو پانی درآمد کر کے پیتا ہے اور 70 ستر فیصد آبادی کو پینے کا پانی تک میسر نہیں۔

۔"جنگ"۔"خبریں"۔

حکومت زنانہ مزاج کی ہے اور اس کا خاوند امریکہ ہے۔

۔"خبریں"۔

اس ملک کو مردانہ حکومت صرف نفاذ اسلام ہی سے مل سکتی ہے۔

۔"خبریں"۔"ڈیلی پارن"۔

پارلیمنٹ پر لٹیرے قابض ہیں ان سے نفاذ اسلام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۔"پاکستان"۔

نواز شریف دیانتداری سے شریعت نافذ کریں اور اس پر عمل کریں تو ہم
بلا تنخواہ ان کے سپاہی ہیں۔
۔"نوائے وقت"۔ "جرات"۔ "ڈیلی یارن"۔ "وفاق"۔

جہاد

آج بھی 1947ء میں اغوا ہونے والی چوراسی ہزار عورتیں ہندوستان میں پاکستانی مجاہدوں کی راہ تک رہی ہیں۔

۔"نوائے وقت"۔

نفلی عبادت کرنے سے وہ مجاہد بہتر ہے جو اسلامی مقاصد کے لئے جدید ٹیکنالوجی ایجاد کرتا ہے۔ جدید طریقہ ہائے جنگ پر عبور حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس غرض کے لئے جدید اسلحہ چلانے، جوڈو کراٹے، مارشل آرٹس اور گوریلا ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔

۔"صدائے امن"۔

فوج کے لئے ضروری نہیں کہ وہ بندوق ہی سے لڑے۔ اصل فوج وہ ہوتی ہے جو آپ کے نظریئے کی حفاظت کرے۔ اسے دل سے اپنائے۔ میدان کی لڑائی وقتی اور لمحاتی ہوتی ہے۔ نظریات کا دفاع بھی جہاد ہے۔ لفظ "شہید" کے پیچھے بھی یہی فلسفہ کار فرما ہے۔ شہید گواہ کو کہتے ہیں۔ ایک بندے نے جان دے کر گواہی دے

دی۔ سب سے مضبوط گواہی یہ ہے کہ اللہ کی توحید اور حضور کی رسالت پر جان دے دی جائے۔

۔"تصویر پاکستان"۔

ہمیں نہ صرف آزاد کشمیر کو آزاد کروانا چاہئے بلکہ پاکستان کی سرحدوں کو دہلی تک وسیع کرنا چاہئے"۔

۔ڈیلی یارن۔

"یہودی وزیر اعظم کو ایک عام یہودی نے اس وجہ سے قتل کیا کہ وزیر اعظم نے مسلمانوں سے امن معاہدہ کیا تھا۔ ایک عام یہودی بھی مسلمانوں کو فائدہ دینے پر تیار نہیں اور ہم موجودہ حکومت کی بھارت اور امریکہ کو دی جانیوالی رعایتوں کو برداشت کر رہے ہیں۔"

۔"ڈیلی یارن"۔

"گوشہ نشینی سے نکل کر میدان میں آؤ کیونکہ پورا کفر میدان عمل میں ہے اگر تم اس وقت خانقاہوں میں بیٹھے رہو گے تو کفر آکر تمہیں بھی ذلیل کر دے گا۔"

۔ڈیلی یارن۔

"بات اپنی ذات کی نہیں بات انسانیت کی ہے ہمیں دیکھنا تو یہ ہے کہ اس وقت مغرب میں' یورپ میں' جاپان میں' چین میں' امریکہ میں' سکندے نیویا حتیٰ کہ پوری دنیا میں عام انسانیت پر کیا بیت رہی ہے؟ بے حیائی کتنی بڑھ گئی ہے؟ ظلم کتنا بڑھ گیا ہے؟ کفر و شرک کتنا بڑھ گیا ہے؟"

۔نوائے وقت۔

"یہ ضروری نہیں کہ ہندہ حکومت کا تختہ الٹ دے' ظالموں کے سر قلم کرنا

شروع کر دے ضروری یہ ہے کہ ہر بندے میں یہ جذبہ ہو کہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج کرنے پہ تیار ہو، ظلم کو ظلم سمجھے اور اگر اس کی راہ روکنے کے لئے نقصان بھی اٹھانا پڑے تو اس سودے پہ تیار ہو۔"

۔نوائے وقت۔

"ملک کا مقدر اسلام نہیں تو پھر زندگی سے موت بہتر ہے۔"

۔وفاق۔

"صرف دعاؤں یا ہاتھ پر ہاتھ دھر لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ انقلاب قربانی دینے سے آتا ہے۔"

۔چکوال پوائنٹ۔

"امریکہ اور دیگر قوتیں یہ جان لیں کہ ہم جہاد پرست ہیں۔ ہمیں خدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں۔ موت سے پیار ہے۔"

"نوائے وقت"۔"جنگ"۔"جرات"۔

Anti-Islamic Forces would never be successful in hindering the Muslims from adopting the way of Jihad.

"International Khyber Mail" - "Frontier Post"

"Every Pakistani must under-go compulsory military training and service and be allowed to keep weapons. It would make us courageous enough and also remove the in-justice and exploitation in the society."

"The Nation"

۵۔ صحافت

"جناب صلاح الدین صاحب حق و صداقت کی ایسی آواز تھے جو نہ صرف ایک فرد بلکہ ہر محب وطن پاکستانی کی آواز تھے۔ غیور، بہادر اور انصاف پسند عوام کی زبان تھے۔ صرف جناب صلاح الدین کو ہی قتل نہیں کیا گیا بلکہ محب وطن اور دیانتدار عوام کی زبان کاٹ کر رکھ دی گئی ہے، جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ کچھ عرصہ سے محب وطن اور مؤثر آواز رکھنے والوں کو جس طرح چن چن کر قتل کیا جارہا ہے اس سے ہر پاکستانی کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ تمام مکتبہ ء فکر کے حامل افراد سے اپیل ہے کہ خدارا اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں کیونکہ مٹھی بھر شر پسندوں کا مقابلہ صرف اور صرف ٹھوس بنیادوں پر مضبوط اتحاد قائم کرنے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔"

۔"وفاق"۔

"دیانتداری سے کہا جائے تو غیر ملکی صحافت کا معیار بہتر ہے۔ غیر ملکی اخبارات ہمارے اخبارات کی نسبت صحیح خبر دیتے ہیں۔ وہ اپنے جملوں اور الفاظ میں

کمال دکھاتے ہیں کہ قاری کے دل میں مغرب کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔وہ اپنے الفاظ نومیں خبر کے رد عمل کی راہ بھی نکال لیتے ہیں۔اپنے نظریات اور قومی مفادات کا بہر قیمت لحاظ رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں خوف، دہشت اور سنسنی پھیلائی جاتی ہے۔اخبار پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوتا جس کی تحسین کی جاسکے۔"

۔"وفاق"۔"ڈیلی یارن"۔

"مصیبت یہ ہے کہ ہم اپنے ذرائع ابلاغ پر اعتبار نہیں کر سکتے۔غیر ملکی ذرائع ابلاغ کو معتبر جانتے ہیں۔اب ریڈیو ٹی وی پر ایک ڈرامہ میں چترال میں قتل و غارت گری کی بھیانک تصویر کشی کی گئی جبکہ چترال میں پورے سال میں صرف دو قتل ہوئے وہ بھی اتفاقیہ۔وہاں میں نے دو روز تک ویرانے میں اپنی جیپ کھڑی رکھی مگر اس کا ٹائر یا کوئی بھی پرزہ چوری نہیں کیا گیا۔"

۔"وفاق"۔

"سچ کے نام پر جھوٹ چھاپنا صحافت بے دیانت۔"

۔"نوائے وقت"۔

"حکومت کی خوشامد شوق سے کیجئے کہ کھانے کو ملتا ہے لیکن اس کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔"

۔"جنگ"۔"نوائے وقت"۔"وفاق"۔

"مجاہدین کے کارناموں سے اغماض برتنے پر ذرائع ابلاغ کو ہدف تنقید بنانا"۔اللہ تعالیٰ نے مسلمان مجاہدوں کے گھوڑوں کی قسم کھائی لیکن ہم نے ہارس ٹریڈنگ کو کہاں پہنچادیا ہے۔"

۔"جنگ"۔

"اگر صحافت نے خود پر عوام کے کھوئے ہوئے اعتماد کو حال نہ کیا تو صورتحال گھمبیر ہو جائے گی۔ لوگ اپنے ذرائع ابلاغ پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں گے۔"

۔"جنگ"۔"نوائے وقت"۔

"اخبارات کو حکومت کی خوشامد کے ساتھ ساتھ حقائق بھی شائع کرنے چاہئیں۔"

۔"جنگ"۔"جرأت"۔

٦۔ مولوی

''مولویوں کا قوم کو تقسیم کرنا اس سلوک کے خلاف انتقامی کارروائی ہے جو معاشرے نے ان کے ساتھ کیا۔''

۔''جنگ''۔

''وقت کا تقاضا ہے کہ مذہب کے میدان میں نئے مفتی اور نئے لوگ آئیں جو ارشادات باری سے بھی واقف ہوں اور وقت کے تقاضوں' سیاسی اونچ نیچ اور دنیوی علوم بھی جانتے ہوں۔''

۔''جنگ''۔''نوائے وقت''۔

۔''آج ہمارا جو بچہ کسی کام کا نہیں ہوتا ہم اسے دینی مدرسہ میں داخل کروا دیتے ہیں جو بعد میں مولوی بن کر اپنی محرومیوں کا بدلہ لیتا ہے۔''

۔''خبریں''۔

''ہم نے دنیا اور دین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اپنے پاس دنیا رکھ لی اور دین کا کام مولویوں کے سپرد کر دیا۔ یہ کام انگریزوں نے اس لئے کیا تھا کہ اس زمانے میں

دینی مدرسے بہت مضبوط اور مستحکم ہوتے تھے۔ انگریزوں نے ان مدرسوں کی جائیدادیں بڑے بڑے زمینداروں میں بانٹ دیں اور دینی مدرسوں کو صرف ایسے مولوی پیدا کرنے تک محدود کر دیا جن کا علم نہایت محدود ہوتا ہے اور وہ صرف مخالفین کے خلاف کفر کے فتوے جاری کرنے کو ہی اسلام سمجھتے ہیں جبکہ ایک مسلمان کے لئے دین اور دنیا دونوں کا جاننا ضروری ہے۔"

۔"نوائے وقت"۔"خبریں"۔

"گزشتہ پچاس سالوں کے دوران کسی مولوی نے خود کو خزانہ خارجہ امور اور داخلہ کی وزارت کا اہل ثابت نہیں کیا۔ حتیٰ کہ مولویوں سے توجہ او قاف اور زکوٰۃ و عشر کی وزارت بھی صحیح طرح نہیں چلتی۔ مولوی تقریر اچھی کر لیتے ہیں اس لئے لوگ بڑی تعداد میں سننے آجاتے ہیں۔ جب مولوی خود کو سیاسی میدان کا کامیاب شہسوار ثابت کریں گے تو ان کو کامیابی بھی حاصل ہو گی۔"

۔ جنگ۔ نوائے وقت۔ خبریں۔

"دینی مدرسوں میں آج بھی دو سو سال پرانے درس نظامی اور وہ فلسفہ پڑھایا جا رہا ہے جو فلاسفروں نے بھی پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔"

۔"دن"۔"نوائے وقت"۔

"اسلام عقیدے کی بنا پر کسی کو گولی مارنے کا حق نہیں دیتا کیونکہ زندہ رہنے اور پسند کا عقیدہ اپنانے کا حق اللہ نے ہر ایک کو دیا ہے۔ ہمارے بدقسمتی ہے کہ جو علماء سیاست میں آئے وہ اسی رنگ میں رنگ گئے اور آج تک مذہبی جماعت اسی کج فہمی کا کیا بھگت رہی ہیں۔"

۔"پاکستان"۔"دن"۔"نوائے وقت"۔

"نفاذ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مذہبی جماعتیں ہیں۔ جنہوں

نے آج تک اسلام اور اس کے نفاذ کا کوئی طریقہ یا پروگرام عوام کو نہیں بتایا۔"

"پاکستان"۔ "جنگ"۔ "نوائے وقت"۔ "ڈان"۔ "The News"

دینی جماعتوں کے پاس متبادل نظام نہ ہونے کے باعث عوام نے انہیں رد کر دیا۔"

۔"الاخبار"۔

"Religious Parties were not sincere to Shariah enforcement due to their financial interests."

"The News".

۷۔ ادیب و شاعر

ادیبوں' شاعروں' دانشوروں اور صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "وہ مولوی نہیں بنیں ہمیں بغیر داڑھی کے مولوی منظور ہیں مولوی کو ڈاکٹر' انجینئر' شاعر' دانشور اور صحافی نہیں بنایا جا سکتا جبکہ یہ لوگ تھوڑا سا مطالعہ کر کے مولوی سے کہیں آگے جا سکتے ہیں۔"

۔"جنگ"۔"نوائے وقت"۔"خبریں"۔

"ہمیں مسلمان شاعر و ادیب چاہئیں۔"

۔"جنگ"۔

"مولوی اور پیروں نے قوم کو مزید تقسیم کر دیا ہے۔ چنگیزی فوج نے بغداد کا محاصرہ کیا تو بغداد میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ کہیں ہم ایک اور سقوط بغداد دیکھنے تو نہیں جا رہے۔"

۔"جنگ"۔

"ہمارے تمام تعلیم یافتہ افراد ادیب' شاعر' دانشور' ڈاکٹر' انجینئر حضرات دینی امور صرف مولوی پر چھوڑنے کی بجائے خود دین کا مطالعہ کریں۔"

۔"جنگ"۔"نوائے وقت"۔

۸۔ متفرقات

"اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں ہی انسان کی بقا ہے انسانی مسائل کا حل تصوف کی روشنی میں اللہ کے ذکر میں ہے۔"

۔"جنگ"۔"وفاق"۔

"اسلامی نظام ہی ملکی مسائل کا حل ہے۔"

"خبریں"۔"وفاق"۔"نوائے وقت"۔

"وسائل کی غلط تقسیم ہی کا نتیجہ ہے کہ ملک 25ارب کا مقروض ہے اور نادہندگان نے 130ارب ادا کرنے ہیں۔"

۔"وفاق"۔

"سی ٹی بی ٹی دستخط ذلت آمیز معاہدہ ہے۔"

۔"خبریں"۔"نوائے وقت"۔جنگ"

"احتساب کا شوشہ قوم سے مذاق کے سوا کچھ نہیں۔"

۔"خبریں"۔

"جلد دھماکہ نہ ہوا تو حالات خانہ جنگی کا رخ اختیار کر لیں گے۔"

"خبریں"۔"نوائے وقت"۔"جنگ"۔"وفاق"۔

"اگر امریکہ یا اس کے حواریوں نے وطن عزیز کے خلاف کوئی مکروہ اقدامات کئے یا کسی قسم کی پابندیاں عائد کیں تو وہ پوری قوم کو نواز شریف کے پیچھے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دیکھیں گے اور ہم ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔"

۔"دن"۔

"حکومت نے ایٹمی دھماکے مجبوراً کئے۔ امریکہ اس کی سزا ضرور دے گا۔"

۔"خبریں"۔

"مشترکہ دفاع وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔"

۔"خبریں"۔

"آزادی اظہار اور جمہوریت کا تصور سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا۔"

۔"جنگ"۔"وفاق"۔"نوائے وقت"۔

"تفرقہ بازی لوگوں کو اسلام سے دور کر رہی ہے۔"

۔"جنگ"۔

"مومن عشق مصطفیٰؐ کے بغیر مکمل نہیں۔"

۔"نوائے وقت"۔

امریکی سفارتخانے کے لیے ایک کہانی

ہارون الرشید (ناتمام)

روزنامہ اساس 23 اگست 1998ء

ڈاکٹر رابرٹ کرین 1991ء کی جنگ خلیج تک پینٹاگان میں عالمی حکمت عملی کے ڈائریکٹر تھے اور یہ ہی تھے جنہوں نے عراق پر حملے سے پہلے صدر بش سے کہا تھا کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو وہ امریکہ کی بربادی کے ذمہ دار ہوں گے۔۔۔ ڈاکٹر کرین ہی ایک ایسے شخص تھے جو سی آئی اے کے سربراہ سے یہ جملہ کہہ سکتے تھے اور یہ ڈاکٹر رابرٹ ہی تھے جو اس جملے پر برطرفی کے بعد ملال کا شکار نہ ہوئے۔ جن کے قہقہوں کی اوسط تعداد، کہانیاں سنانے کی رفتار اور جملہ چست کرنے کی عادت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

ڈاکٹر رابرٹ کرین نے 1979ء میں اسلام قبول کر لیا تھا، جب وہ ایک عرب ملک میں سفیر کے فرائض انجام دے رہے تھے، لہذا وہ مسلمانوں کو دوسرے امریکیوں سے زیادہ جانتے تھے۔

دن بھر قہقہے برسانے، روزانہ 25 میل دوڑ لگانے اور ہر شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے سوا چھ فٹ کے رابرٹ کرین ستمبر کی ایک خوشگوار صبح اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اترے تو امریکی وائسرائے رابرٹ اوکلے ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے موجود تھے لیکن انہوں نے ذاتی دوستی کے باوجود سفیر بہادر کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور لمبی داڑھی والے 50 سالہ ڈاکٹر عظمت کے ساتھ 120 کلومیٹر دور نور پور چلے گئے۔ وہ اتنے بے تاب تھے کہ انہوں نے ناشتہ کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

وہ سانولے رنگ کے دراز قد ڈاکٹر عظمت کے مقروض تھے۔

مشی گن کے ایک سیمینار میں انہوں نے بلاسود بنکاری اور ڈاکٹر عظمت نے تصوف پر لیکچر دیا۔

سیمینار تمام ہو چکا تو بڑبولے اور اکل کھرے امریکی ڈاکٹر نے سنجیدہ اور خوش طبع پاکستانی ڈاکٹر سے کہا: (جو کچھ تم نے کہا ہے) کیا تم اس بکواس میں واقعی یقین رکھتے ہو؟

ڈاکٹر عظمت نے زندگی کا سلیقہ اس آدمی سے سیکھا ہے جسے آواز کے زیر و بم پر ہمیشہ قابو رہتا ہے، لہذا انہوں نے برہم ہونے کے بجائے صرف یہ کہا: کیا آپ نے تصوف کا مطالعہ کیا ہے؟

"نہیں"۔ ڈاکٹر رابرٹ نے ایک صداقت شعار آدمی کی بے تکلفی سے جواب دیا۔

"اگر آپ نے تصوف کا مطالعہ نہیں کیا تو آپ اسے مسترد کیسے کر سکتے ہیں۔"

ڈاکٹر رابرٹ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اب انہیں کسی بھی چیز سے زیادہ ایک موزوں جواب کی ضرورت تھی۔ رابرٹ

ایسے شخص نہیں تھے کہ مقروض ہونے کی پرواہ نہ کرتے۔

ڈاکٹر عظمت نے ڈاکٹر رابرٹ کی مدد کا ارادہ کیا اور ان سے یہ کہا: آپ چار ہفتے کے لئے پاکستان آجائیے۔ آپ پر تصوف کے اسرار کھل جائیں گے اور آپ چاہیں تو اس کے بعد اسے بجواس قرار دے سکتے ہیں۔

فاروق عبدالحق ستمبر کی اس سحر کو اسی لئے اسلام آباد پہنچے تھے کہ تصوف کی سچائی کو پالیں اور اپنی رائے بدل لیں یا پھر اپنے موقف کی حمایت میں دلائل ڈھونڈ لیں اور انھیں تصوف کو بجواس قرار دینے میں کوئی تامل نہ رہے۔

ڈاکٹر فاروق عبدالحق کا پہلا تجربہ ناخوشگوار تھا۔۔۔نور پور تحصیل کلر کہار ضلع چکوال کی اس سادہ سی عمارت میں اس بوڑھے ہوتے ہوئے شیخ نے اس شخص کی ہرگز کوئی پرواہ نہ کی، جو امریکی حکومت کا ذمہ دار افسر تھا اور اس کی ایک سادہ سی وجہ تھی۔

امریکی حکومت ان کے لیے نور پور کے پٹواری سے زیادہ اہم ہرگز نہیں تھی۔

امریکی افسر کو دھچکا لگا لیکن وہ ڈٹا رہا۔ وہ کھوجنے آیا تھا اور کھوجنے والے برہمی اور اکتاہٹ میں فیصلے صادر نہیں کرتے۔

ماضی کے ڈاکٹر رابرٹ کرین اور حال کے فاروق عبدالحق نے سوتے جاگتے میں بعض عجیب منظر دیکھے اور بالآخر وہ منظر جس نے اس کی تقدیر بدل ڈالی۔

اس نے خدا کے آخری رسول کو خواب میں دیکھا اور وہ جانتا تھا کہ جب آپ خدا کے رسول کو دیکھیں تو بس انہی کو دیکھتے ہیں۔

دس برس پہلے جب وہ اسلام کا مطالعہ کر رہا تھا تو اس نے ایک حدیث پڑھی جس کا مفہوم یہ تھا کہ شیطان سرکار کا بہروپ نہیں بھر سکتا۔ اس کے بقول وہ تین ماہ تک اس حدیث پر تحقیق کرتا رہا اور پھر اس کے کفر نے سپر ڈال دی۔

آج اس نے خود دیکھ لیا۔ پھر مسرت اور حیرت سے بے تاب ہو کر وہ مسجد میں کھلنے والے شیخ کے دروازے سے بلا اجازت اندر داخل ہو گیا اور بلند آواز سے کہا: اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائیے میں بیعت کرنے کے لیے آیا ہوں!۔

اور جب وہ بیعت کر چکا تو اس نے سرگودھا چکوال روڈ پر بہنے والی نرم ہوا میں کھڑے ہو کر یہ کہا: میں ٹارزن ہوں۔ قوت یقین اور فرحت کا احساس اس کے رگ و پے میں مچل رہا تھا اور اس نے دہرایا میں ٹارزن ہوں۔۔۔ایک فاتح۔

شیخ اب بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں، ہر چند کہ وہ اب بھی نور پور کی پہاڑیوں میں دس کلو میٹر روزانہ پیدل چلتے اور ہرنوں کا شکار کھیلتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار امریکہ جاتے ہیں کہ وہاں بھی ایسی ہی ایک دل آویز عمارت میں اللہ کا ذکر کرنے والے جمع ہوتے اور ان کا انتظار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فاروق عبدالحق کو خبر ملے تو وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں لیکن وہ پاکستانیوں کے برعکس ان کے سامنے کرسی پر براجمان ہونا پسند نہیں کرتے۔ اپنے سوٹ اور بھائی سمیت شیخ کے قدموں میں فرش پر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اس بات کا لطف اٹھاتے ہیں کہ کس طرح پاکستانی میزبان کرسیوں سے فرش کی طرف لپکتے ہیں

ماضی کا ڈاکٹر رابرٹ کرین اور آج کا فاروق عبدالحق کوئی جذباتی آدمی نہیں۔ وہ اسامہ بن لادن، گلبدین حکمت یار، قاضی حسین احمد کا ساتھی نہیں۔ لیکن وہ ایک راز سے واقف ہے، جس سے بیشتر مسلمان بھی آشنا نہیں۔

وہ جانتا ہے کہ مستقبل اسلام کا ہے، امریکہ کا نہیں ہے۔

سولہ برس بیشتر جب روس افغانستان میں دھاڑ رہا تھا اور اس کے ٹینک افغان دیہات کو کچل رہے تھے۔ شیخ کے مرشد، میانوالی کے اس تہمد پوش دیہاتی نے کہا تھا: روسی ہار جائیں گے، وہ ٹکڑوں میں مٹ جائیں گے اور بھیک مانگ کر کھایا کریں گے

۔(اوگداکر کے کھاسن)

اور صبح وشام اللہ کا ذکر کرنے والے شیخ کو لوگوں نے یہ کہتے سنا ہے : امریکہ بکھر جائے گا اور اسلام ساری دنیا پر غالب آئے گا۔

میں نے حیرت سے سوچا کہ کیا وہ غیب کا علم رکھتے ہیں ؟۔

"نہیں" انہوں نے کہا "کسی آدمی کو غیب کا علم نہیں دیا جاتا لیکن گاہے غیب پر مطلع کر دیا جاتا ہے۔

افغانستان کے اہل ایمان کو اس پر مطلع کر دیا گیا تھا کہ روس افغانستان کے پہاڑوں میں ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔۔۔۔۔۔ آخر کس چیز نے ان کے دلوں کو یقین سے بھر دیا تھا۔

وہ دن آنے والا ہے، جب انہیں مطلع کر دیا جائے گا کہ امریکہ کے بکھرنے کا لمحہ آپہنچا۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ دن بہت قریب آپہنچا۔

میں یہ بات ڈاکٹر رابرٹ کرین کی کہانی کے سبب نہیں کہہ رہا۔۔ یہ تو باربرا ورلینا کی داستان ہے جو یقین پیدا کرتی ہے۔

کوئی بتائے کوئی بھید کھولے

18 اکتوبر 98ء روزنامہ جنگ راولپنڈی

ہارون الرشید

کوئی بتائے کوئی بھید کھولے

کیا افغانستان کے گلیم پوش چرواہوں اور کسانوں کی طرح عہد رفتہ کے روشن جبینوں کی طرح پاکستان کے یہ فرزند اپنے لہو سے تاریخ کا ایک نیا اور خیرہ کن باب لکھیں گے۔"

میں نہیں جانتا.... آدمی اسے زیادہ کیسے جان سکتا ہے جو اسے بتایا جائے اور جو کچھ وہ دیکھ سکے لیکن میرا دل ان کی طرف لپکتا ہے......اس طرح جیسے پرندہ آشیانے کی طرف لپکتا ہے۔ ان لوگوں کی طرف جو آج کا سورج غروب ہونے کے بعد راولپنڈی شہر کے لیاقت باغ میں جمع ہوں گے اور اپنے سردار کے ہاتھ پر موت کی بیعت کریں گے۔ دس ہزار، بیس ہزار، تیس ہزار یا شاید پچاس ہزار سر فروش۔

اور ان کا رہنما کون ہے چھ فٹ چار انچ کا وہ کلاہ پوش ' جسے وہ محبت اور عقیدت سے "حضرت جی" کہتے ہیں اور جو اخبارات پڑھنے والوں کے لئے بہت سے دوسرے لیڈروں جیسا ایک لیڈر ہے۔ وہ آدمی جو رات کو ایک بجے اپنے ملاقاتیوں کو الوداع کہتا ہے اور ساڑھے تین بجے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اپنے رفیقوں کیساتھ اپنے مالک کو پکارنے کے لئے جو پکارنے والوں کی پکار کا جواب دیتا ہے اور بے آباد دلوں کو آباد کرتا ہے' جس نے قدموں تلے زمین کا فرش بچھادیا ہے اور سر پہ آسمان کی تاروں بھری چادر تان دی ہے۔

راہ سلوک کا ایک مسافر؟ ہاں وہ راہ سلوک کا ایک مسافر ہے لیکن اسکے سوا بھی بہت کچھ...... ایک کاشتکار ایک تاجر' ماہر نفسیات' معلم' عالم دین' معالج اور شکاری...... کلر کہار کی جھیل سے آگے' نور پور کی پہاڑیوں میں وہ ہرنوں کا شکار کھیلتا ہے اور رات اترتی ہے تو اپنی مسجد میں لوٹ آتا ہے اور انسانوں کو شکار کرتا ہے۔

تزکیہ نفس کے متلاشیوں کے لئے وہ اپنا ہاتھ بیعت کے لئے دراز کرتا ہے جب وہ آرزو مند ہوں اور تقاضا کریں اور اس کے پاس آنے والے کبھی لوٹ کر نہیں جاتے...... شہروں کی ہماہمی میں کبھی گم نہیں ہوتے۔

ہمیشہ مسکراتے رہنے والے آدمی کے پاس کوئی جادو ہے؟ نواح نور پور کا کوئی کسان ہو یا پینٹاگان کا صدر جارج بش کو ڈانٹ دینے والا رابرٹ کرین جب وہ اسکے پاس آتے ہیں تو ان کی مٹی موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ الجھائے اور ڈرائے بغیر وہ انہیں بغض' حسد اور نفرت سے نجات کی تعلیم دیتا ہے اور اسطرح دھوڈالنا چاہتا ہے جیسے مائیں بچوں کے لباس اجلے کر دیتی ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے' جنہیں اس نے اجلا کر دیا ہے اور وہ سب رات کے تیسرے پہر اپنے رب کی تسبیح پڑھتے ہیں اور دن بھر شکار کرتے ہیں۔

پچھلے برس لاہور کے گلابی جاڑوں میں' میں نے اس آدمی کو قرآن مجید عظیم الشان سے چند آیات کی تفسیر بیان کرتے سنا اور میں نے دیکھا کہ ساری محفل محبت کی پھوار سے بھیگ گئی' جیسے برسات سے کھیتی بھیگ جاتی ہے اور برگ وبار کی آرزو کرنے لگتی ہے...... سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ مکرم ملک محمد اکرم اعوان......

وہ آدمی جو خود اسکے بقول اپنی جوانی میں ایک ڈاکو تھا ایسا ہیبت زدہ کر دینے والا شخص کہ وادی سون کا خونخوار چیتا محمد خان اس سے مرعوب ہو کر بھاگ اٹھا تھا......اور کہانی کا آخری باب ہے کہ محمد خان ڈاکو نے بالآخر اس آدمی کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس حال میں دنیا سے اٹھا کہ اس کے سر پہ محمد عربیؐ کی مہر کا پرچم لہرا رہا تھا۔

یہ ہمیشہ حیران کرنے والا آدمی ملک محمد اکرم اعوان اور ان کے ہزاروں رفیق آج راولپنڈی کے لیاقت باغ میں یہ علم لہرانے آئیں گے۔ نفاذ اسلام کے لئے موت کی بیعت کرنے' گردنوں کی منت ماننے......بستیوں پر بادلوں کی طرح برس جانے کی آرزو کرنے۔

سال بھر سے میں ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں اور میری حیرت ختم ہونے میں نہیں آتی وہ کھدر کے تہمد باندھنے والے اور پتلون پوش 'کسان' چرواہے' استاد' فوجی افسر' تاجر اور کاریگر' خاک رہ حجاز جن کی آنکھوں کا سرمہ ہے اور جن کی نگاہوں کو زر وجواہر کی چمک خیرہ نہیں کر سکتی۔ وہ جو زمین اور زندگی کی سطحی صداقتوں سے اوپر اٹھ گئے ہیں۔ وہ عاجزوں سے زیادہ عاجز ہیں لیکن بادشاہوں سے زیادہ بے نیاز اور غنی بھی وہ کسی سے کچھ طلب نہیں کرتے اور جو کچھ ان کے پاس ہے' اسے لٹا دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ جو کسی کو حقیر نہیں جانتے' خدا کی ساری مخلوق میں مسکراہٹ' مسرت اور امید بانٹتے ہیں اور مجھ سے ادنیٰ لوگوں پر بھی اپنا دروازہ خوش دلی سے

کھولتے ہیں جن کے دامن میں مٹھی بھر خاک اور چٹکی برابر راکھ کے برابر متاع بھی نہیں۔

وہ ناقابل فہم لوگ ہیں وہ اس دنیا کی باتیں کرتے ہیں جو کسی نے کبھی نہیں دیکھی، کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ لیکن ان کے لہجوں میں اتنا بے پناہ یقین ہے' ایسا بے حساب اعتبار اور اٹل ایمان' جیسے جنت اور دوزخ ان کے گھروں اور کھیتوں' خواب گاہوں اور دفتروں کے درمیان واقع ہوں اور جب ان لوگوں سے ملو اور ان سے برتو تو وہ شہد کی طرح شیریں ہیں' درختوں کی طرح سایہ دار اور ماؤں کی طرح مہربان...... ان کی مٹی کس چیز سے گوندھی گئی ہے؟۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ اللہ کے مسلسل اور پیہم ذکر سے جو ان کے قلوب کی گہرائیوں سے امنڈتا اور رگ رگ میں اترتا رہتا ہے۔

لوں لوں دے وچ سو سو پلکاں اک کھولاں اک کجاں ہو

وہ ایک عجیب بات کہتے ہیں اور تھرادینے والے ایقان کیساتھ کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں نفاذ شریعت ہماری منزل نہیں ہے۔ یہ تو لوح تقدیر پہ لکھا ہے اور ہو کر رہے گا وہ کہتے ہیں کہ اس ملک کو زمین کا محور و مرکز بننا ہے۔ ابھی کچھ دنوں میں' کچھ ہی دنوں میں اہل ایمان کے بے حساب لشکر رزم گاہوں میں اتریں گے اور تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز کریں گے۔ وہ زمانہ کے سرکارؐ نے "غزوہ ہند" کے عنوان سے جس کی بشارت دی تھی اور جس میں شرکت کی آرزو کی تھی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ زمانہ کروٹ بدلنے والا ہے اور کچھ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ برصغیر کے ہر دیار میں پیغمبر آخر الزماںؐ کے علم لہرا دیئے جائیں گے کہ ہند کے ساحلوں سے میر عرب کو ٹھنڈی ہوا آئی تھی اور پھر زمین کا ایک ایک گوشہ ذکر الٰہی سے منور ہو جائے گا۔

ایک ماہ ہوتا ہے کہ لاہور کے موچی دروازے میں پندرہ ہزار جیتے جاگتے آدمیوں نے اپنے سردار کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی اور یہ اس وقت ہوا جب دھماکہ خیز خبروں کے متلاشی اخبار نویس تھک ہار کے دفتروں کو لوٹ گئے تھے اگلے روز کے اخباروں میں نا تمام خبریں چھپیں اور غیر متعلق تفصیلات و تصاویر...... لیکن انہوں نے احتجاج نہ کیا۔ راہ سلوک کے مسافر شکایت اور احتجاج نہیں کرتے۔

آج شب وہ لیاقت باغ میں جمع ہوں گے' کفن باندھنے اور گردنیں کٹانے کی آرزو کریں گے...... بے پناہ یقین بے حساب اعتبار اور اٹل ایمان کے ساتھ وہ پیمان باندھیں گے اور وہ پیمان پر پورے اترنے والے لوگ ہیں وعدے کے کھرے اور قول کے پکے۔

کیا وہ دیوانے ہیں؟ ہوش و خرد سے بیگانے' خوابوں میں زندگی کرنے اور سپنوں میں جینے والے؟ مجنوں اور پاگل؟ زمین اور زندگی کے حقائق سے بے خبر؟ سیاست اور اسکی حرکیات سے نا آشنا؟ تاریخ اور اسکی تشکیل کرنے والے عوامل سے بے بہرہ؟

شاید ایسا ہی ہو...... میں نہیں جانتا...... آدمی اس سے زیادہ کیسے جان سکتا ہے جو اسے بتایا جائے اور جو کچھ وہ دیکھ سکے لیکن میرا دل ان کی طرف لپکتا ہے' جیسے ایک پرندہ سرِ شام آشیانے کی طرف...... میں نہیں جانتا کیوں لپکتا ہے۔

کیا یہ روزِ ازل کے پیمان کی بازگشت ہے۔ کیا وہ پیمان پکارتے اور آواز دیتے ہیں۔ آدمی اس سے زیادہ کیسے جان سکتا ہے جو اسے بتایا جائے اور جو وہ دیکھ سکے۔ کوئی بتائے' کوئی بھید کھولے...... انہوں نے دلوں کا قرار نوچ لیا ہے اور میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔

ان شہد جیسے شیریں اور شجر ایسے سایہ دار لوگوں نے......

کچھ دیر کے لیے

ہارون الرشید

جنگ راولپنڈی

۱۸۔ نومبر ۱۹۹۸

لوٹ کر آئیں گے تو پھر سے سیاست کے شہبازوں اور سکندروں کے کارنامے بیان کریں گے...... ابھی کچھ دیر کے لئے ایک آدھ دن کے لئے میں ایک دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔

کلر کہار کی جھیل سے آگے' جہاں مور ناچتے ہیں' جہاں باغات بلندیوں سے اترنے والے چشموں سے سیراب ہوتے اور اپنی ہریالی سے دائم حیران کئے رکھتے ہیں' جہاں گلاب کے ڈھیروں سے ہمیشہ عرق کشید ہوتا اور خوشبو ہوا میں بکھرتی رہتی ہے' جہاں کنار آب اگے شجر خاموش پانیوں میں اپنی تصویر دیکھتے ہیں۔

سیاست کے سکندروں اور شہبازوں سے دور' ایک دن کے لئے میں اس دیار میں

جانا چاہتا ہوں۔ جھیل کے پانیوں' چشموں کی چاندی' پھولوں کے تختوں اور لوکاٹ کی ان قطاروں سے آگے جن کی شاخوں پر بہار میں موتی اگتے ہیں اور ان موتیوں پر خدا کی حمد گانے والے پرندے اترتے ہیں۔

نہیں' سرگودھا چکوال روڈ پر یہ بہار نہیں' خزاں کا موسم ہے۔ شاخوں پر پتے پیلے ہو کر جھڑ چکے اور ٹہنیوں کے عریاں ہاتھ دعا کے ہاتھوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ سارے منظر اور سارے شجر اس بہار کے منتظر ہیں جو سرما کا بے مہر موسم گزر جانے کے بعد دھومیں مچاتی آئے گی' جب موروں کی قطاریں پھر سے رقص کریں گی' لاکھوں پرندے سارا دن چہچہایا کریں گے جب صبح کی نرم ہوا اور دوپہر کی گوارا دھوپ میں بلبلیں ان کے لئے گیت گائیں گی' حتیٰ کہ برسات کے دن آئیں گے اور کوئل کی درد بھری کوک میں یہ نغمے تحلیل ہو جائیں......اور اس سے پہلے پورا چمکتا ہوا سورج دھان کے کھیتوں میں سونا بکھیر دے گا' کسانوں کے ہاتھوں کا پسینہ اناج کے ڈھیروں میں ڈھل چکے گا تو سیاست کے شہبازوں اور سکندروں سے دور' کچھ دیر کے لئے میں وہاں جاتا ہوں۔

کلر کہار سے آگے' جہاں بل کھاتی پہاڑی سڑک ہموار میدان میں اترتی ہے میدان کے حاشیوں پر پھیلے پہاڑوں میں ہرنوں کے ریوڑ گھومتے اور کلیلیں کرتے ہیں۔ ترائیوں میں چشمے چپ چاپ بہتے ہیں اور سرگوشیاں کرتے ہیں ہرنوں کے بچے اور سرخ دھبوں والی چڑیوں کے جھنڈ ان سرگوشیوں کے معانی خوب سمجھتے ہیں بس ایک آدم زاد ہی ان سے واقف نہیں۔

چاندنی راتوں میں ان چشموں اور ندیوں میں ستارے ٹمٹماتے ہیں اور چاند پانیوں سے باتیں کرتا ہے اور جب آفتاب طلوع ہو چکے تو درخت اور پرندے اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں' سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم پاک ہے وہ جو سب تعریفوں

کے لائق ہے' پاک ہے وہ جس نے سب زمینیں اور سب آسمان تخلیق کئے' پاک ہے وہ سب سمندر سیاہی اور سارے درخت قلم ہو جائیں' تب بھی جس کی ثناء مکمل نہیں ہو سکتی۔

درخت اور پرندے جانتے ہیں پانی اور پہاڑ بھی جانتے ہیں' سب ستارے جانتے ہیں چاند اور سورج جانتے ہیں اور وادیوں میں بہتی ہوا بھی جانتی ہے لیکن افسوس کہ آدم زاد نہیں جانتا حالانکہ اسے تو بتا بھی دیا گیا تھا لیکن وہ بھلا دیتا ہے...... وہ ہمیشہ بھلا دیتا ہے اور ان چیزوں کو یاد رکھتا ہے جو اسے فراموش کر دینی چاہئیں شاید یہی سبب ہے کہ ہوا' درخت اور پرندے اس سے وحشت کرتے ہیں ہرنوں کے ریوڑ انسانی آوازیں سنتے ہیں تو ہجرت کر جاتے ہیں' حالانکہ وہ چیر پھاڑ کرنیوالے' درندوں کے سبب بھی کم ہی ہجرت کرتے ہیں۔

سیاست کے سکندروں اور شہبازوں سے دور' کچھ دیر کے لئے میں ان وادیوں کو جاتا ہوں۔

ان پہاڑوں اور بستیوں کے درمیان' اس ٹیڑھی میڑھی سڑک کے کنارے اللہ کے بندوں کا ایک مختصر سا گروہ آباد ہے' جو ہمیشہ اپنے پروردگار کو یاد کرتے اور اس کے نام کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں جو اپنے من کو' اپنے قلوب اور روحوں کو چاندنی کی طرح' وادیوں میں بہتی ہوا کی طرح اور ندیوں کے پانی کی طرح پاکیزہ بنانا چاہتے ہیں۔ وہ جو دائم ریاضت کرتے رہتے ہیں' وہ جو بغض نفرت اور حسد سے نجات چاہتے ہیں' وہ جو شہرت اور داد کی بھوک بھڑکانے کے آرزومند نہیں وہ جو کثرت کے ہاتھوں ہلاک ہو جانا نہیں چاہتے۔

تو سیاست کے سکندروں اور شہبازوں سے دور' میں کچھ دیر کے لئے ان کی طرف جاتا ہوں۔

وہ آخر شب جاگتے ہیں جب ستاروں کے چراغ ٹمٹمانے لگتے ہیں ابھی سفید

دھاگہ' سیاہ دھاگے سے جدا نہیں ہوتا' صبح کاذب کے بطن میں صبح صادق کا نور ابھی سو رہا ہوتا ہے اس وقت جب پودوں' درختوں اور جھاڑیوں پر شبنم کے قطرے ابھی طلوع خورشید کے خوف سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

تب یہ لوگ جنگلوں میں چپ چاپ بہتی ندیوں کی طرح' پرندوں اور ہواؤں کی طرح' اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہیں اور اپنی روحوں میں اجالا بوتے ہیں کہ یہ کھیتی ہمیشہ آخر شب ہی بوئی جاتی ہے...... آخر شب وہ اپنے دلوں میں صبر و شکیب' خیر' ایثار و محبت کے بیج ڈالتے ہیں اور آوازوں کے بغیر بہنے والے آنسوؤں سے ان کی آبیاری کرتے ہیں۔

وہ جو اپنے دلوں میں آنیوالے عہد کی سویر بو رہے ہیں' جو یہ امید کرتے ہیں اور یہ خواب دیکھتے ہیں کہ آخر کار یہ سحر ان کے قلوب سے اٹھے گی اور اللہ کی ساری زمین کا احاطہ کرلے گی۔ جب صدیوں سے سوئے افتادگان خاک جاگ اٹھیں گے اور انسانی لہو پر پلنے والے وحشی زنجیروں میں جکڑ دیئے جائیں گے۔

اور یہ لوگ ہیں جو تاریکی کو نہیں کوستے اور ہر شب اپنے حصے کا ایک دیا جلاتے ہیں کہ آخر کار ظلم سے سیاہ ساری دھرتی روشنی سے بھر جائے اور آسمان کے نیچے ساری وسعتوں میں نور ہدایت کے چراغاں کے ایک لا متناہی لا محدود اور بے کراں منظر کے سوا کوئی منظر باقی نہ رہے۔

تو میں ایک محروم اور متلاشی' دنیاداروں کا ایک دنیادار لوگو کچھ دیر کو ان اہل صفا کی طرف جاتا ہوں جو زمین پر روشنی بو رہے ہیں اور جنہیں یقین ہے کہ ایک دن ان کھیتوں میں خیر اور امید کی فصلیں لہلہائیں گی۔

لوٹ آئیں گے تو پھر سے سیاست کے سکندروں اور شہبازوں کے بارے میں بات کریں گے جن کے لئے ابھی مہلت باقی ہے۔

کہ افتادگان خاک کا امتحان ابھی باقی ہے کہ دعاؤں کے باریاب ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔

تعبیر

ہارون الرشید

روزنامہ جنگ 1 مارچ 1999ء

چند روز ادھر' ایک خوش بخت کا ذکر تھا کہ اسنے سرکار رسالت مآب کو خواب میں دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کہوٹہ کے ایٹمی پلانٹ میں پڑی یورینیم کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور امریکی اسکا تعاقب کرتے ہیں۔ اس نے عالی مرتبت کو فرماتے سنا کہ خالد بن ولیدؓ متحدہ مسلم افواج کے سربراہ ہوں گے' علی مرتضیٰؓ ان کے مددگار ہوں گے اور اس معرکے میں سرکارؐ کے دائمی رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروق اعظمؓ آپؐ کے 'مشیر ہوں گے۔ راوی کے بقول یہ بھی ارشاد کیا کہ مدینہ کی حدود حرم بیس میل ہیں اور اس میں کوئی مشرک داخل نہ ہو سکے گا۔

میں نے گمان کیا کہ یہ خواب چھاپ دینا چاہئے اور اہل علم سے تعبیر کی درخواست کرنی چاہئے۔ جناب پروفیسر محمد رفیق اور حضرت صوفی عیش محمد صاحب نے خاموش رہنا پسند کیا لیکن الاخوان کے امیر اور سلسلہ اویسیہ کے شیخ مکرم ملک محمد

اکرم اعوان نے توجہ عنایت کی۔ گرامی نامہ چند روز پہلے ملا تھا تاخیر سے اشاعت پر معذرت خواہ ہوں کہ دوسرے مباحث در پیش تھے (آپ نے لکھا "اسلام علیکم و رحمتہ اللہ"

پتہ نہیں آپ بڑے بڑے ناموں میں میرا حوالہ کیوں دیتے ہیں' جبکہ میں ایک عام آدمی ہوں اور بس' اب رہی بات خواب کی تو یہ درست کہ جس نے آپ کو خواب میں دیکھا' اس نے آپؐ ہی کو دیکھا۔ مولانا اشرف علی تھانوی یہ فرماتے تھے کہ جسے زیارت نصیب ہوئی' امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی عاقبت خیر ہو گی اور نجات نصیب ہو گی دوسری بات بہت واضح ہے کہ امریکہ پاکستان کی ایٹمی قوت کو ہر قیمت پر ختم کرنا چاہتا ہے اور ایک حد تک اس ادارے پر اس کے ایجنٹ قابض ہیں مگر ایک طاقت اس قوم میں ایسی بھی ہے کہ جو اسکی حفاظت کرے گی' انشاء اللہ اس کا کنٹرول سنبھالے گی اور امریکہ یا اس کے ایجنٹ انہیں روک نہ سکیں گے۔

تیسری بات اس حدیث پاک کی تائید ہے' جس میں آپؐ نے غزوۃ الہند کی پیش گوئی کی' فرمایا وہ جماعت بغیر حساب جنت میں جائے گی جو غزوۃ الہند میں شریک ہو گی اور وہ جماعت بغیر حساب جنت میں جائے گی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر جہاد کرے گی۔

یہاں سوال یہ ہے کہ غزوۃ ان جنگوں کو کہا گیا' جن میں حضورؐ خود شریک ہوئے' ورنہ عہد نبوی کی وہ جنگیں جن میں آپؐ نے کسی کو امیر مقرر فرمایا سریہ (جمع سرایا) کہلاتی ہیں۔ تو غزوۃ الہند کو غزوۃ الہند کیوں کہا؟ یہ خواب اس کا جواب ہے کہ اب معرکے پر آپؐ اس طرح متوجہ رہیں گے جیسے اس میں شرکت فرما رہے ہوں۔

اب اسی سے معرکے کی شدت اور وسعت کا اندازہ کر لیجئے۔ انشاء اللہ یہ معرکہ برپا ہو گا۔ پاکستان' کشمیر' ہندوستان' بنگال یہ سب الہند میں شامل ہیں۔ سب

مسخر ہوں گے اسلامی ریاست بنے گی اور دنیا بھر میں احیائے اسلام کی بنیاد فراہم کرے گی انشاء اللہ العزیز۔

میں نے اپنے فہم کے مطابق تعبیر بیان کر دی۔ حقیقت اللہ کریم کے علم میں ہے اور میں مغفرت کی آرزو کے ساتھ اس بات کا متمنی ہوں کہ اپنی راہ میں اس جہاد میں مجھے مقبول فرمائیں۔

والسلام

"امیر محمد اکرم اعوان"

جو ایمان رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ قوموں کے مستقبل اور لائحہ عمل کا انحصار خوابوں پر نہیں' زندگی اور زمانے کے تلخ حقائق پر ہے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خوابوں کی تعبیر ایک بڑا علم ہے۔ قرآن عظیم الشان اس پر گواہ ہے۔ خود سرور کائنات ﷺ مسجد نبوی میں خواب سنتے اور تعبیر فرماتے تھے اہل ایمان جانتے ہیں کہ جس نے سرکار کو خواب میں دیکھا اس نے انہی کو دیکھا۔ صدر جارج بش کے عہد میں...... عالمی منصوبہ بندی کے ڈائریکٹر رابرٹ کرین نے اس حدیث مبارکہ پر تحقیق کی تو اسلام قبول کر لیا اور بالآخر خوشاب میں مولانا محمد اکرم کی مسجد میں دیکھے گئے۔ پھر امریکہ میں ان گنت پاکستانیوں نے اسے آنجناب کے قدموں میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔

جو ایمان رکھتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ غزوۃ الہند برپا ہو کے رہے گا اور وہ اس میں شرکت کی آرزو رکھتے ہیں کہ خود سرکار ﷺ نے آرزو کی تھی۔

اور جو ایمان نہیں رکھتے؟ جن کے دل یقین سے خالی ہیں یا جن کی نگاہیں دانش فرنگ کے جلوؤں سے خیرہ ہو چکیں وہ جو چاہیں کریں۔ ان کے لئے ان کی راہ اور ہمارے لئے ہماری راہ لکم دینکم ولی دین۔

شیخ مکرم

ہارون الرشید

۲۲ مئی ۱۹۹۹ء روزنامہ "جنگ" لاہور

سلسلہ اویسیہ کے شیخ مکرم مولانا محمد اکرم اعوان ایک فلمی تقریب کے لئے سٹوڈیو میں کیوں تشریف لے گئے؟

میں ان چند اخبار نویسوں میں سے ایک ہوں جو حضرت سے حسن ظن رکھتے اور اس کا برملا اظہار کرتے ہیں! لہذا بعض لکھنے والوں نے میرا نام لکھ کر سوال اٹھایا...... بات قرینے سے لکھی جاتی اور سوال سلیقے سے کیا جاتا تو تبھی اپنی معروضات پیش کر دیتا لیکن طعنہ زنی اور جواب طلبی کرنیوالوں کے مقابل 'اللہ کے فضل سے ہمیشہ خاموشی اختیار کی ہے۔ جن لوگوں کا گمان یہ ہے کہ وہ اپنے قلم کو خنجر کی طرح برت سکتے ہیں وہ اپنا شوق پورا کر لیں۔

دو ماہ پہلے جس روز یہ خبر چھپی میں نے جنرل حمید گل سے فون پر بات کی اور عرض کیا کہ اگرچہ یقین نہیں آتا لیکن جو جملہ آنجناب سے منسوب ہوا اس کا اسلوب

چغلی کھاتا ہے کہ کسی اخبار نویس کی اختراع نہیں......وہ ہنسے اور انہوں نے کہا'تم خود ہی تو کہتے ہو کہ صوفیوں کے معاملات عجیب ہوتے ہیں.....میں نے عرض کیا' حضور یہ میرا نہیں حضرت مولانا محمد اکرم اعوان ہی کا ارشاد ہے اور اس ضمن میں ہے کہ راہ سلوک کے مسافر بہت خوش گمان ہوتے ہیں اور ہر ایک پہ بھروسہ کر لیتے ہیں۔

اگلے روز مجھے اپنے بیٹے محمد بلال کے ساتھ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونا تھا کہ وہ ساتویں کا امتحان پاس کر چکا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے بڑے بھائی مامون الرشید کی طرح مولانا کی سرپرستی میں کارفرما صقارہ اکیڈمی میں آٹھویں کا طالب علم ہو جائے صقارہ اکیڈمی ملک کے بہترین تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے جہاں بچے نماز فجر کیوقت جاگتے اور عشاء پڑھ کر سوتے ہیں اس ادارے کے طالب علم راولپنڈی بورڈ کی پہلی تین پوزیشنوں کے لئے مقابلہ کرتے ہیں اور اسکے باوجود کرتے ہیں کہ وہ نقل کا حربہ استعمال نہیں کرتے پھر یہ کہ وہ ڈسپلن کی پابندی میں سب دوسروں سے بہتر ہیں اور عام نصاب کے علاوہ دین کی تعلیم بھی پاتے ہیں۔

یہ ایک بڑی ہی دلگداز سحر تھی......سارے بچے والدین کو عزیز ہوتے ہیں لیکن بلال جیسے بچوں کی جدائی اور بھی کٹھن ہوتی ہے سوچ سمجھ کر اس کا نام سرکارؐ کے خدمت گزار حضرت بلال حبشیؓ کے نام پر رکھا گیا تھا اللہ کے بھید اللہ ہی جانے لیکن گاہے گمان ہوتا ہے کہ اس کے لئے ہمیشہ کی جانیوالی دعاؤں میں سے شاید بعض قبول کر لی گئی ہوں'شاید سادگی'بے ساختگی'معصومیت اور عشق رسولؐ کے اس آفتاب کی ایک کرن اسے نصیب ہو جائے......جنرل حمید گل نے ایک بار گیارہ سال کی عمر میں اسے نماز پڑھتے دیکھا تو قدرے حیران ہوئے تھے میں نے عرض کیا وہ دوسرے بچوں جیسا ایک بچہ ہے لیکن عبادت کرے تو منہمک ہو جاتا ہے اور بات کرے تو توجہ

ہوتا ہے۔

اس کی ماں اور اس کے باپ کے لئے جن کا سب سے زیادہ سعادت مند فرزند پہلے دور جا چکا تھا الوداع کہنے کا لمحہ کٹھن تھا لیکن میں نے ارادہ کیا کہ تمام تر حسن ظن سے قطع نظر حضرت مولانا محمد اکرم اعوان کوئی دلیل پیش نہ فرما سکے تو میں بلال کو لے کر لوٹ آؤں گا اور ہو سکا تو بعد میں مامون کو بھی...... میں نے سوال کیا تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور پس منظر کی وضاحت کر دی لیکن میرا دل ہر گز ہر گز مطمئن نہ ہوا...... وہ بھانپ گئے اور وہ جلد بھانپ جانیوالے آدمی ہیں کہ روایتی عالم دین نہیں' اپنے قبیلے کے سردار ہیں' چالیس برس ریاضت کے مرحلوں سے گزرے ہیں اور اسطرح گزرے ہیں کہ کاروبار حیات سے رشتہ منقطع ہونے نہ دیا اور طبیعت کی بشاشت اس درجے میں برقرار رکھی کہ ایک بار کولیسٹرول کا لیول 730 تک جا پہنچا تو ڈاکٹر دنگ رہ گئے کہ کیسا آدمی ہے جو بستر پر لیٹ کر موت کا انتظار کرنے کے بجائے جنگلوں میں ہرنوں کا شکار کھیلتا پھرتا ہے۔ بہادر ایسے ہیں کہ جوانی میں ایک بار اساطیری ڈاکو محمد خان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بھاگ اٹھا اور بالآخر اس حال میں دنیا سے اٹھا کہ بیعت کر چکا تھا۔

انہوں نے میری تشویش کو بھانپ لیا اور حضرت حسن بصریؒ کی حکایت سنائی کہ کشمیری کنیز نے بغداد میں فتنہ اٹھا رکھا تھا...... ایک شب کے رقص و نغمہ کے لئے ایک لاکھ دینار طلب کرتی اور عشوہ و ادا کا عالم یہ تھا کہ رئیس زادے قدموں میں پڑے رہتے...... اپنے عہد کے نامور صوفی نے بھی ایک لاکھ ادا کئے اور نماز کے مصلے پر جا کھڑا ہوا...... رقاصہ سے فرمائش کی کہ وہ قیمت وصول کر چکی ہے' لہٰذا غسل کرے اور عبادت کے لئے آمادہ ہو جائے...... بغداد کے آسمان پر اگلی سحر اس طرح طلوع ہوئی کہ وہ تائب ہو چکی تھی اور کہانی ختم ہو گئی تھی۔

پھر مولانا اسماعیل شہید کا اس سے ملتا جلتا واقعہ سنایا اور کہا کہ میں لوگوں سے چندہ مانگتا ہوں اور نہ ووٹ...... انہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں...... نفرت گناہگاروں سے نہیں گناہ سے کی جاتی ہے اور کون جانتا ہے کہ اللہ کب کس کا دل پھیر ڈالے...... میں نے عرض کیا اخبارات طوفان اٹھادیں گے 'فرمایا شوق سے اٹھائیں' پہلے وہ کب عنایت کرتے ہیں...... ہزاروں لوگوں نے نفاذ شریعت کے لئے میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کی لیکن کہیں ڈھنگ سے خبر تک نہ چھپی' مجھے ان سے کیا واسطہ...... میں اپنی راہ کا مسافر ہوں' جو کچھ میرے شیخ نے مجھے عطا کیا تھا وہ ہجوم میں بانٹتا ہوں اور بانٹتا رہوں گا۔

ہاں' میں نے سوچا یہ کس قدر مختلف آدمی ہے۔ لیڈروں' سرداروں اور حکمرانوں کے ہجوم میں کڑے تیوروں کے ساتھ گفتگو کرنیوالا بے خوف بہادر' مظلوموں' بے بسوں' دہقانوں اور مزدوروں پہ دست شفقت رکھنے والا غنی وہ کہ جس کی دہلیز پہ پینٹاگان کا ڈائریکٹر گلوبل پلاننگ رابرٹ کرین مسحور ہو کے گر پڑا تھا۔ اور جس نے ہزاروں عامیوں اور خاصوں کی زندگی میں نور بویا ہے۔ آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں' وہ ایک آدم زاد ہی تو ہے وہ غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے اور شاید کبھی ایک بڑی غلطی کا بھی لیکن کوئی اسے مرعوب کر سکتا ہے اور نہ خوفزدہ...... وہ ان لوگوں میں سے نہیں جن کی شخصیت کا اسلوب زمانے کے رجحانات متعین کرتے ہیں' وہ تو ان نادر و نایاب انسانوں میں سے ایک ہے جو گاہے زمانوں کے رخ بدل دیتے ہیں...... آخر شب جاگنے اور اپنے رب سے ہمکلام ہونیوالا آدمی' اسے طعنہ زنی کرنیوالوں کی کیا پرواہ...... وہ سب کا رفیق ہے مگر سب سے جدا بھی ہے۔

حسین بن منصور حلاج حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو سمجھ گیا تھا...... اونٹ پہاڑ کے مقابل آیا تو ششدر ہوا لیکن پھر اس آدمی نے زبان کھولی اور پے

در پے سوالات کئے جو مخمصے میں الجھ گیا تھا اور اگلی منزلوں کے دروازے جس پر کھلتے نہیں تھے..... متوجہ ہو کر آپؒ سنتے رہے اور جب کلام کیا تو صرف یہ کہا: منصور! میں لکڑی کے ایک ٹکڑے کو دیکھتا ہوں جسے تم اپنے لہو سے رنگو گے..... یکایک خیال آیا' مولانا محمد اکرم اعوان دوسروں جیسے ایک آدمی ہیں لیکن وہ حضرت جنید بغدادی کے جانشین بھی تو ہیں..... غلط تو وہ یقیناً کر سکتے ہیں لیکن ان کی نیت پر آوازہ کسنے اور طعنہ زنی کرنیوالوں کو ہزار بار سوچنا چاہئے' حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علم اور سلوک کے اس روشن چراغ نے کہا تھا۔ جس نے اہل اللہ کا مذاق اڑایا ان کی موت یقیناً کفر پہ واقع ہو گی۔ اے ہمارے رب ہم خطاکاروں کو اپنے امان میں رکھنا' اے ہمارے پروردگار طعنہ دینے والوں پہ بھی رحم کرنا۔ کیا عجب ہے کہ اختلاف کرنیوالوں میں سے بعض پیروی کرنیوالوں سے زیادہ حسن نیت رکھتے ہوں لیکن وہ کہ وزارتوں کے خفیہ فنڈز اور حکمرانوں کی خاموش عنایات نے جن کی زبانیں دراز کر دی ہیں لیکن اے مالک تو انہیں بھی معاف کر دے اور دیارِ نور کے دروازے ان پر چوپٹ کھول دے۔

میں نے بلال کا ہاتھ انہیں تھمایا اور لوٹ آیا' ان کے موقف سے مجھے اب بھی اتفاق نہیں تھا لیکن میں جنید بغدادیؒ کے جانشین کی نیت پر شبہ کیسے کر سکتا تھا..... مجھ سا خطاکار تو اس تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہے لیکن جو تقویٰ کے پہاڑ پر براجمان ہوں' وہ جو جی چاہے کریں۔

انقلاب اور تنظیم الاخوان کی جدوجہد

قاضی غیاث الدین جانباز

روزنامہ خبریں 7نومبر 98ء

چند روز قبل اسلام آباد کے ایک روزنامہ میں برادرم محمد عمر فاروق کا ایک مضمون ''انقلاب کی تیاریاں اور پیش گوئیوں کا گورکھ دھندا'' کے عنوان سے شائع ہوا' جس میں انہوں نے میرے ایک مضمون کا حوالہ دیا۔ ان کا پورا مضمون تنظیم الاخوان اور اس کے امیر مولانا محمد اکرم کے خلاف غصے سے لبریز تھا۔ انہیں تنظیم الاخوان اور مولانا اکرم اعوان پر تنقید کا پورا حق ہے لیکن انہوں نے تنظیم الاخوان کے امیر اور اسکے عہدیداروں کی اکثریت کو سرمایہ دار اور کروڑوں پتی قرار دے کر زیادتی کی ہے کاش انہوں نے تصدیق کرلی ہوتی۔ اگر وہ ''مینارہ'' جاکر کروڑوں میں کھیلنے والے مولانا اکرم اعوان کا کروڑوں کا بزنس ان کا رہن سہن' ان کی خانقاہ ''دارالعرفان'' دیکھ آتے اور پھر کردار کشی کے لیے الزام تراشی فرماتے تو زیادہ

مناسب ہوتا۔ مشاہدہ پر مبنی الزام تراشی اور کردار کشی کے ذریعے وہ جنہیں خوش کرنا چاہتے ہیں ان کے مطالعاتی مشاہدہ سے شاید وہ غریبوں کی خوشی کے لیے بہتر انداز میں قلم و قرطاس کی بے آبروئی کا اہتمام کر سکتے تھے۔ انہوں نے تو تصدیق کیے بغیر اپنے مضمون میں مولانا اکرم اعوان کی لاہور کی فرضی پریس کانفرنس بھی لکھ ڈالی جس میں ان کے بقول اپریل میں لاہور میں ایک پریس کانفرنس کے دوران مولانا اکرم اعوان نے فرمایا کہ بارگاہ نبویؐ سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ اب نواز شریف کی حکومت جا کر رہے گی۔ میں بڑے ادب سے عمر فاروق صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ لاہور میں ماہ اپریل میں مولانا کی کوئی پریس کانفرنس ثابت کر دیں تو میں ان کے سارے جھوٹ کو سچ مان کر مولانا کیساتھ اپنی وابستگی ختم کرلوں گا۔ لاہور کی پریس کانفرنس میں ان سے منسوب الفاظ کا ثبوت دے دیں تو بھی میں مولانا کے ساتھ قطع تعلق کرلوں گا۔

مولانا محمد اکرم اعوان ایک صوفی اور روحانی شخصیت ہی نہیں۔ وہ محض مفسر قرآن ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ وہ قومی اور عالمی امور پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے بے شمار پریس کانفرسوں' علماء کنونشنوں اور عام جلسوں سے بھی خطاب کیا' انہوں نے کبھی کسی پریس کانفرنس یا کسی جلسہ عام میں بارگاہ نبویؐ کے حوالے سے نواز شریف حکومت جانے کی پیش گوئی نہیں کی۔ ملکی اور عالمی صورت حال کے حوالے سے ابتر اقتصادی صورتحال کے تناظر میں حکومت مخالف سیاستدان اپنے تجزیوں میں حکومت کے جانے کی باتیں کرتے ہیں اور ہر کسی کو اپنا تجزیہ پیش کرنے اور حکومت کی رخصتی کا اعلان کرنے کا حق ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں تبدیلی کا بگل بجنے اور جون میں تبدیلی کا ذکر کیا تھا اور یہ ذکر مولانا کے حوالے سے نہیں تھا۔ یوں بھی عمر فاروق کو مئی جون سے لے کر اب تک حالات

میں تبدیلی نظر نہیں آرہی تو یہ ان کی نظر کا قصور ہے۔ مولانا اکرم اعوان یا مجھے یا تنظیم الاخوان کی نواز شریف سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہمارے نزدیک نواز شریف کا جانا یا بر سر اقتدار رہنا مسئلہ ہی نہیں۔ تنظیم الاخوان کے نزدیک نصف صدی سے جاری' سیاسی' انتظامی' عدالتی اور اقتصادی نظام ناکام ہو چکا ہے۔ اب اس نظام کی رخصتی کا بگل بج رہا ہے' ہر صاحب نظر باشعور شخص اس نظام کی رخصتی کا شور سن رہا ہے۔ اس نظام کو نواز شریف بدل دیں اور اس کی جگہ اللہ کا بتایا ہوا نظام لے آئیں تو ہمیں خوشی ہو گی۔ اگر وہ ایسی جرأت رندانہ نہیں دکھاتے تو لاریب اب جاری نظام اور اسکے نگہبان بر قرار نہیں رہ سکتے اللہ قادر ہے۔ وہ کفر کی حکمرانی برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن ظلم کی حکمرانی اور اپنی مخلوق پر ظلم برداشت نہیں کرتا۔ وہ قادر و کریم ہے وہ اپنے نظام کے نفاذ کا کام نواز شریف سے لینے پر بھی قادر ہے' وہ کسی اور کو بھی یہ توفیق بخش سکتا ہے۔

مولانا اکرم اعوان اور تنظیم الاخوان اقتدار کی سیاست نہیں کر رہی' نہ اسے اقتدار سے کوئی دلچسپی ہے۔ ہم تو خلق خدا کو بتا رہے ہیں کہ اس ظالمانہ' غیر عادلانہ نظام سے چھٹکارا صرف اسلام کا نظام ہی دلا سکتا ہے۔ ہم نہ تو فارغ لوگ ہیں' نہ وقت گزاری کے لیے نفاذ اسلام کی اذان دے رہیں۔ ہم اس نیم جان قوم کو اسکے حال پر چھوڑنے کا گناہ نہیں کر سکتے۔ الحمدللہ ہم تن آسان لوگ بھی نہیں ہم حق کی اذان دینے کے لیے نکلے ہیں۔ وقت بتائے گا کہ ہم تن آسان ہیں یا اللہ کی راہ میں اللہ کے نظام کے لیے جسم و جان قربان کرنے والے لوگ ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ ہمیں قبول کرلے اور ہمیں توفیق عطا کرے کہ ہم ظلم مٹانے کی جدوجہد میں سرخرو ہو کر اپنی آخرت سنوار سکیں اور روز محشر ہم محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے شرمندہ کھڑے نہ ہوں کہ ہم نے ان کی اور اللہ رب العزت کی کامل اطاعت کا فرض کیوں

ادا نہ کیا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ صوفیوں کو کشف ہوتا ہے اور وہ اپنی حد تک اس کشف کو ماننے پر مجبور ہوتے ہیں بشر طیکہ ان کا کشف شریعت کے منافی نہ ہو۔ لیکن کسی صوفی کے کشف کو دوسروں کے لیے ماننا ضروری نہیں۔ کوئی صوفی اس وقت تک بیعت نہیں لے سکتا جب تک اسے خلافت کا مرتبہ حاصل نہ ہو اور خلافت کی سوغات سراجا منیرا کے دربار سے ملتی ہے' وہاں کی منظوری اور اجازت کے بغیر کوئی اپنی مرضی سے خلافت کسی کو نہیں دے سکتا۔ بیعت پیر نہیں' اللہ کے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ جب حضورؐ نے موت کی بیعت لی تھی تو وحی آئی تھی کہ اے میرے حبیبؐ یہ بیعت تیرے ہاتھ پر نہیں' میرے ہاتھ پر ہوئی ہے۔ مولانا اکرام اعوان اللہ کی مہربانی سے فنا الرسولؐ ہیں۔ ان کو یہ مرتبہ بلند وراثت میں نہیں ملا۔ وہ ایک عام انسان تھے لیکن ایک مرد درویش مولانا اللہ یار خان رحمتہ اللہ علیہ (جو مولانا مفتی کفایت اللہؒ کے شاگرد تھے) کی ایک نظر نے اکرم اعوان کی کایا پلٹ دی اور پھر پچیس برسوں کی اللہ اللہ نے انہیں اللہ والا بنا دیا۔ مولانا خود کہتے ہیں کہ میں گناہ گار انسان ہوں لیکن پتا نہیں اللہ نے مجھ پر اتنا کرم کیوں فرما دیا' یہ اللہ کی عنایت ہے۔ جس بندے پر اللہ کی اتنی بڑی عنایت ہو' اسے بھلا ملک کی صدارت' وزارت عظمیٰ یا وزارت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ ان دنیاوی مرتبوں کے حصول کی خاطر موت کی بیعت لیتا پھرے۔ صوفی تو اجیر ہوتا ہے' وہ اپنے مالک کا حکم ماننے اور اطاعت بجا لانے کا پابند ہوتا ہے۔

حضورؐ روئے زمین پر ظلم مٹانے کے لئے آئے تھے' کلمہ پڑھانے کے لیے انہیں مبعوث نہیں کیا گیا تھا اسی لیے قرآن نے کہا کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ ظلم مٹانے اور اللہ کے عطا کردہ نظام کو نافذ کرنے کے لئے حضورؐ نے جدوجہد کی۔ آج

انسانیت ظلم کی چکی کے پاٹوں میں پڑی سسک رہی ہے۔ حضورؐ کی صحیح اتباع کا تقاضا ہے کہ ہم فرمان رسولؐ کی اطاعت کریں اور وہ راستہ اختیار کریں جو ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ اس راستہ کو اختیار کرنا نواز شریف، بینظیر، فاروق لغاری، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا سمیع اللہ اور مولانا اکرم اعوان سمیت سب کی ذمہ داری ہے۔ اطاعت رسولؐ کے بغیر اللہ اپنی اطاعت بھی قبول نہیں فرماتا۔

اسلام عملی زندگی کا نام ہے

قاضی غیاث الدین جانباز

مولانا اللہ یار خانؒ عصر حاضر میں بہت بڑے ولی گزرے ہیں جو چند برس قبل انتقال فرما گئے ان کا ایک واقعہ ماہنامہ "المرشد" لاہور میں شائع ہوا ہے قارئین کی دلچسپی کے لئے اس واقعہ کو پیش کر رہا ہوں جب مولانا اللہ یار صاحب کو اللہ کریم نے معرفت کی دولت عطا فرمائی اور اسے آگے تقسیم کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی' تو آپ موضع موہڑہ کور چشم میں تشریف لے گئے۔ اس وقت چند ساتھی جو اللہ کا ذکر کرتے تھے وہ بھی آپ کے پاس پہنچ گئے۔ رات کو جب عشاء کی نماز میں آپ نے قرأت شروع کی تو احباب کی چیخیں نکل گئیں' وہاں پر آپ کے ایک پرانے دوست تھے جو عالم دین بھی تھے اور گاؤں میں دکانداری کر کے رزق کماتے تھے' انہوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے ہماری نمازیں خراب کر دی ہیں' حضرت جی نے اسے بھی دعوت دی وہ حضرت جی سے کہنے لگے آپ میرے بچپن کے دوست تھے لیکن آج تک آپ نے اپنے

کو چھپائے رکھا۔ آپؒ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس یہ دولت نہ تھی 'اب ہے۔ محنت کرو اور حاصل کرو اس نے محنت کی اور خوب مجاہدہ کیا کچھ عرصہ بعد وہ عالم دین فوت ہوگئے اور جب مولانا نے اس کی قبر پر نگاہ کی تو قبر دس میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی مولاناؒ نے اس سے پوچھا کیا حال ہے تو اس نے عرض کی اللہ کریم نے آپؒ کی نسبت سے بہت کرم کیا ہے 'لیکن گاؤں میں جو میری دکان تھی اس پر گاؤں کی عورتیں گندم یا کوئی دوسری جنس لے کر آتی تھیں تو ترازو میں ڈالتے وقت کچھ دانے پلڑے سے نیچے گر جاتے تھے میں جھاڑو دیتے وقت ان دانوں کو اپنے مال میں شامل کر لیتا' یہ دانے میرے تو نہ ہوتے تھے 'دوسروں کا مال تھا مگر اب ان دانوں کا حساب دینا مشکل ہو رہا ہے یہ دانے مجھے نہیں چھوڑتے۔

یہ عبرت آمیز واقعہ پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے' شاید چند برس قبل میں نے یہ واقعہ پڑھا اور سنا ہوتا تو میرے دل و دماغ کے اوپر سے گزر گیا ہوتا' اس لئے کہ عقل کب ایسی باتوں پر یقین کرنے دیتی ہے ہم جیسے لوگ جو سرتاپا دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں جن کا آخرت پر ایمان نہ ہونے کے برابر ہے اور جن کا مقصد حیات ہی کھاؤ پیو اور عیش کرو ہے وہ بھلا ایسے واقعات پر کب یقین کر سکتے ہیں' تاوقتیکہ اللہ رب العزت اپنی رحمت کی چادر میں سمیٹ کر کسی کو ہدایت نہ عطا فرمائے۔

جی ہاں ترازو سے گرنے والے دانوں کا حساب مرحوم عالم دین کو نہیں چھوڑتا' تاوقتیکہ جن کا مال تھا وہ معاف نہ کر دیں' حساب تو اللہ نے لینا ہے اگر اللہ کے مال کا معاملہ ہوتا تو وہ بڑا معاف کرنے والا رحیم ہے' معاف فرما دیتا ہے' بندوں کے مال اور بندوں کے حقوق غصب کرنے والوں کو تو بندے ہی معاف کریں تو دانے چھوڑیں اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ اپنے حقوق تو معاف کر دے گا لیکن حقوق العباد غصب کرنے والوں کی معافی نہیں ہوگی۔ اللہ نے احتساب بہر حال کرنا ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں' پچاس سال سے اقتدار کے ایوانوں میں براجمان رہنے والے سیاستدانوں، افسروں، سرکاری ملازموں، سیاسی جماعتوں کے کارکنوں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، تاجروں اور دکانداروں کو سوچنا چاہئے کہ جب دو چار گندم کے دانوں کا احتساب ہو رہا ہے تو پھر اللہ کریم قومی خزانہ لوٹنے والوں، انصاف بیچنے والوں، مزدوروں کی محنت کا استحصال کرنے والوں، مزارعین کا حق کھانے والوں، منافع خوروں، ذخیرہ اندوزوں، کم تولنے والوں کا احتساب کیوں نہیں کرے گا۔

جنرل ضیاء الحق، غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری نے 85ء سے 97ء تک کی حکومتیں اور اسمبلیاں لوٹ مار کے الزامات کے تحت برخاست کیں، نواز شریف اور بے نظیر نے ایک دوسرے پر لوٹ مار کے سنگین الزامات عائد کئے اور احتساب کے نعرے لگائے، ایک دوسرے کے خلاف ریفرنس بھی بھیجے ہیں۔ چلئے یہاں کے احتساب سے تو وہ ایک دوسرے سے مل ملا کر سودے بازی یا بلیک میلنگ سے بچ جائیں گے لیکن اللہ کی عدالت سے وہ کس طرح بچیں گے ؟

حکمران طبقات نصف صدی سے خلق خدا کے حقوق کچلتے آرہے ہیں بلکہ دین الٰہی کو نافذ نہ کر کے اللہ کے حق اللہ کے فرمان کی جو نفی کر رہے ہیں اس کا ان کے پاس کیا جواب ہو گا۔

جی ہاں! اللہ تو دانے دانے کا حساب لیتا ہے۔ اس دنیا میں بھی اپنا غضب مسلط کر دیتا ہے اور اس دنیا میں بھی حساب لے گا یہاں کا حساب تو شروع ہو چکا ہے، زلزلے آرہے ہیں، ٹرینیں حادثات کا شکار ہو رہی ہیں، دہشت گردی، قتل، ڈاکے، لوٹ مار، معیشت کی تباہی، مہنگائی اور فصلوں کی بربادی یہ سب اللہ کے عذاب کی اس دنیا میں شروعات ہیں، عذاب کا آغاز کس انتہا کو پہنچے جو ہماری طرف چنگھاڑتا بڑھتا چلا آرہا ہے۔ گندم کے ساتھ گھن بھی پسے گا، اللہ کا تماشا شروع ہو چکا۔ احتساب کی آوازیں آسمان سے زمین کی طرف آرہی ہیں۔

میں وی جانا جھوک رانجھن دی،
نال میرے کوئی چلے

روزنامہ اساس 27 اکتوبر 1998ء

گلزار آفاقی

پچھلے کئی دنوں سے میرے جی میں ان کے لیے ایک کھچ سی لگ گئی تھی' ایک تانگ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ مختلف وسیلوں سے پہنچنے والی ان کی باتوں کا رس بوند بوند 'لوح سماعت پر ٹپکتا اور ویرانہ دل کو نہال کر جاتا۔ قلم قبیلے کے کچھ ساتھی ان سے ملاقاتوں کا حال سناتے یا ان کے بارے میں کوئی تحریر نظر سے گزرتی تو خیالات میں ایک تموج سا اٹھتا۔ گاہے مجھے ان کی فکر کے ساتھ انجذاب کا احساس ہونے لگتا۔ مگر پھر کشاکش زندگی' کسی تیز و تند لہر کی مانند جذبہ واحساس کی سب پھول پتیوں کو بہالے جاتی۔ زندگی معمول کی ڈگر پر چل نکلتی۔ لگتا کہ سب کچھ تحلیل ہو گیا ہے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ تفکر کے کسی لمحے میں روشنی کی ایک صبیح و سبک لہر ہولے سے پہلو بدلتی اور ان کا تصور' ان کا سراپا تنبومن کر مجھے اپنے گھیرے میں لے

لینا۔

کیاوہ واقعی ایک مختلف ہستی ہیں۔'

ایک منفرد شخصیت ہیں'ایک جدا اکلبوت ہیں' جو دل کو گداز بخشتے ہیں اور چاہنے والوں کی تہذیب نفس کرتے ہیں۔

کیاوہ آبلہ پائی میں مبتلا مسافر کے لئے اپنے ہاں نخلستان کا سبزہ اور خنک سایہ رکھتے ہیں۔ کیاان کے ہاں چشمے کے ٹھنڈے میٹھے اور شفاف پانی کاذائقہ پایاجاتا ہے۔

کیاوہ ایسا کنواں ہیں جو ایسے پیاسوں کی آس مراد بن سکتا ہے'جن کے بو کے چھیکو چھیک ہوتے ہیں۔

کیاوہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عقیدت کے ساتھ ساتھ بصیرت کا جوہر بھی شامل کر سکتے ہیں۔

کیاوہ اسلام کو کلام و طعام سے ماورا نظام میں بھی داخل کرنے کا عزم و پروگرام رکھتے ہیں۔

اور کیاوہ پاکستانی معاشرے میں اسلام کو ایک موثر سماجی'سیاسی اور اقتصادی قوت کے طور پر نافذ العمل کرنے کا اور اک وارادہ پاچکے ہیں۔

سوال ہی سوال اور ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب اتر تا'

ہاں ہاں ہاں.....

کیونکہ وہ ایک مختلف'منفرد اور دلفریب شخصیت ہیں۔ روایت وجدت کا امتزاج' عقیدت و بصیرت کا مرقع' ذکر و فکر کے دھنی'حکیمانہ حرکت و عمل کے رسیا' شب بیدار و صبح خیز۔ قرآن میں غوطہ زنی کرتے ہیں اور وہاں سے معانی و مفاہیم کے ایسے ایسے آفتاب چن کر لاتے ہیں کہ ان کی روشنی میں'بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل تک ساری راہ صاف دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان کے زوایہ افکار میں زندگی کے ہر ڈھب

کے لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں۔ سابق جرنیل' بیوروکریٹ' کاروباری لوگ' ماہر معاشیات' سائنسدان اور غریب مسکین' بے کس و بے بس افتادگان خاک' زندگی کے ہر شعبے کے ماہرین پر مشتمل ان کا ایک تھنک ٹینک ہے' جو "رب کی دھرتی پر رب کا نظام" قائم کرنے کے سلسلے میں ہر قسم کے ہوم ورک سے آراستہ ہے۔

میرے ذہن میں ان کی شخصیت کرشماتی صفات کے ساتھ گھر کرتی جا رہی تھی۔

کیا میں ان کے ساتھ کسی فکری رومانس میں مبتلا ہو گیا ہوں' میں اکثر خود سے یہ سوال کرتا' ڈور کا سرا اور الجھ جاتا۔

ایک روز خبر آئی' انہوں نے میرے سوہنے شہر لاہور میں ہزاروں افراد سے " موت کی بیعت " لی ہے۔

موت کی بیعت؟..... میں چونک پڑا۔

زندگی کی بیعت کیوں نہیں؟

موت تو زندگی کا ایک لمحاتی موڑ ہے جس کے بعد زندگی پورے شباب کے ساتھ کسی نہ کسی صورت میں اپنا تسلسل برقرار رکھتی ہے' ارتقائی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے لہذا بیعت یا کوئی کومٹ منٹ' وابستگی یا خود سپردگی تو زندگی کے ساتھ' ہونی چاہیے۔

ہاں ایسا ہی ہے موت کی بیعت دراصل ایثار' قربانی اور کومٹ منٹ کی ارفع تر صورت ہے۔

یہ بات ہے تو موت کے بجائے شہادت کیوں نہیں' شہادت کی بیعت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ موت تو جسمانی و حیاتیاتی عمل سے وابستہ ایک موڑ ہے جبکہ شہادت اسے روحانی لذتوں کی ابدیت سے آشنا کر دیتی ہے۔ موت کا ذائقہ تو ہر ذی نفس کو چکھنا

ہے مگر شہادت کا مرتبہ بلند تو ایک واضح نصب العین کے حصول کی خاطر کو مٹ منٹ کی انتہاؤں کو چھونے والے جذبہ وایثار و قربانی کا لازوال استعارہ ہے۔

گا ہے خیال کا کوندا لپکتا'

چکوال چلو' منارہ پہنچو' گرہوں کو اور گتھیوں کو سلجھاؤ اور ان کی حضوری سے اپنا دامن دل بھر لو...... مگر رشتہ و تعلق کا کچا پن آڑے آجاتا۔

چند روز پہلے معلوم ہوا وہ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایک خطاب فرمانے والے ہیں۔ میرے دل میں خوشی کی ایک کلی سی چٹک گئی۔

علی الصبح بیدار ہوا۔ اخبارات اٹھانے باہر نکلا تو گھر کی بیرونی دیوار پر ایک بڑا سا رنگین پوسٹر دکھائی دیا۔ ایک متبسم چہرہ میرے روبرو تھا۔ یقین وایقان کی دمک سے سجا ہوا' جو اہل صفا کا خاص وصف ہے۔ سیاہ داڑھی اور سر لشکریوں کی روایتی ٹوپی سے آراستہ!

یہ حضرت قبلہ مولانا محمد اکرم اعوان تھے جو اس پوسٹر کے وسیلے سے میرے گھر کو رونق بخش رہے تھے' میرے کوچہ دل کے مہمان بن چکے تھے۔ میں کئی ساعتیں ان کے بارعب اور متبسم چہرے پر ٹکٹکی باندھے کھڑا رہا۔ پھر مجھے یوں لگا گویا وہ میری حیرت کو بھانپ گئے ہوں' مجھے ان کے لب وا ہوتے ہوئے نظر آئے'

کیوں حیران ہوتے ہو' اللہ کے درویش اسی طرح چپکے سے گھر' در اور دل میں داخل ہو جایا کرتے ہیں۔ نسیم صبح کی طرح' خوشبوئے کوئے یار کی مانند۔ اس وقت ہم تمہارے مہمان ہیں اور کل تم ہمارے مہمان ہو گے۔ لیاقت باغ میں بعد از نماز مغرب ایک اجتماع ہے' ضرور آئیے۔

مجھے اپنے علاقے میں کسی اور گھر اور در و دیوار پر ایسا پوسٹر دکھائی نہ دیا۔

میں نے یہ جانا گویا یہ میرے لئے خصوصی نوعیت کی

TELEPATHIC دعوت ہے۔ رابطے اور حاضری کی اپنے انداز کی ایک سبیل ہے۔ میں نے طے کیا کہ جلسے میں ضرور حاضری دوں گا۔

شام تک مجھے شدید فلو اور بخار ہو گیا۔ میں نے اپنی توانائی مجتمع کی' نقاہت کے باعث گاڑی چلانا دشوار تھا۔ سوچا' ٹیکسی پر چلنا چاہیے۔ ایک فرلانگ پیدل چلتے ہوئے بخار اور نقاہت سے میں نڈھال ہو گیا' کوئی سواری میسر نہ آسکی۔ میرے لئے گھر واپسی کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔

میں چند گام کے فاصلے پر بھی اپنے ممدوح کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا' ان کے افکار عالیہ سے فیض نہ پا سکا۔ شاید میرا رشتہ ء تعلق ابھی بہت خام ہے' میرا اندر میل اور کھوٹ سے بھرا پڑا ہے' میرے جیسا آدمی ان کے دربار میں جانے کا اہل نہیں۔

مگر پھر جی نے کہا کہ صوفی کا دربار سے کیا تعلق۔ دربار تو تیرے اپنے من کے اندر ہے' درباری تو تو خود ہے' تیری سوچ درباری ہے' ورنہ ایک صوفی اور درویش کا آستانہ تو ایک دھوبی گھاٹ ہوتا ہے جہاں تیرے جیسے میلے کچیلے لوگ ہی دھلائی یا دھنائی کے لئے لائے جاتے ہیں۔ مگر تو میل کا اس قدر رسیا اور عادی ہو چکا ہے کہ دھوبی گھاٹ جانے سے کتراتا ہے' ڈرتا ہے..... کہیں مارا نہ جاؤں۔

ہاں میں واقعی ایک میلا آدمی ہوں' میرا رشتہ ء تعلق ابھی بہت کچا اور خام ہے۔ میں ڈرنے والا اور خوف زدہ شخص ہوں۔ مگر ان ساری کمیوں کجیوں کے باوجود میرے دل میں ان کی کھنچ اور تانگ بدستور بڑھتی جا رہی ہے۔ کشش و جذب کا تموج بدستور برپا ہوتا ہے اور اس بھیگی رات میں جب حضرت مولانا محمد اکرم اعوان مجھ سے چند گام کے فاصلے پر اپنے چاہنے والوں میں انقلاب کی پنیری بو رہے ہوں گے میں اپنے بوجھل دل میں حضوری سے محرومی کا ویرانہ سجائے یہ سطریں رقم کر رہا ہوں۔ احساس کی تپش سے میرا جسم پھنک رہا ہے اور دل میں ایک ہی ہوک بسی ہوئی ہے۔

میں وی جانا جھوک رانجھن دی
نال میرے کوئی چلے

اگلے روشن دن فون کی گھنٹی بجی' دوسری طرف میرے پرانے مہربان اور دانشور دوست جناب غیاث الدین جانباز لائن پر تھے۔ عرصہ پچیس سال بعد یک بیک اس رابطے میں کیا بھید تھا۔ ان کی لہجہ کانوں میں رس گھولنے لگا۔

کل رات حضرت صاحب کی محفل میں آپ کا ذکر ہوا ہے' آپ اپنی سہولت کے مطابق قبلہ حضرت صاحب سے جب چاہیں ملاقات کر سکتے ہیں' اس سلسلے میں تنظیم الاخوان کے نمائندے کرنل (ر) بشیر احمد صاحب آپ سے رابطہ کریں گے۔

مگر آپ کو میری اس تانگ اور کھچ کا علم کیسے ہوا'

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ویسے آپ کے سلسلے میں آپ کے دوست ضیا منصور کھوکھر وسیلہ بنے ہیں۔

کیا ایک بندے کا حرف آرزو یوں بھی قبولیت پاتا ہے' مجھے اندازہ نہ تھا۔
مجھ ادھورے آدمی کو رانجھن کی جھوک کے لئے رفیق سفر مل گئے ہیں۔

گہری رات اور فجر کی خبر دینے والے

روزنامہ اساس 30 اکتوبر 1998ء

آج پھر اجالے کی ایک کیف آور موج نے میرے جسم و جاں کو شرابور کر دیا ہے۔ میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا مگر ذہن میں عمل کسی اور پروگرامنگ کا جاری تھا۔ وہ رب کی دھرتی پر رب کا نظام چاہتے ہیں، کیسی صورت ہو گی اس دھرتی کی تب کیا رنگ ہو جائے گا اس دھرتی کا پھر۔ سورج کی روشنی اور تازہ آکسیجن ہر کس و ناکس کو یکساں طور پر زندگی کا پیغام دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہر کس و ناکس کا فرق مٹ کر رہ جاتا ہے۔ رب العالمین اور رحمت اللعالمینﷺ کی تعلیمات کے طفیل، رب کی دھرتی کے اوپر اور نیچے پایا جانے والا سامانِ نشوونما رب کے بندوں کے لیئے کھل جاتا ہے۔ تب ساری بھوکیں، ساری احتیاجیں مٹ جاتی ہیں، سارے برج الٹ جاتے ہیں۔ سارے شملے سمٹ جاتے ہیں، ظلم و ستم کے سارے نشان تلپٹ ہو جاتے ہیں۔

کیا وہ بھی یہی چاہتے ہیں، رب کی دھرتی پر رب کے نظام کا ایک ایسا ہی تصور اپنے ہاں رکھتے ہیں، ان کے پاس اس عظیم الشان نظام کے نفاذ کی حکمت عملی کیا ہے؟

میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا مگر ذہن کی سکرین پر انہی کا تصور' انہی کی تصویر نقش تھی۔ اتنے میں آج کی ڈاک آگئی۔

لفافے چاک کرتے ہوئے ہاتھ یکبار گی رک گیا۔ ایک ہی نظر میں دل میں ایک نیا منظر کھل گیا۔ اجالے کی ایک لہر سربلند ہوئی اور مجھے کیف ونشاط سے شرابور کر گئی۔

آج پھر ٹیلی پیتھی کی لائن جڑ گئی تھی۔

ٹیلی پیتھی نہیں اللہ پیتھی کہو۔ بالکل جیسے دو سال پہلے حضرت میاں جی عبدالغفور صاحب کے ساتھ جڑ گئی تھی۔

یہ قبلہ میاں جی عبدالغفور صاحب اور حضرت مولانا محمد اکرم اعوان جیسے پیارے پیارے سوہنے سوہنے بابے کیا ہیں؟ اپنے اندر کون سی مقناطیسی قوت رکھتے ہیں اور اس وقت کا منبع' محور اور مرکز کہاں ہے؟ اور یہ بابے کیا ہیں جو نسیم صبح کی طرح' خوشبوئے کوئے یار کی مانند چپکے سے' ہولے سے انسان کے گھر' در اور دل میں آبستے ہیں اور پھر یہ بستیاں اپنی لہر میں بستیوں کی بستیاں بسائے چلی جاتی ہیں۔

میں نے مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کا فرستادہ مکتوب گرامی کھولا۔

الاخوان پاکستان کے لیٹر پیڈ پر 24 اکتوبر 98ء کی تاریخ کے ساتھ یہ مکتوب ان موتیوں سے مالا مال ہے:

عزیز گلزار آفاقی صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ' آپکا آج کا کالم (راکھ کا ڈھیر) سامنے ہے۔ عباس اطہر صاحب کی بات بالکل درست اور آپ کی اہلیہ کی بات صحیح۔ ایک رائے میں بھی عرض کردوں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا خود کو بندوق کی نوک پہ پایا اور اب میری عمر پینسٹھ (65) برس ہے۔ زندگی اللہ کی طرف سے تھی۔ کوئی مار نہ سکا مگر بندوقیں اب بھی ہر طرف تنی ہیں اور اب اگر مار بھی لیں گے تو کیا تیر ماریں گے۔ زندہ رہنا مقصد

نہیں بلکہ حق کے ساتھ رہنا مقصد ہے۔احتیاط ضرور کیجئے۔لیکن سچ بھی ضرور لکھیے اور سمجھوتہ'وہ بھی باطل کے ساتھ 'دراصل یہ موت ہے۔اللہ آپ کو اس سے بھی محفوظ رکھے۔

انشاء اللہ فجر طلوع ہونے والی ہے۔اس کی خبر رات کی گہری تاریکی دے رہی ہے۔اللہ ہم سب کو طلوع فجر کا حسین منظر نصیب کرے۔

ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ

امیر محمد اکرم اعوان

میں ایک بار پھر مہمان عزیز کی میزبانی کی عزت و سعادت پا رہا ہوں۔وہ پہلے تصویر کے ذریعے تشریف لائے تھے 'اب تحریر کے وسیلے سے نہاں خانہ دل میں اترے ہیں۔کرنل (ر) بشیر احمد صاحب اسے میری خوش بختی سمجھتے ہیں۔مگر دوسری طرف میں "بے ادبی" کا مرتکب ہو رہا ہوں۔قبلہ حضرت صاحب کی قدم بوسی کے لئے تو مجھے چکوال جانا ہے 'منارہ پہنچنا ہے۔دن میں کئی بار میرا جی یہی حرف آرزو الاپتا ہے۔

میں وی جانا جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے

برادرم بشیر احمد صاحب تشفی دیتے ہیں اور رانجھن کی جھوک جانے کے لئے اپنے وعدہ رفاقت کا اعادہ کرتے ہیں۔

"بس چند روز کی بات ہے قبلہ حضرت جنوبی پنجاب کے دورے کے بعد بالائی علاقہ جات جانے والے ہیں 'بیچ میں ایک دو روز کے لئے منارہ 'چکوال میں قیام ہو گا آپ کی سہولت کے مطابق ہم کسی لمحے بھی سفر کے لئے پر تول سکتے ہیں"۔

کرنل بشیر احمد صاحب کی باتوں سے جھوک رانجھن دی قریب نظر آنے لگی تو پاپی دل پھر سے اڑی پر اتر آیا۔اب لوں لوں میں جمع ہو جانے والی میل اور کھوٹ تھی جو ارادے کو بوجھل کر رہی تھی۔

کیا میں اللہ کے ایک نیک بندے کی حضوری کے قابل ہوں؟۔ دل میں ایک سوال اٹھا۔ یہ سوال دو سال پہلے بھی اٹھا تھا جب میں حضرت قبلہ میاں جی عبدالغفور صاحب کے ہاں حاضری سے گریز میں گرفتار تھا۔ تب جی نے کہا تھا کہ اللہ کے نیک بندوں کے آستانے تو دھوبی گھاٹ ہوتے ہیں جہاں میرے جیسے میلے کچیلے کپڑے ہی لے جائے جاتے ہیں۔ دھلائی اور دھنائی کے لئے۔ حضرت قبلہ محمد اکرم اعوان صاحب کے آستانے کو بھی ویسا ہی دھوبی گھاٹ سمجھو۔ تم نے میاں جی کے ہاں سے عقیدت کی دولت سمیٹی ہے حضرت اعوان صاحب کے معدن سے بصیرت کے موتی چن لاؤ۔

مولانا اکرم اعوان صاحب نے اپنے خط کے ایک سادہ سے جملے میں بصیرت کے کیسے انمول موتی بکھیر دیئے ہیں۔

"زندہ رہنا مقصد نہیں بلکہ حق کے ساتھ رہنا مقصد ہے"۔

میرے سامنے ایک اجلا منظر کھل گیا

سرداران قریش میرے آقاؐ کے ہاں آتے ہیں' وہ آپ کو راہ حق سے ہٹانے کی غرض سے اپنے تمئیں ترغیب و تحریص کے سارے حربے آزماتے ہیں۔ دولت وثروت اور سرداری و حکمرانی کی بے انت پیشکشیں ہوتی ہیں' مگر میرے آقاؐ ایک ہی محکم اور غیر متبدل فرمان پر قائم رہتے ہیں۔

تم لوگ میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی رکھ دو تو بھی میں راہ حق پر ہی قائم رہوں گا۔

اور پھر تمام کائنات نے دیکھا کہ میرے آقا رحمت اللعالمینؐ کس آن بان شان کے ساتھ حق اور سچ پر قائم رہے کہ خود خالق کائنات پکار اٹھا کہ اے حبیبؐ میں نے آپ کا ذکر پاک سربلند کر دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ قبلہ اکرم اعوان صاحب جب حق سے مشروط زندگی کی اہمیت

اور ناگزیریت اجاگر کرتے ہیں تو ان کے ہاں وہی حق اور سچ ہے جو میرے آقا کی سیرت پاک کے جزو جزو میں خوشبو کی طرح بسا ہوا ہے۔

میں جب اپنے گردو پیش نگاہ دوڑاتا ہوں تو چند محترم استثناؤں کو چھوڑ کر ہر سو حق دشمن قوتیں ہندوقیں تانیں دندناتی دکھائی دیتی ہیں۔ ذات اور معاشرت کا کون سا گوشہ ہے جہاں باطل قوتیں کسی نہ کسی نقاب میں سرگرم عمل نہیں۔ ہماری معیشت' ہماری صنعت' ہماری سیاست' ہماری زراعت اور ہماری تجارت کا کوئی زاویہ کوئی پیمانہ اٹھا کر دیکھ لیجئے' حق نام کی حقیقت شاید ہی کہیں نظر آئے۔ جہاں حق نہیں ہوتا وہاں باطل ہوتا ہے' ظلم ہوتا ہے' ظلمت ہوتی ہے اور یہ سب کچھ گھٹا ٹوپ تاریکی اور اندھیروں کا سماں باندھنے والے ہوتے ہیں۔

حضرت امیر محمد اکرم اعوان صاحب اسی کیفیت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"انشاء اللہ فجر طلوع ہونے والی ہے' اس کی خبر رات کی گہری تاریکی دے رہی ہے۔ اللہ ہم سب کو طلوع فجر کا حسین منظر نصیب کرے"۔

مگر اے امیر محترم اس وعدہ فردا کے ایفا کی گھڑی کب آئے گی؟

وہ سعد ساعت کب بطن امکان سے پھوٹے گی؟

دعا کے ساتھ وہ کون سی دوا ہے جو اس بیمار دیرینہ کو شفا دے گی؟

وہ مبارک گھڑی کب طلوع ہو گی جب اسلام کا تنبو ذات سے معاشرت تک اور آستانوں و خانقاہوں سے کھیتوں' کھلیانوں اور کارخانوں تک تان دیا جائے گا؟

اک عالم آپکی عقیدت و بصیرت میں گندھی ہوئی عطا کا منتظر ہے۔

اے محترم امیر! یہ فقیر قلم کار بھی اسی دھارے کا ایک جز و بن کر انتظار کشی کے ان لمحوں میں آپ کے تصور کو جی جان میں سمائے ہوئے ہے اور اجالے کی کیف آور موجیں مجھ جیسے میلے آدمی کو نہال کئے جا رہی ہیں۔

میرے پیا گھر آئے (1)

روزنامہ اساس 29 نومبر 1998ء

گلزار آفاقی

آدمی کے ارادوں کو چاٹنے والی شکست و ریخت اور پروانے کی قدرت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ قبلہ حضرت جی کی قدم بوسی کے لئے چکوال جاؤں، منارہ پہنچوں اور اپنے دل کی بے قراری کو ان کے حضور پیش کروں، مگر ایسا نہ کر سکا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ ایک مہینے کے مختصر دورانیے میں متعدد بار راولپنڈی تشریف لائے۔ برادر مکرم کرنل (ر) بشیر احمد کی وساطت سے دعوت ملاقات بھی ایک تسلسل کے ساتھ برقرار رہی مگر ہر بار ہی کوئی نہ کوئی وجہ آڑے آتی رہی۔ ذرا غور کرتا تو اس ظاہری وجہ کے پیچھے میرے لوں لوں میں جمع ہو جانے والی میل اور کھوٹ تھی، جو میرے ارادوں کو بد عملی، بناتی اور شکست و ریخت میں مبتلا کرتی رہی۔ میں منارہ پہنچا نہ راولپنڈی میں ہی حضرت جی کی خدمت میں حاضر ہو سکا۔ مگر دوسری طرف عالم یہ رہا کہ پچھلے کچھ عرصے سے میرے جی میں ان کے لئے جو ایک

کچھ سی لگ گئی تھی اور جو ایک تانگ سی محسوس ہونے لگی تھی اس میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ مختلف وسیلوں اور رابطوں اور بطور خاص حضرت جی قبلہ کی تصنیفات کے مطالعے سے ان کی فکر و نظر کا رس 'بوند بوند میری لوح قلب پر ٹپکتا رہا' مجھے نہال کرتا رہا۔ اسی عرصے میں ان کی ہستی کے ساتھ میرا ایک TELEPATHIC رشتہ بھی استوار ہو گیا۔ گاہے سوچتا 'کیا میں ان کے ساتھ کسی فکری رومانس میں مبتلا ہو گیا ہوں یا میں بھی غیر محسوس طور پر ان کی ذات کی کرشمہ صفتی کا اسیر ہوں۔ مگر مجھے اپنے اندر سے کوئی واضح جواب نہ ملتا۔ ڈور کا سرا اور الجھ جاتا۔ کبھی میرے وجود کے کسی گوشے سے بھیں بھیں کرتی ایک اور آواز اٹھتی۔ اوئے میلے کچیلے آدمی 'پاپ تیرے انگ انگ میں رچا ہوا ہے۔ توڑنے والا اور خوف زدہ شخص ہے۔ تیرا رشتہ و تعلق خام اور کچا ہے تو کیسے مل سکتا ہے اللہ کی برگزیدہ ہستی کو پھر ایک روز مجھے کچھ آسرا سا ہوا۔ انہوں نے میرا ایک کالم پڑھ کر مجھے خط لکھا۔ دعاؤں 'آرزوؤں اور ارادوں سے مالا مال مختصر ساخط۔ کوزے میں سمندر سمیٹ دیا تھا حضرت جی نے۔ ایک جملہ یوں تھا۔

"زندہ رہنا مقصد نہیں 'بلکہ حق کے ساتھ زندہ رہنا مقصد ہے۔"

دوسری نوید یوں تھی۔

"انشاء اللہ فجر طلوع ہونے والی ہے۔ اس کی خبر رات کی گہری تاریکی دے رہی ہے۔ اللہ ہم سب کو طلوع فجر کا حسین منظر نصیب کرے۔"

مگر یہ طلوع فجر کب اور کیونکہ ہو گی 'ایسی نویدیں تو سنتے سنتے ہم جی تک ہار چکے ہیں۔ اور اندیشے پھر سے سوچوں کو جکڑنے لگتے 'پھر ان کی کوئی تصنیف 'کوئی بیان زیر مطالعہ آجاتا تو ایک نیا اجالا مہمان ہو جاتا۔

وہ رب کی دھرتی پر رب کا نظام چاہتے ہیں۔ جس طرح سورج کی روشنی اور

آمیجن ہر کس و ناکس کو یکساں طور پر زندگی کا پیغام دیتی ہے یہاں تک کہ ہر کس و ناکس کا فرق مٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح رب العالمین کی منشا ہے کہ انسان بھی اللہ کی عطا کردہ اور جناب رسالتمآب کی وساطت سے ملنے والی رہنمائی میں اپنے سماج میں ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرے جس میں ہر فرد کو اس کے حصے اور ضرورت کا سامان نشو و نما بلا روک ٹوک میسر رہے۔ یہی شریعت محمدیؐ ہے۔

ہیولوں' سایوں اور اجالوں کی اسی ادھیڑبن میں ایک روز قول فیصل ہو گیا۔ اس بار میرے نوعمر رفیق جناب بہزاد سلیمی وسیلہ بنے تھے۔ حضرت جی 25 نومبر کو اساس کے مرکزی کامپلیکس تشریف لا رہے تھے، کنواں خود چل کر پیاسوں کے پاس آرہا تھا، کتنے دیالو ہیں وہ۔ کتنے عالی ظرف ہیں وہ۔ اب تو فرار کی اور گریز کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ میلے کچیلے کپڑوں کی دھلائی اور دھنائی کے لیے دھوبی گھاٹ پر پہنچنا ہی تھا۔

وہ آئے اور گرد و پیش بے داغ اجالے سے بھر گیا' یا گھر آئیں تو یہی منظر ہوا کرتا ہے۔

پہلی نظر میں وہ ایک دہقان لگے' متبسم اور پر یقین' ان کے چہرے پر ایک آسودگی تھی جو ہر اس دہقان کا مقدر ہوتی ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق فصل کی بوائی کے تمام تقاضے پورے کر چکنے کے بعد' اسی کے قانون پر یقین کامل رکھتے ہوئے فصل کی پکائی تک صبر کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ گاہے بے داغ اجلا لباس اور ڈھیلی ڈھالی پگڑی زیب تن کر کے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے مشاہدے' تجربے اور مطالعے سے ہم جیسے عامیوں کو بھی فیض یاب کرنے کے لیے سفر پر نکل کھڑا ہوتا ہے

مگر پہلی نظر کے وہ دہقان تو صرف دہقان نہ تھے' بلکہ اس دہقان کے پردے میں وہ کچھ ہیں جو بہت ہی کم لوگوں کا مقدر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا گلاب ہیں جس کی ہر

پنکھڑی صباحت' کو ملتا اور خوشبو کا ایک نیا احساس جگاتی ہے اور یوں پرت در پرت 'جت در جت' محبت کا ایک نیا جہاں آباد ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایک صوفی ہیں' پیر ہیں' شکاری ہیں' سیاح ہیں' مفسر قرآن ہیں مصنف ہیں' شاعر ہیں' مدرس ہیں' مبلغ ہیں' ماہر آثار قدیمہ ہیں' ایک دینی اور سیاسی جماعت کے امیر ہیں' عسکری فنون کے دلدادہ ہیں' لوک دانش اور فنون لطیفہ کے شناور ہیں' انگریزی فلموں کے شائق ہیں' انٹرنیٹ سے گہرا شغف رکھنے والے ہیں' سماجی تبدیلی کی حرکیات اور میکانزم کے عالم ہیں' اسلامی ہیکار ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال اللہ کے ایک ایسے بندے ہیں جو انسانی سماج میں مروج ظلم کے ہر ناسور کو جہادی جوش و جذبے اور موثر حکمت عملی کے ساتھ ملیامیٹ کرتے ہوئے' ہر نوع کی سلامتی پر مبنی اسلام کا نظام نافذ کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں۔ نرم دم گفتگو گرم دم جستجو۔۔۔۔ یہ ہیں امیر تنظیم الاخوان حضرت قبلہ مولانا محمد اکرم اعوان صاحب۔

حضرت جی سے ملاقات اڑھائی گھنٹے پر محیط رہی۔ کچھ حصہ غیر رسمی بات چیت میں گزرا اور بڑا حصہ باقاعدہ انٹرویو پر مشتمل رہا۔ جسے ہمارے نوجوان ساتھی جناب بہزاد سلیمی اور ابوذر وسیم صاحب قلم بند کر رہے ہیں۔ قارئین کرام یہ یادگار انٹرویو پوری تفصیل کے ساتھ عنقریب روزنامہ "اساس" میں پڑھ سکیں گے۔ میں حضرت جی سے ہونے والی گفتگو کو اپنے فہم کے مطابق "حرف آرزو" کی وساطت سے آپ تک پہنچاؤں گا۔

حضرت جی جیسے مرتبے پر فائز شخصیت سے اڑھائی گھنٹے کی ملاقات' سمندر کے ایک قطرے سے شناسائی ہی کہی جا سکتی ہے' مگر قطرہ گوہر ہو چکا ہو تو اس کے فیضان کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ حضرت جی کے ساتھ ہونے والی اس ملاقات میں زندگی کو درپیش سلگتے ہوئے مسائل اور متنوع موضوعات پر ان کی آراء سامنے

آئیں۔ جن پر ایک سے زائد رد عمل ہو سکتے ہیں کہ یہی جمہوری روح اور رویہ ہے'
اسی طرح دانش سے دانش ملتی اور دیئے سے دیا روشن ہوتا ہے۔

میرے پیا گھر آئے (2)

روزنامہ اساس 30 نومبر 1998ء

اساس کا مپلیکس کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہمارے بعض ساتھی، مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے قافلے میں شامل کیل کانٹے سے مسلح ان کے رفقاء کو دیکھ کر حیرانگی کا اظہار کر رہے تھے۔ بعد میں ایک دوست نے مجھ سے پوچھا بھی کہ ایک اللہ والے اور درویش صفت انسان کو کیا پڑی ہے کہ اتنے سارے مسلح محافظوں کے جھرمٹ میں گھرا رہے۔ اس موقع پر مجھے اپنے نام ارسال کردہ مولانا صاحب کا چوبیس اکتوبر کا خط یاد آیا جس میں لکھا تھا کہ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے خود کو بندوق کی نوک پہ پایا ہے اور اب وہ پینسٹھ (65) برس کے ہیں۔ زندگی اللہ کی طرف سے تھی کوئی مار نہ سکا، مگر بندوقیں اب بھی ہر طرف تنی ہوئی ہیں اور اگر مار بھی لیں گے تو کیا تیر ماریں گے۔ زندہ رہنا مقصد نہیں بلکہ حق کے ساتھ زندہ رہنا مقصد ہے۔ آخر میں انہوں نے مجھے احتیاط سے آگے بڑھنے کا مشورہ دیا تھا۔ کسی دوسرے کو تحفظ خویش کا مشورہ دینے والا شخص اپنے تحفظ کا بھی حق رکھتا ہے یا

نہیں۔اس کا فیصلہ مشکل نہیں۔

حضرت اعوان صاحب کے ساتھ مکالمے کی پہلی غیر رسمی نشست برادرم شیخ افتخار عادل صاحب کے کمرے میں منعقد ہوئی۔اساس کے ایڈیٹر جناب مستنصر جاوید بھی شریک گفتگو تھے۔غیر رسمی گفتگو تواضعات کے دوران باقاعدہ سوالات کے لگے بندھے نظم سے آزاد تھی اس لئے متنوع موضوعات پر مختصر اظہار خیال ہوتا رہا۔تاہم ایک ہمہ جہت شخصیت سے شناسائی کے لیے اس کی علمی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔میری خواہش ہے کہ قارئین کرام کو بھی اس بات چیت کے اہم اجزامیں شریک کروں۔

حضرت جی منارہ، چکوال سے براستہ موٹر وے تشریف لائے تھے۔شیخ صاحب کا کہنا تھا کہ جی ٹی روڈ کے کنارے آبادیاں پھیل جانے کے باعث اب مسافر دیہی لینڈ سکیپ سے محروم ہوگئے ہیں البتہ یہ حسن فطرت موٹروے پر موجود ہے۔مستنصر صاحب بولے دیہی معاشرت اور لینڈ سکیپ سے عدم شناسائی تو ہے کہ ہمارے شہری نوجوان کو علم ہی نہیں ہے کہ گندم خوشوں میں پروان چڑھتی ہے یا درخت پر اگتی ہے۔یہاں سے مکالمہ ساج کو درپیش چند ایک ضمنی برائیوں سے ہوتا ہوا پھر درخت کی تمثیل سے آ جڑا۔حضرت جی کا کہنا تھا کہ برائی کا درخت الٹا ہوتا ہے۔اس کی جڑیں زمین میں نہیں بلکہ اوپر ہوتی ہیں۔اس لئے برائی کو ہمیشہ اوپر سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔ان کے نزدیک ہمارے ہاں احتساب کا عمل ہمیشہ نیچے سے شروع کیا جاتا رہا ہے اور نچلی سطح پر ہی تمام ہو جاتا رہا ہے۔حضرت جی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ عالم تو یہ ہے کہ نچلی سطح پر بھی صرف وہی لوگ احتساب کی زد میں آتے ہیں جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا، تعلق داری والے لوگ یہاں بھی صاف بچ نکلتے ہیں، جہاں تک معاشرے کے بالائی طبقوں کا تعلق ہے تو وہ ہر قسم کے

احتساب سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں جو شخص بھی کرپشن کی سیڑھی لگا کر "اوپر" پہنچا ہے وہ احتساب سے ماوراہو گیا ہے۔

اس مرحلے پر حضرت جی نے فوجی دور حکومت کا ایک قصہ سنایا۔ ایک بے یارومددگار شخص سرِراہ لوگوں کے مجمع میں دہائی مچا رہا تھا کہ فلاں شخص نے بیس سال پہلے اس کے بیاسی روپے مار لئے تھے مگر کسی بھی طرح یہ رقم واپس کرنے پر تیار نہیں۔ قریب سے ایک فوجی افسر کا گزر ہوا اس نے سارا ماجرا سن کر اس "فلاں" شخص کو حکم دیا کہ وہ اس غریب آدمی کی رقم فی الفور واپس کر دے وگرنہ واپسی پر وہ اس کی پیٹھ پر ہتھیائی گئی رقم کے مساوی 82 کوڑے برسائے گا۔ حضرت جی نے بتایا کہ اس افسر کی واپسی تک غریب اور بے یارومددگار شخص کو اس کی رقم وصول ہو چکی تھی۔

میں نے عرض کیا کہ اس قصے کے بین السطور کہیں مارشل لاء کی تائید و حمایت کا پہلو تو موجود نہیں۔

مولانا محمد اکرم اعوان صاحب نے متبسم لہجے میں کہا کہ بات مارشل لاء کی حمایت کی قطعی نہیں ہو رہی۔ ثابت کرنا یہ مقصود ہے کہ اگر کوئی سسٹم نقص اور سقم سے پاک ہو گا تو وہ بہتری، بھلائی اور اچھائی کو فروغ دے سکے گا۔ آپ اپنے سنہری نظم و نسق کی انقلاب آفرین اصلاح کر لیجئے۔ عدل کو بلا امتیاز سب کے لئے یقینی بنا لیجئے۔ زیردست اور زبردست کا فرق مٹا دیجئے۔ بے گناہ کو تحفظ دیجئے اور گناہ گار اور مجرم کو قانون کے شکنجے میں جکڑ لیجئے پھر دیکھئے۔ آپ کے معاشرے کی شکل صورت اور رنگ ڈھنگ کیا ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر حضرت جی قبلہ نے میرے آقا رحمت اللعالمین کی حیات طیبہ کا ایک سنہری واقعہ بیان فرمایا۔

احتساب سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں جو شخص بھی کرپشن کی سیڑھی لگا کر "اوپر" پہنچا ہے وہ احتساب سے ماورا ہو گیا ہے۔

اس مرحلے پر حضرت جی نے فوجی دور حکومت کا ایک قصہ سنایا۔ ایک بے یارومددگار شخص سر راہ لوگوں کے مجمع میں دہائی مچا رہا تھا کہ فلاں شخص نے بیس سال پہلے اس کے بیاسی روپے مار لئے تھے مگر کسی بھی طرح یہ رقم واپس کرنے پر تیار نہیں۔ قریب سے ایک فوجی افسر کا گزر ہوا اس نے سارا ماجرا سن کر اس "فلاں" شخص کو حکم دیا کہ وہ اس غریب آدمی کی رقم فی الفور واپس کر دے وگرنہ واپسی پر وہ اس کی پیٹھ پر ہتھیائی گئی رقم کے مساوی 82 کوڑے برسائے گا۔ حضرت جی نے بتایا کہ اس افسر کی واپسی تک غریب اور بے یارومددگار شخص کو اس کی رقم وصول ہو چکی تھی۔

میں نے عرض کیا کہ اس قصے کے بین السطور کہیں مارشل لاء کی تائید وحمایت کا پہلو تو موجود نہیں۔

مولانا محمد اکرم اعوان صاحب نے متبسم لہجے میں کہا کہ بات مارشل لاء کی حمایت کی قطعی نہیں ہو رہی۔ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اگر کوئی سسٹم نقص اور سقم سے پاک ہوگا تو وہ بہتری، بھلائی اور اچھائی کو فروغ دے سکے گا۔ آپ اپنے سنہری نظم ونسق کی انقلاب آفرین اصلاح کر لیجئے۔ عدل کو بلاامتیاز سب کے لئے یقینی بنا لیجئے۔ زیردست اور زبردست کا فرق مٹا دیجئے۔ بے گناہ کو تحفظ دیجئے اور گناہ گار اور مجرم کو قانون کے شکنجے میں جکڑ لیجئے پھر دیکھئے۔ آپ کے معاشرے کی شکل صورت اور رنگ ڈھنگ کیا ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر حضرت جی قبلہ نے میرے آقا رحمت اللعالمین کی حیات طیبہ کا ایک سنہری واقعہ بیان فرمایا۔

ایک امیر اور بااثر گھرانے کی عورت چوری کی مرتکب ہوئی۔اس کے خاندان والوں کی خواہش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ جرمانہ دینے کو تیار ہیں۔اس کے بدلے عورت کو جسمانی سزا نہ دی جائے۔

حضور نبی اکرمؐ نے اس مرحلے پر ایک ایسا زریں اصول ارشاد فرمایا جو قیامت تک انسانیت کی رہنمائی کے لئے کافی ہے۔آپ نے فرمایا عدل کے روبرو سب یکساں ہیں۔ پہلی قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ وہ معاشرے کے بااثر افراد کو چھوڑ دیتی تھیں اور بے اثر اور غریب لوگوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔اللہ کے آخری نبیؐ نے مزید فرمایا کہ اس رب کی قسم کہ جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ سے بھی کوئی غلطی سرزد ہو تو اسکا بھی عدل کی رو سے پورا پورا احساب ہو گا۔

غیر رسمی مکالمہ انسانی فطرت کی بوقلمونیوں سے ہوتے ہوئے اپنی سوسائٹی میں جاری بے مہار قانون شکنی تک پہنچ چکا تھا اور سزا و جزا کے حوالے سے بعض واقعات کی خوشہ چینی ہونے لگی تھی۔ میں نے ادب سے سوال کیا۔

"کیا قانون پر عمل کے لئے سزا کا خوف ضروری ہے یا جزا کا احساس اور یقین ہی کافی ہے۔"

حضرت جی کا کہنا تھا کہ اسلام ایک متوازن نظام حیات کا داعی ہے۔جزا کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ مگر جب کوئی فرد معاشرے کی متعین کردہ حدود وقیود کو' جو اسکی بھلائی اور بہتری کے لئے بنائی گئی ہوں' توڑتا ہے تو اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ انسانی مزاج کو راہ راست پر رکھنے کا نظام خود انسانوں کے لئے ایک نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔عدل پر مبنی نظام ہی دیرپا ہوتا ہے۔

اس مرحلے پر قبلہ مولانا اعوان کو کسی صاحب کا امریکہ کے بارے میں ایک تبصرہ یاد آیا جس میں اس نے کہا تھا کہ امریکہ بہت جلد ٹوٹ جائے گا۔

مولانا صاحب نے فرمایا میرا مسکت جواب تھا کہ امریکہ ابھی نہیں ٹوٹے گا۔ ایک ایسا معاشرہ کیسے ٹوٹ سکتا ہے جہاں قانون سب کے لئے یکساں ہو۔ جہاں اک عام وکیل بھی صدر کا مواخذہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا صاحب نے حالیہ ایام میں صدر امریکہ کی ذات سے منسوب مونیکا لی کے واقعے کا حوالہ دیا۔ جس میں دوران تفتیش سوالات کی بوچھاڑ سے لوہے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے صدر کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ اس کیفیت میں اس کا بار بار پانی پینا ظاہر کرتا ہے کہ مملکت کے سربراہ کو قانون کی اصابت اور یکساں عمل داری کا کامل یقین ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں ہے۔

امریکہ کے راستے روئے سخن ایک بار پھر پاکستان آ پہنچا۔ حضرت جی کا کہنا تھا کہ ہمارا بقاء کا راستہ صرف اور صرف اسلامی نظام کا نفاذ ہے۔ کیکر پر آم نہیں اگتے۔ صرف چہرے بدلنے سے مقدر نہیں بدلتے۔ غیر عادلانہ نظام نے چودہ کروڑ انسانوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ قدیم زمانے میں غلام کی کفالت مالک کے ذمے تھی۔ موجودہ سسٹم میں ظلم کی انتہا ہو چکی ہے۔ اب غلام کو اپنے لئے بھی کمانا پڑتا ہے اور مالک کے لئے بھی۔ ہم ظلم کے اس سسٹم سے جس قدر جلد نجات پالیں ہمارے لئے اس قدر بہتر ہے۔ وگرنہ وہ دن دور نہیں جب مجبور و مقہور اور محروم عوام بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرنے کے بجائے گولی سے مرنے کو ترجیح دیں گے۔

میرے پیا گھر آئے(3)

روزنامہ اساس یکم دسمبر 1998ء

اور اب محفل استفسارات کو ایک نظم کے ساتھ آگے بڑھنا تھا۔ نئی نسل کے دو قلم کار جناب بہزاد سلیمی اور ابوذر وسیم صاحب انٹرویو کے اس حصے کے سرخیل تھے جبکہ مجھے ان کی رفاقت میں' محض گفتگو کے تسلسل کو برقرار رکھنا تھا یا پھر ضمنی سوالات کے ذریعے "میر محفل" سے اپنے قارئین کرام کے لئے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی تھیں۔

لمحے بھر کے لئے میرے اعصاب پر تشویش کی مدھم سی لہر دوڑ گئی۔

"کیا ایک ممدوح سے سوال کرنا بے ادبی تو نہیں۔"

تو گویا میں مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے ساتھ فکری رومانس سے ہوتے ہوئے ان کی شخصی کرشمہ صفتی کا اسیر ہو گیا ہوں۔ کیا ہستی کے ساتھ Telepathic رشتہ و تعلق قائم ہو جانے کا مطلب ہوتا ہے کہ دوسرا شخص اپنی شخصیت اور اپنی ذات کی نفی کر لے۔

اس ایک لمحے میں مجھ پر تشویش در تشویش کے کتنے ہی زمانے گزر گئے' میں اعصاب کے بوجھل پن میں گرفتار ہو گیا۔ میں نے نظر بھر کر دیکھا' حضرت جی مولانا اعوان صاحب میرے روبرو پیکر شفقت بنے بیٹھے تھے' ان کا متبسم چہرہ دعوت سوال دے رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر کے صحافی کو بیدار کیا۔ سوال تو ایک عجز ہے' تلاش ہے' پیاس ہے' جبکہ جواب ایک عطا ہے' ایک شفا ہے۔ پیاسے بھی موجود تھے اور کنواں بھی روبرو تھا۔ سو طلب و رسد کا یہ سلسلہ بڑی خوبی سے رواں ہو گیا۔ گزشتہ روز "اساس" کی اشاعت میں شامل مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کے ساتھ باقاعدہ انٹرویو آپ کی نظر سے گزر چکا ہو گا۔ تاہم میں نے قارئین کرام سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس محفل کے بعض گوشوں کو اپنے فہم کے مطابق ان کی خدمت میں پیش کروں گا۔

میرے روبرو مولانا اکرم اعوان صاحب کی صورت میں ایک آسودہ حال دہقان بیٹھے تھے۔ جنہیں مادی' علمی' اور روحانی دولت فراواں نصیب ہوئی ہے' جو طمانیت قلب کی ثروت سے بے پایاں حد تک نہال ہیں۔ مطالعہ' تجربہ اور مشاہدہ جن کا خاصہ ہے......نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو! ایسے اوصاف کا کسی ایک شخصیت میں ارتکاز فکر و عمل اور قیادت و سیادت کے نت نئے امکانات کو روشن کر دیتا ہے۔ کیا مولانا اعوان صاحب اپنی قیادت کی روشنی سے تاریکیوں میں مارے جانے والوں کو زندگی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ کیا وہ رسومات میں گھرے ہوئے ہجوم کا ٹھوس حقائق سے رشتہ جوڑ کر اسے نظم و ضبط کا پابند بناتے ہوئے اس کے لئے بہتر مستقبل کر سکتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے فہم و فراست اور حکیمانہ طرز عمل سے ایسی پیش رفت کر جائیں کہ مذہب کے نام پر تقسیم در تقسیم اور شدت پسندی کی روز

افزوں روش دم توڑدے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام جیسے عظیم' انقلابی نظریہ حیات کو پوجاپاٹ سے نکال کر' ذاتی اور اجتماعی سطحوں پر' عبادات کے فقید المثال نظام سے منسلک کر دیا جائے یعنی یہ کہ اسلام کا معاشرے میں سماجی' سیاسی اور اقتصادی قوت کے طور پر نفاذ یقینی بنادیا جائے۔

مولانا مکرم نے اپنی ذات کے حوالے سے ہر مرحلے پر عجز اور انکساری کا اظہار فرمایا۔ ان کے نزدیک اہمیت اس حقیقت کو حاصل ہے کہ رب کریم نے ہر فرد کو جن اوصاف سے مالا مال کیا ہے' وہ انہیں بر سر عمل لاتے ہوئے دنیا میں اپنے حصے کا کردار ادا کر جائے۔ اس ناطے سے وہ (مولانا صاحب) بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

جہاں تک سوسائٹی میں اسلام کو سماجی' سیاسی اور اقتصادی قوت کے طور پر نافذ کرنے کا تعلق ہے' مولانا صاحب اس بارے میں یقینا ایقان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام ہی کائنات کی قوت اور مقدر ہے۔ اسلام کے حوالے سے اپنے فہم کا اظہار کرتے ہوئے میں نے انہیں پیکر عجز و انکساری پایا۔ مجھے بارہا احساس گزرا کہ اس بحر بے کراں میں وہ خود کو قطرے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے مگر دوسری جانب ان کے ہاں اسلامی تعلیمات کی اصابت کا یہ عالم ہے کہ ان پر کسی کوہ گراں کا گماں ہوتا ہے۔

حضرت قبلہ کے فہم کی رو سے اسلام عدل پر مبنی امن و سلامتی کا پیامبر ہے۔ اس کے ہاں نفرت نہیں محبت ہے' تشدد نہیں اعتدال ہے' تقسیم نہیں تفہیم ہے۔ اسلام نظریاتی سطح پر ایک اکائی اور وحدت کو اجاگر کرتا ہے تاہم اس میں سوچ اور آراء کے تنوع کی پوری گنجائش موجود ہوتی ہے۔

مولانا صاحب کے فہم اسلام کی رو سے اسلام کے دو بڑے شعبے ہیں۔ ایک

بندے اور مولا کا تعلق ہے اور دوسرا خلق خدا کے باہمی تعلقات و معاملات۔ جہاں تک پہلے شعبے کا تعلق ہے' اس میں کوئی جبر نہیں' کوئی زور نہیں۔ تاہم دوسرے شعبے کی صورت حال مختلف ہے۔ یہاں معاشرے کے افراد کے مابین حقوق و فرائض پر مبنی تعلقات اور معاملات جیسے حقائق پائے جاتے ہیں' جن کی ادائیگی معین پیمانوں کے مطابق مطلوب ہوتی ہے۔ بالکل جس طرح ایک گاڑی یا مشین اسی صورت میں رواں رہ سکتی ہے جب اسکے تمام کل پرزے اپنی اپنی نشست پر براجمان ہوں اور حسب پروگرام اپنا کردار انجام دے رہے ہوں۔ مولانا اعوان صاحب کے نزدیک اسلامی نظام حیات کا یہی وہ طرہ امتیاز ہے جس کے باعث اسے دور اول میں عظیم الشان کامیابیاں نصیب ہوئیں اور یہی وہ وصف ہے جس کے بل بوتے پر ہم اسے وطن عزیز میں ایک ہمہ گیر انقلابی قوت کے طور پر روبہ عمل لائیں گے۔

مولانا اعوان صاحب کے نزدیک جو معاشرے عدل کے مطابق حقوق و فرائض میں توازن بدوش رشتہ و تعلق برقرار رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں' اللہ کے قانون مکافات عمل کے تحت تباہی ایسے معاشروں کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ اس ضمن میں آپ نے معاشی حقوق کے اتلاف کا حوالہ دیا۔ بااثر افراد کے ایک گروہ نے اربوں ڈالر کے مساوی رقوم قومی خزانے سے خورد برد کرتے ہوئے بیرون وطن بنکوں میں پہنچا رکھی ہیں۔ اسی طرح صاحبان اثر و رسوخ نے اندرون ملک بنکوں میں جمع عوام کی امانتوں سے کروڑوں اربوں روپے کے قرضے وصول کئے اور انہیں معاف کروانے کے نام پر ہڑپ کر گئے' ڈاکہ زنی کی ایسی وارداتوں کے بین ثبوت بھی موجود ہیں۔ اسلامی قوت نافذہ ایسے جرائم میں کسی رو لحاظ کے بغیر مجرموں کی گردنیں ناپ لیا کرتی ہے۔

حضرت جی کا کہنا تھا کہ اسلام عام آدمی کو مطلوب سامان رزق کی فراہمی کو یقینی بناتا ہے۔ گویا اسلامی ریاست اپنی اکائی یعنی اپنے باشندے کی کفالت کی ذمہ دار اور نگہبان ہوتی ہے۔ یہی تو وہ حقیقت تھی جس کا ادراک جناب عمر فاروقؓ کو بے کل اور بے قرار رکھتا تھا اور انسان تو انسان رہے۔ وہ فرات کے کنارے آباد ایک کتے کے سامان رزق کے لئے بھی فکر مند رہتے تھے۔

آج ہمارا معاشرہ جس معاشی ابتری کا شکار ہے اور با اثر طبقے جس طرح ملکی دولت کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعے عام آدمی کو بھوک اور احتیاج کے تپتے صحراؤں میں آبلہ پائی پر مجبور کئے جا رہے ہیں' حضرت مولانا اعوان کو اس پر گہری تشویش ہے۔ اس تناظر میں وہ نام نہاد مذہبی پیشوائیت کے رویے پر بھی معترض ہیں' جو بے وقت کی راگنی الاپنے میں مشغول رہتی ہے۔ بھوکے شخص کو تو روٹی کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ اسے اس وقت وضو کرنے کے طریقے بتا رہی ہوتی ہے۔ انہوں نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ بھوک' بیماری' رسوائی' ذلت اور احتیاج کے ہاتھوں مایوس لوگ انتہاپسندی کا رخ کر سکتے ہیں اور سسک سسک کر مرنے کے بجائے گولی سے مر جانے کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ گویا بھوک پیاس سے مرنے والے مجبور اور بے اختیار لوگوں کے پاس بھی ایک آخری اختیار ہوتا ہے۔

میرے پیا گھر آئے (4)

روزنامہ اساس 2 دسمبر 1998ء

پھر اس غنی شخص نے کہا کہ مال و اسباب اور تائید و حمایت کی ہر دم وسعت پذیر دولت کے باوجود ہمارا منصب اقتدار نہیں بلکہ اسلام ہے۔ دوسروں کا راستہ ہے کہ ہمیں اقتدار دو، ہم اسلام دیتے ہیں۔ ہمارا راستہ ہے کہ اسلام نافذ کرو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا وہ مقتدر طبقے اسلام نافذ کر سکیں گے جن کے مفادات ہی اسلام سے متصادم ہیں اور جن کی لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ اسلام کا اولین ہدف ہے۔

محترم مولانا محمد اکرم اعوان اس ضمن میں اتمام حجت کے قائل ہیں۔ حجت پوری ہونے کے بعد کیا ہوگا۔ شاید دمادم مست قلندر!

ان کی گفتگو سے ظاہر ہوا کہ وہ آنے والے ایام کو روشن تر کرنے کے لئے ابھی سے ایسے منصوبے شروع کر چکے ہیں۔ جو غیر عادلانہ نظام کے سمندر میں نیکی و خیرو

برکت کے جزیروں کی طرح پروان چڑھنے والے ہیں۔ حضرت جی تعلیم کے شعبے میں جاری تقسیم در تقسیم کے موجودہ رویے کے سخت شاکی ہیں۔ ان کے نزدیک پانچ مختلف قسم کے تعلیمی سلسلوں نے انتشار کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ ان کا اشارہ یقیناً مذہبی، مسلکی اور معاشی بنیادوں پر چلنے والے تعلیمی اداروں کی طرف ہے، جہاں پروان چڑھنے والے بچوں کو اپنی اپنی دنیا کا ہی اسیر بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ بچے فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ بڑے اور قومی معاشرتی دھارے کا حصہ بننے کے بجائے متوازی یا ایک دوسرے کو کاٹنے والی اکائیوں میں ڈھل چکے ہوتے ہیں۔ مولانا اکرم صاحب کی تنظیم نے اپنے تئیں ایک متبادل تعلیمی نظام وضع کیا ہے جس میں ان کے بقول طلباء کی شخصیت و کردار سازی خالصتاً اس پیمانے کے ساتھ کی جاتی ہے کہ طالب علم زمانہ حال اور مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے۔ میری خواہش ہے کہ ان کے تعلیمی اداروں کا قریبی مشاہدہ کر کے اس موضوع پر کچھ لکھوں۔

مولانا اعوان صاحب کے ہاں معاشی نظم وضبط اور عام آدمی کے لئے مطلوب مالی آسودگی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان کا کہنا تھا، ان کی تنظیم نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدید زمانے کی مالی اور مالیاتی پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کا ایک جامع منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ بعض شعبوں میں تجرباتی طور پر آزادانہ کام بھی ہو رہا ہے۔ مثلاً ان کے ہاں سود سے پاک تجارتی لین دین کا ایک نیٹ ورک سرگرم عمل ہے جس میں شرکائے کاروبار کو 32 فی صد تک منافع ملا ہے۔ ایک موقع پر حضرت جی نے فرمایا کہ ان کی تنظیم کو سود سے پاک بنکاری سسٹم قائم کرنے کی اجازت نہیں مل سکی کیونکہ قواعد کے مطابق اس میں نیشنل بنک کے چالیس فیصد حصص ناگزیر تھے اور متذکرہ بنک آپ جانتے ہیں سودی سسٹم پر کام کرتا ہے۔ مولانا نے

کہا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک طرف ہم ساٹھ فیصد سود سے پاک کاروبار کریں اور پھر اس میں چالیس فیصد سود کی ملاوٹ بھی کر ڈالیں۔

مولانا محترم کے استدلال کا وزن واضح ہے تاہم اس مرحلے پر میرے ذہن میں کئی سوالات نے ہلچل مچادی تھی۔ مگر مجھے باقاعدہ انٹرویو میں سوالات کے نظم و ضبط کی پاسداری تھی۔ مزید براں وقت کی کمی بھی آڑے آرہی تھی۔ میں مولانا محترم سے چاہتا تھا کہ قومی و بین الاقوامی سطح پر ہر سو پھیلی ہوئی سودی نظام کی لعنت سے 'وہ اپنے کاروبار کو پاک صاف رکھنے میں کیسے اور کیونکر کامیاب ہو گئے ہیں۔ آخر وہ کون سا کاروباری سلسلہ ہے جو اس قدر آزاد' خود مختار اور خود کفیل ہے جسے کسی مرحلے پر بھی سودی نظام سے وابستہ قومی یا بین الاقوامی اداروں سے واسطہ نہ پڑتا ہو۔

تنظیم الاخوان کے سربراہ' مذہب کے نام پر قائم تنظیموں اور جماعتوں کی افادیت اور اہمیت کے تو قائل ہیں۔ تاہم وہ بعض قیادتوں کے ناقد بھی ہیں۔ ان کے خیال میں متعدد حلقے مذہب اور دین کے نام پر محض ذاتی مفادات کی دکانداری چمکانے والے اور "سٹیٹس کو" کے حامی ہیں' اسی لئے مفاد یافتہ طبقے ان کی کھلی اور ڈھکی امداد بھی کرتے ہیں۔ حالیہ ایام میں پانچ چھ بڑی مذہبی تنظیموں کے نہایت منظم اور حاضری کے اعتبار سے انتہائی کامیاب اجتماعات کے حوالے سے مولانا اعوان صاحب کا کہنا تھا کہ ان واقعات میں بلا شبہ حسن انتظام کا عنصر موجود تھا تاہم ان اجتماعات کی کامیابی میں سب سے بڑا کردار عام لوگوں اور کارکنوں کے اخلاص نیت اور جوش و جذبے نے ادا کیا۔ لوگ معصومیت' سادگی اور بہتری و بھلائی کی امید کے ساتھ ملک میں اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا مذہبی جماعتوں کے کامیاب اجتماعات کی آڑ میں' مقتدر طبقے پاکستان میں "بنیاد پرستی" کے توڑ کے لئے اور "سٹیٹس کو" کو برقرار رکھنے کے لئے مغرب سے بھی حمایت اور اعانت حاصل کرنے کا سوچ سکتے ہیں۔ مولانا اعوان صاحب کا خیال تھا کہ بیشتر مذہبی تنظیموں کی قیادتیں

تو "سٹینس کو" کی حامی ہیں' اس لئے ان سے حکومت یا مغرب کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر مقتدر طبقے پھر بھی ان اجتماعات کو اپنے مفاد میں کیش کرواتے ہیں تو یہ ان کا فعل ہے' جس کے نتائج کسی سے ڈھکے چھپے نہیں رہ سکتے۔

مولانا مکرم کے ساتھ جمنے والی نشست میں متنوع موضوعات پر ان کی آراء سامنے آئیں۔ مثلاً اسلام سلامتی کا دین ہے' اس کا دہشت گردی سے دور پرے کا واسطہ بھی نہیں۔ اسلام ہی وہ دین حیات ہے جو مشاورت اور جمہوریت کا اولین داعی و پیامبر ہے۔ اسلام میں عورت کو عزت و فضیلت کا جو مقام حاصل ہے' جدیدیت میں ڈوبا ہوا یورپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسلام محض سزاؤں کا نظام پیش نہیں کرتا بلکہ یہ جزا اور سزا کا ایک متوازن اصول نافذ کرتا ہے۔ اسلام ظاہر داری اور رسومات سے زیادہ انسان کی حقیقی فلاح اور تعمیری و مثبت حقائق کو اہمیت دیتا ہے۔

حضرت جی سے آخری سوال یہ پوچھا گیا کہ اگر آج آپ اقتدار پر متمکن ہو جائیں تو آپ کی اولین ترجیح کیا ہو گی۔

"بھوک' پیاس اور احتیاج کا خاتمہ' معاشی انقلاب بذریعہ اسلام۔"

لیجیئے ایک اور وعدۂ فردا؟ ایک اور تحریک کی طرف پہلا قدم۔

ایک اور طلب' ایک اور تڑپ ایک اور تجسس' ایک اور تلاش......ایک اور پیاس!

حضرت جی سفر کے اگلے مرحلے کی جانب کوچ کر چکے ہیں مگر میں سوچتا ہوں اور وہ کیسا کنواں ہیں' ایک پیاس بجھانے کی آڑ میں کئی پیاسیں پیدا کر جاتے ہیں۔

علماء کنونشن ----- مشاہدات و تاثرات

خورشید ندیم

اساس 7 ستمبر 98ء

نفاذ شریعت مشاورتی کنونشن کے لئے حکومت نے ملک بھر سے دین کے علماء اور خانقاہوں کے ورثاء کو اسلام آباد میں جمع کیا۔ اس اجتماع کا مقصد نفاذ شریعت کے باب میں ان حضرات کا نقطۂ نظر جاننا اور انہیں شریک مشاورت کرنا تھا۔ جماعت اسلامی کے استثناء کے ساتھ ہر اہم مذہبی جماعت اور مکتبہ فکر کے نمائندہ لوگ موجود تھے ایک دن کی نشست میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ شریک بزم ہر آدمی اظہار خیال کرتا۔ اس لئے راجہ ظفر الحق صاحب نے سعی کی کہ ہر مکتبہ فکر اور جماعت کے کسی مقتدر فرد کو اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملے۔

ارباب اقتدار ریاست کے کسی فرد کو، اگر کسی مسئلے میں مشاورت کے لئے کہیں تو ہمارے نزدیک اس پر لازم ہے کہ اسکا جواب اثبات میں ہو۔ اس کا تعلق نہ تو

حکمرانوں کے رویے کے ساتھ ہے اور نہ ہی ان کی صالحیت سے۔ امت کے جلیل القدر علماء کا ہمیشہ یہی رویہ رہا اور انہیں اگر کبھی درباروں میں طلب کیا گیا ہے تو انہوں نے اس سے انکار نہیں کیا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہمارے علماء اور اہل خانقاہ کا رویہ مثبت رہا۔ وہ نہ صرف شریک مشاورت ہوئے بلکہ انہوں نے وزیر اعظم کی موجودگی میں اپنا نقطہ نظر خدشات اور تجاویز پیش کیں۔

سب سے معتدل' معقول اور باوقار خطاب مولانا محمد اکرم اعوان کا تھا۔ اس ملک کے اہل مذہب سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ وہ "الاخوان" نام کی سیاسی تنظیم کے قائد ہیں' صوفی ہیں اور اس کے ساتھ عالم دین بھی۔ موجودہ ارباب اقتدار اور نظام کے بارے میں ان کی رائے ڈھکی چھپی نہیں۔ ہم نے خود ان کی تقریریں سنی ہیں۔ جن میں انہوں نے موجودہ حکمرانوں اور نظام کے خلاف جہاد کو فرض قرار دیا ہے۔ ایک عالم دین جب "فرض" کا لفظ بولتا یا لکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق محض انشاء پردازی سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک غیر معمولی بات کہہ رہا ہے اور یقیناً اسکے لئے ان کے پاس دلائل بھی ہوں گے۔ اس نقطہ نظر کا حامل ہوتے ہوئے بھی انہوں نے یہ نہیں کیا کہ اجتماع میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہو کہ "جو لوگ نفاذ شریعت کے لئے مخلص نہیں ہیں' ان سے بات کرنے کا کیا فائدہ۔" اس کے برخلاف وہ یہاں آئے اور انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کیا جس میں واضح طور پر اخلاص کی آمیزش تھی۔ انہوں نے ارباب حکومت پر اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔ پندرھویں آئینی ترمیم کے بارے میں اپنے خدشات بیان کیے اور اسکے ساتھ اپنی تجاویز بھی دیں۔ انہی کی طرح صاحبزادہ نصیر الدین نصیر نے بھی خوش سلوبی اور وقار کے ساتھ اپنی بات کی اور اپنی غیر جانبدارانہ حیثیت کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اگر ان پر شاعرانہ طبیعت کا غلبہ نہ ہوتا اور بلا طلب اپنی شاعری سے

حاضرین کونہ نوازتے تو ان کے خطاب کو متوازن قرار دیا جاسکتا تھا۔

اس اجتماع میں تحریک جعفریہ پاکستان کے قائد علامہ ساجد نقوی صاحب نے ایک مسئلہ اٹھایا' جو دیگر علماء کی طرف سے بھی سامنے آیا۔ اگرچہ اس مسئلے کے جو حل تجویز کئے گئے۔ ان میں اختلاف بھی نمایاں تھا۔ ساجد نقوی صاحب کا کہنا تھا کہ اس باب میں تو کلام نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن و سنت کو ملک کا بالا دست قانون ہونا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن و سنت کے منشاء کا تعین کیسے کیا جائے گا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ہمارے قدیم علماء و فقہا کی آراء اس باب میں ہماری رہنمائی نہیں کر سکتیں۔ اس لئے ہمیں لازماً اجتہاد سے کام لینا ہو گا۔ اس اجتہاد کے لئے ضروری ہے کہ علماء کی ایک کونسل قائم کی جائے جو موجودہ حالت کے مطابق اجتہاد کی صلاحیت رکھتی ہو اور قرآن و سنت کی روشنی میں نئے سرے سے مسائل پر غور و فکر کر کے کوئی رائے قائم کر سکے۔ یہ سوال بعض دوسرے علماء نے بھی اٹھایا اور علماء کی ایک کونسل کے قیام کی ضرورت کو نمایاں کیا۔ تاہم علامہ ساجد نقوی صاحب کے علاوہ کسی نے اجتہاد کی بات نہیں کی بلکہ انہوں نے بھی جب یہ مسئلہ چھیڑا تو چاروں طرف سے مخالفانہ آوازیں اٹھیں اور یہ کہا گیا کہ اس مسئلے کو نہ اٹھایا جائے اور یہ بھی کہا گیا کہ فقہ حنفی ہی کو نافذ ہونا چاہیے۔ تاہم ایک علماء کونسل کے قیام کی تجویز دیگر کئی حلقوں کی طرف سے بھی سامنے آئی۔

اپنے ایک گزشتہ کالم میں' ہم اس باب میں اظہار خیال کر چکے ہیں کہ شریعت کے منشاء کا تعین ایک ایسا نازک مسئلہ ہے جسے ارباب اقتدار پر نہیں چھوڑا جاسکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دین میں تحقیق ان کی دلچسپی کا موضوع نہیں ہوتا اور اس کے لئے جید علماء دین ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے یہ بھی تجویز کیا تھا کہ اس مقصد کے لئے علماء کی ایک کونسل ہونی چاہئے جس کا انتخاب ارکان پارلیمنٹ کی ووٹوں سے

ہو اور وہ صرف قرآن و سنت کو بنیادی ماخذ مانتے ہوئے تمام مسائل پر غور کرے۔اب وہ کثرت رائے کے ساتھ جو فیصلہ کردے اسے ملک کا قانون بنادیا جائے۔اس باب میں یہ کہنادرست نہیں ہوگا کہ اس رائے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوگابلکہ یہ فصل نزاعات کاایک مسلمہ طریقہ ہے' جو ہمیشہ سے رائج ہے۔اس طرح اگر آنے والے وقت میں کوئی دوسری کونسل' اس عہد کے علماء کی قائم شدہ کسی رائے کو تبدیل کردیتی ہے تو اسے اس کا پورااختیار ہوناچاہیے آراءاور قوانین اگر کسی نظام کے تحت تبدیل اور نافذ ہوں تو اسمیں کوئی برائی نہیں اور یہ مثبت ارتقاء کی علامت ہیں اسلئے ہمارے نزدیک علامہ ساجد نقوی صاحب کی یہ رائے صائب ہے کہ علماء کی یہ مجوزہ کونسل نہ صرف قرآن و سنت بنیاد بنا کر استنباط احکام کرے' وہ قدیم فقہااور اہل علم آراء سے استفادہ تو ضرور کرے لیکن کسی کی رائے کی پابند نہ ہو۔

اس اجتماع میں اس تنگ نظری کا بھی مظاہرہ ہوا جو فقہی اور مسلکی اختلاف کے باعث پیدا ہوگئی ہے تاہم عمومی معاشرتی فضا کے مقابلے میں' اس میں اتنی کمی ضرور آئی کہ لوگ ایک دوسرے قریب بیٹھے رہے اور انہوں نے ایک دوسرے کو گوارا کیا۔اسے بھی نفاذ شریعت کی برکت سمجھنا چاہیے۔

باغی

جاوید چوہدری

روزنامہ جنگ راولپنڈی 26 ستمبر 98ء

چکوال سے ذرا دور کلر کہار سے ذرا باہر اور مینارہ سے ذرا پیچھے لوہے کا ایک پھاٹک، کچی پکی اینٹوں کی چند کوٹھڑیاں، کھانے کا ایک طویل ہال اور ایک سادا سا ملاقاتی کمرہ ہے، اس پھاٹک، ان کوٹھڑیوں اس ہال اور اس ملاقاتی کمرے میں چند باریش مسلح نوجوان ٹہل رہے ہیں ان نوجوان مجاہدین کے سینے کشادہ ہاتھ چوڑے اور پیشانیاں فراخ ہیں، ان کی آواز میں نرمی، آنکھوں میں حلیمی اور بشرے پر یقین کی سرخی ہے، یہ مولانا اکرم اعوان کے ان ہزاروں "باغیوں" میں سے چند ہیں جو وفاقی اور صوبائی دارالحکومتوں سے سینکڑوں میل دور کھڑے انقلاب کی چاپ سن رہے ہیں، یہ لوگ بیک وقت ٹرینڈ فوجی، بہترین ایڈمنسٹریٹر، شاندار معلم اور کائنات کی وسعتوں میں اترنے اور انسانی باطن میں جھانکنے والے صوفی ہیں، آپ ان سے ہاتھ

ملائیں' آپ کو ان میں مجاہد کی گرمی اور فوجی کی سختی ملے گی' آپ ان کی آنکھوں میں جھانکیں آپ کو وہاں میزبان کی حلیمی اور شاعر کی نرمی ملے گی' آپ ان کی باتیں سنیں آپ کو ان میں صوفی کے لہجے کی مٹھاس اور مشن کے گلے کی نزاکت ملے گی۔

میں نے ان کے "کمانڈر" مولانا اکرم اعوان سے پوچھا' ساڑھے چھ فٹ اونچے' سرخ سپید رنگت اور چیتے جیسی آنکھوں والے اکرم اعوان سے جن کی ذات میں ایک شوکت' مخاطب کو مبہوت کر دینے والا دبدبہ اور گردنیں جھکا دینے والا رعب ہے اور جو جب بولتے ہیں تو منہ سے لفظ نہیں' ریشم کے نازک تار نکلتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں۔ "اطمینان سے لبریز لہجے میں بولے۔ "یہ کل کے حکمران ہیں' ان میں کچھ گورنر ہیں' کچھ چیئرمین' کچھ سیکرٹری اور کچھ کمانڈر" میں نے حیران ہو کر پوچھا' کون سا کل؟" اسی سکون سے بولے "وہ کل جب پاکستان دنیا کی واحد اسلامی سپر پاور ہو گا" میں نے انہیں مزید کریدنے کی کوشش کی "موجودہ نظام کا کیا بنے گا؟" بلند قامت صوفی نے بلند و بالا قہقہہ لگایا" یہ سوال مجھ سے گورنر صاحب نے بھی پوچھا تھا' میں نے انہیں جواب نہیں دیا تھا' جناب یہ نظام اب گیا تو آپ لوگوں کو ساتھ لے کر جائے گا۔ گورنر نے کہا مولانا بات سیدھی اور واضح کریں' میں نے عرض کیا جناب منافقت اور ظلم پر ایستادہ نظام جب جاتے ہیں تو پیروکاروں کو بھی ساتھ لے کر جاتے ہیں' کہنے لگے نہیں اب بھی نہیں سمجھا تو میں نے عرض کیا' گورنر صاحب آپ کی حکومت' آپ کا احتساب بیورو' آپ کی عدالتیں اور آپ کی پولیس جس آصف علی زرداری کو کرپٹ' چور' اور ڈاکو قرار دے رہی ہیں وہی آصف علی زرداری نہ صرف ملک کے معزز ترین ایوان کا رکن ہے بلکہ وہ ملک کی تقدیر کے فیصلوں کے لئے بلائے گئے ہر اجلاس میں اپنا ووٹ بھی ڈالتا ہے۔ یہ منافقت نہیں تو کیا ہے' یہ ظلم نہیں تو کیا ہے کہ ایک نظام ایک شخص کو چور بنا کر کٹہرے میں بھی

کھڑا کرتا ہے اور اسی وقت اسے سینئر کے حقوق بھی دیتا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا اس نظام کے خاتمے کی یہی واحد وجہ ہے" ان کے لہجے میں صوفیانہ مٹھاس بڑھ گئی "نہیں بچے نہیں نظام ٹیلنٹ کا قاتل ہے' انسانی صلاحیتوں کی بربادی کا مجرم ہے' ہمارے علاقے میں ایک ڈاکو تھا' محمد خان ڈاکو' یہ شخص تن تنہا ایوب خان جیسے مضبوط حکمران سے لڑتا رہا۔ پورے ملک کی پولیس' ساری انتظامیہ اس کا حوصلہ نہ توڑ سکی۔ جب گرفتار ہوا تو اسے ۶۲ بار پھانسی کی سزا سنائی گئی یہ ۲۶ برس تک قید میں رہا لیکن یہ قید کال کوٹھری عدالتیں' جبر اس کے اعصاب نہ توڑ سکے وہ تروتازہ تازہ رہا۔ اس نے ۲۷ برس کی طویل عمر پائی' ذرا سوچو یہ شخص اگر فوج میں ہوتا کیا اس جیسا کوئی دوسرا کمانڈر ہوتا۔ وہ کسی نپولین' ٹیٹو' ہٹلر یا ڈیگال سے کم ہوتا لیکن افسوس اس نظام نے اسے جرنیل کی بجائے ڈاکو بنا دیا۔ یہ نظام ٹیلنٹ کا قاتل ہے۔ یہ عمرؓ کو عمرؓ بن خطاب بناتا ہے اسے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نہیں بناتا۔ ہم نے اپنے اس ادارے میں ایسا ہی ٹیلنٹ جمع کیا جسے یہ نظام "عام شخص" کہتا تھا۔ ہم نے ثابت کر دیا یہ عام لوگ نہیں ہیں یہ سب محمد خان ہیں۔ ہم نے انہیں ٹریننگ دی' اب یہ لوگ ویل ٹرینڈ سولجر ہیں' بیدار مغز جرنیل ہیں شریعت کو سمجھتے ہیں' تصوف کے راہی ہیں' معاشرتی بگاڑ کی اصلاح کے خواہش مند ہیں۔

"تبدیلی کب آئیگی؟" میرا سوال سن کر مجاہد صوفی مسکرایا' اس کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک ٹمٹمائی اور اس کے لہجے میں برساتوں کی مہک پھڑ پھڑائی "انشاء اللہ ایک آدھ برس میں کیونکہ فصلیں پک چکی ہیں' کٹائی کا موسم آ چکا ہے' اب صرف ایک اعلان کی دیر ہے اور جوش عمل سے لبریز دہقان درانتیاں لے کر کھیتوں میں اتر جائیں گے" "کیا عام شہری آپ کا ساتھ دیں گے؟" وہ مسکرائے "ہاں سو فیصد کیونکہ تبدیلی کی خواہش چند لوگوں کی بات نہیں' ہر زبان کی دعا اور ہر نظر کی تمنا

ہے"۔

باہر' اس سادہ ملاقاتی کمرے سے باہر لوہے کا ایک پھاٹک' کچی پکی اینٹوں کی چند کوٹھریاں اور کھانے کا ایک طویل ہال تھا جہاں چند باریش نوجوان ٹہل رہے تھے' جن کے سینے فراخ' ہاتھ چوڑے اور پیشانیاں فراخ تھیں اور جن کی آواز میں نرمی' آنکھوں میں حلیمی اور بشرے پر یقین کی سرخی تھی اور جن کے قدموں کی ہر آہٹ اور جن کے بدن کی ہر حرکت پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔ ہم سب محمد خان تھے لیکن ہمیں خدا کے اس بندے نے ڈاکو بننے سے بچا لیا۔ اب ہم میں سے کوئی شخص نپولین' ٹیٹو' ہٹلر اور ڈیگال سے کم نہیں کیونکہ ہم جمال اور جلال' علم اور حلم کا حسین امتزاج ہیں۔ ہم صوفی بھی ہیں اور مجاہد بھی۔ ہم سپاہی بھی ہیں اور عالم بھی اور جب یہ سارے عناصر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو پھر ایسے باغی جنم لیتے ہیں۔ انقلاب جن کی منزل کا پہلا سنگ میل اور تبدیلی جن کی کتاب کا پہلا باب ہوتی ہے۔

جب میں نے تنظیم الاخوان میں شمولیت اختیار کی!!

پیر 6 ستمبر 1999 نوائے وقت لاہور

محمد طارق چودھری (سابق سینٹر)

مئی 1997ء کو جب میں نے تنظیم الاخوان میں شمولیت اختیار کی تو میرے دوستوں' عزیزوں اور سیاسی رفیقوں کے لئے یہ قطعی غیر متوقع اور حیران کن خبر تھی۔ کیونکہ اکثر لوگ نسبتاً غیر معروف مگر گہرے دینی افکار و نظریات رکھنے والی تنظیم سے وابستگی کو میدان سیاست میں دائمی ناکامی یا دوری خیال کرتے ہیں۔ اکثر سیاسی رفقا کا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں عوامی رائے کی جو کچھ بھی اہمیت رہی ہو یہ امریکہ کی رضا مندی اور اسٹیبلشمنٹ کی مدد کے بغیر کبھی بار آور نہیں ہو سکتی اور امریکی' یورپ مسلم دنیا میں ابھرتے ہوئے دینی رجحانات' عبادات کی طرف توجہ اور ظلم و جبر کے خلاف جہاد کے نعروں سے خوفزدہ ہیں وہ ہر قیمت پر اقتدار سے خالص دینی عقائد و نظریات کے لوگوں کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔ مسلم ممالک میں فوج اور سول بیورو کریسی کے ذریعے وہ

ایسے لوگوں کے لئے اقتدار کی راہ ہموار رکھتے ہیں جو لبرل' سیکولر اور کسی حد تک بدعنوان بھی ہوں تاکہ امریکہ اور اسٹیبلشمنٹ انہیں آسانی سے اپنی راہ پر رکھ سکے! صحیح العقیدہ یا راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لئے انہوں نے طنز ابنیاد پرست کی اصطلاح وضع کر رکھی ہے اور الاخوان کے امیر مولانا اکرم اعوان برسر عام اعلان کرتے ہیں کہ "میں بنیاد پرست ہوں' امریکہ بھی سن لے سب لوگ سن لیں کہ دین اسلام اور شریعت محمدیؐ کا نفاذ اس ملک کا مقدر ہے اور یہ کام میں اپنے ہاتھوں کر کے رہوں گا۔لہذا ایسے لوگوں کے ساتھ شمولیت کا مطلب ہے "اقتدار کی غلام گردشوں" سے ہمیشہ کی محرومی اگر اقتدار سے محروم رہنا ہے تو پھر آدمی اس دشت کی سیاہی میں وقت کیوں برباد کرے۔اس جماعت کی طرف میرا متوجہ ہونا بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے اگرچہ بذریعہ جنرل حمید گل مولانا اکرم اعوان سے تعارف حاصل تھا اور کئی جگہ ہم لوگ مختلف اجلاسوں میں شریک ہو چکے تھے لیکن میں انہیں "سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ" کے شیخ کی حیثیت سے جانتا تھا اور تنظیم الاخوان کی مجھے ان سے نسبت کی کچھ خبر نہیں تھی۔

میرے ایک سیاسی رفیق جو آجکل ایک بڑی سیاسی جماعت کے مرکزی رہنما بھی ہیں۔آج سے تین سال قبل ان کے ساتھ ملکی اور قومی حالات 'معیشت کی زبوں حالی' امن وامان کی ابتری' سیاست میں بدعنوانی جمہوریت کی بے چارگی' تعلیم کی کمی' بڑھتی ہوئی بیروزگاری جیسے مسائل اور ان کے حل کے بارے بحث چل رہی تھی۔دوران گفتگو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ کیوں نہ آپ کی جماعت' حمید گل 'اعوان صاحب کا سلسلہ اور جماعت اسلامی مل کر ایک بڑا پلیٹ فارم تشکیل دیں اور وسیع پیمانے پر ان مسائل سے نمٹنے کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کریں۔انہوں نے میری تجویز کیساتھ اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ "مولانا اعوان صاحب کو الگ رکھیں کیونکہ یہ لوگ "لٹھ مار" ہیں اور قطعی انقلاب پر یقین رکھتے ہیں اور کسی بھی وقت کوئی شدید بلکہ خونریز قدم اٹھا

سکتے ہیں۔ میرے دوست کا یہ مشورہ ہی مجھے ان کی طرف متوجہ کرنے کا اصل سبب بن گیا کیونکہ میں عرصہ سے ملک میں انقلاب ہی کو مسائل کے حل کا واحد ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ مختصر یہ کہ جنرل حمید گل نے تعارف کروایا' دوست مذکورہ کا مشورہ محرک بنا اور اپنے دوست حاجی اسلم کے ذریعے منارہ ضلع چکوال ان کے ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔

29 مئی 97ء قبل دوپہر ہماری تفصیلات چیت ہوئی۔ میں نے اپنے لفظوں میں ملکی حالات' عوام کی بے بسی اور قوم کی ضرورتوں کا ذکر کیا اور کہا کہ عبادات اور ذکر اذکار کے ذریعے آخرت تو شاید سنور ہی جائے گی مگر اس دنیا میں رسوا ہوتی اور ظلم میں پسی مخلوقِ خدا جو اتفاق سے مسلمان بھی ہے اس کا نجات دہندہ کون ہے' کہاں ہے؟ آپ کے پاس دیندار لوگوں کا گروہ پہلے تیار ہے۔ انہیں کام میں لائیے اور اس نظام کو بدل ڈالنے کی کوشش کیجئے۔ میری گفتگو کو انہوں نے توجہ سے سنا اور کہا کہ جنرل حمید گل بھی یہی کہتے رہے ہیں ہم نے انہیں جواب دیا تھا کہ "ہمیں آپ کی شخصیت پر اور خلوص پر پورا اعتماد ہے آپ اپنی جماعت تشکیل دیں کام کا آغاز کریں جو کچھ ہمارے پاس ہے ہم نذر کرتے ہیں لیکن وہ تھوڑا چل کے رک جاتے ہیں پھر چلنے کا نام نہیں لیتے۔ انہی کیساتھ مل کر تنظیم الاخوان بنائی تھی ہم جیسے کیسے اس کو چلا رہے ہیں۔ اب آپ آئے ہیں تو بسم اللہ کیجئے اپنی پارٹی بنائیں یا جو کچھ ہم نے بنا رکھا ہے اسکو سنبھالیں جس طرف چاہیں اس کو لے چلئے۔ اب میرے سامنے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ انہوں نے نہایت سادگی کے ساتھ گیند میری طرف بڑھا دیا۔ چنانچہ مختصر لفظوں میں کام کا پلان ان کے سامنے رکھا جسے انہوں نے پسند کیا اس وقت لاہور میں اپنے رفقاکار کے ساتھ میری ملاقات طے پا گئی جہاں اس منصوبے کو تفصیل سے مجلس عاملہ کے سامنے رکھا جسے سب لوگوں نے خوش دلی سے قبول کر لیا اور میں خاموشی سے اس تنظیم میں شامل ہو چکا تھا چند دن بعد اسلام آباد میں پریس کانفرنس منعقد کر

کے سیاست سے دستبرداری اور تنظیم الاخوان میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا۔

اس پہلے دن سے 19 اگست 99ء تک میری ہر بات کو تسلیم کیا گیا' ہر منصوبے کو سراہا گیا' ہر سطح پر مکمل حوصلہ افزائی کی گئی کبھی کوئی رکاوٹ پیش آئی نہ کسی طرح کے حسد' بغض' سیاست کا سامنا کرنا پڑا۔ قائدین سنجیدہ اور معاون کارکن پر جوش اور مخلص۔ تنظیم الاخوان کی اصل طاقت' اہمیت خدوخال اور طرز فکر سے عوام الناس ابھی پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ یہ سیاسی تحریک ہے نہ فرقہ پرست دینی جماعت معروف معنوں میں یہ سیاسی جماعت ہے نہ دینی جماعتوں کی طرح کی روایتی تنظیم۔ یہ ایسی دینی جماعت ہے جس کا پس منظر' طرز عمل' فکر و فلسفہ اور قیادت دوسری تنظیموں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی قیادت معروف معنوں میں کسی عالم دین کے ہاتھ میں نہیں نہ ہی مرکزیت ملاؤں' مولویوں مدرسوں سے فارغ التحصیل افراد کے پاس ہے۔ اس کی قیادت ایک صوفی کے پاس ہے جسے جدید اور قدیم علوم پر پوری دسترس حاصل ہے۔ وہ اپنے قد کاٹھ ڈیل ڈول کے برعکس میانہ لب و لہجہ میں متوازن گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے نظریات صاف افکار واضح اور تکلم میں تسلسل اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ مشاغل میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے وہ سیر و شکار کے شیدائی ہیں' نشانہ بے لاگ' بندوق سے اس کو کسی قبائلی افغان سے زیادہ پیار ہے اس کے اسلحہ خانہ میں بہترین بندوقیں' رائفلیں جمع رہتی ہیں۔ وادی سون جس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ برصغیر جسے دنیا میں جیالوجی کی لیبارٹری بھی کہا جاتا ہے اس میں شکار کی تلاش کے دوران وہ لاکھوں بلکہ کروڑوں برس پرانے سکے اوزار برتن حتیٰ کہ گھونگے اور سیپیاں (جو اب پتھر ہو چکے ہیں) تک کھوج نکالتا ہے جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہاں کبھی سمندر موجزن تھا۔ اسکی نشست گاہ کا ایک بڑا حصہ ان قدیم آثار کا عجائب گھر معلوم ہوتا ہے۔ وہ مفسر قرآن' شاعر اور ادیب بھی ہے۔ نعت کہتا' غزل لکھتا' نثر سے طبع آزمائی کرتا ہے۔ تقریر کے

فن اور اپنے پہ گرفت پر اسے کمال حاصل ہے۔ ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا قد بھاری ڈیل ڈول' بے ترتیب پگڑی اسکی وجاہت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ سادہ غذا' تھوڑی نیند' لمبی سیر' ذاتی تجربے مشاہدے پر مشتمل قہقہوں بھری گفتگو بیماری سے لاچار' مصروفیت سے بیزار اور کام کی زیادتی کی شکایت کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ اذان فجر اور نماز مغرب کے بعد اجتماعی ذکر ان کا خاص وظیفہ ہے۔

ان کے پاس سنجیدہ' دیانتدار' تجربہ کار ریٹائرڈ فوجی افسروں کی قابل ذکر تعداد موجود ہے جو حکم سنتے ہی نہایت سنجیدگی کیساتھ اسکو نافذ کرنے دوڑ پڑتے ہیں اور وہ امیر کا حد درجہ احترام کرتے اور اس کے سامنے سوال نہیں کرتے بس حکم بجالاتے ہیں۔ ایسا ادب لحاظ احترام جو سامنے ہی نہیں پیٹھ پیچھے بھی کیا جاتا ہو کسی دوسری جگہ نظر نہیں آیا ہم عصروں میں صرف سید مودودی کو یہ اعزاز حاصل تھا قیادت کی کمی ہے نہ پرجوش بہادر کارکنوں کی۔ یہ لوگ معروضی حالات و مسائل سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ ملکی آئین اور اسکے نتیجے میں بننے والے اداروں کے پیدا شدہ نتائج سے یہ لوگ بھی اسی طرح غیر مطمئن اور مضطرب ہیں جس طرح کوئی بھی صاحب احساس پاکستانی۔

نیا نظام' نیا امام

ایم ایم ادیب

اوصاف 23/12/98

جاڑے کا دن بھی کتنا قابلِ رحم ہوتا ہے کہ اتنی لمبی رات کا کشٹ کاٹ کے دبے پاؤں آتا ہے اور سہمے ہوئے قدموں سے رخصت بھی ہو جاتا ہے تیرہ دسمبر کا دن بھی ایسا ہی تھا دھند میں لپٹا کہرے کی چادر اتنی دبیز تھی کہ اپنا وجود آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا' یوں لگتا تھا آج سورج کو نمودار ہونے کا راستہ ہی نہیں ملے گا' پورا شہر ٹھٹھر کر برف بن چکا تھا' شریانوں میں خون جمنے کو تھا' حرف و صوت کا رشتہ ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا' بلا کی سردی کے اس موسم میں نوجوانوں کا ایک گروہ یخ بستہ فضا کے احساس سے عاری اپنی دھن میں جلسے کے انتظامات کی تیاری میں مصروف تھا' یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی نے یقین دہانی کرا دی ہو کہ سورج ضرور نکلے گا' دن کے چہرے سے کہرے کی چادر پورے طور پر ہٹ جائے گی۔

پھر یہی ہوا قلعہ کہنہ قاسم باغ کے ٹنڈ منڈ درختوں کی بے سدھ شاخیں سر اٹھانے لگیں' بے حس و حرکت پتے جاگ اٹھے' سورج کی نیم گرم کرنوں نے پورے ماحول میں جان ڈال دی۔ اسکے ساتھ ہی شہر کی کھوئی ہوئی رونق بھی لوٹ آئی' یہ ان کے قہقہوں کے حضور مدینۃ الاولیا کا خراج تھا جو شیر شاہ سوری کی یادگار شاہراہ کے اس پار نشتر ہسپتال کے عقبی قبرستان کے پہلو میں الاخوان کے دفتر میں بیٹھے ٹریفک کے جان لیوا حادثے میں بال بال بچ جانے پر ہنس رہے تھے وہ جو کولیسٹرول کا لیول سات سو ہونے کے باوجود زندہ ہیں وہ جو انار میلٹی کی انتہاؤں سے بھی تجاوز کرنے جانے والی ذیابیطس کے باوجود اپنے وقت کو آرام و سکون کے لمحات کی نذر کرنے کے بارے میں سوچتے تک نہیں' گرم دم جستجو کے اصول پر عمل پیرا' مگر نرم دم گفتگو سے منحرف محمد اکرم اعوان جو عام لوگوں میں بیٹھے تھے تو عام آدمی ہی لگ رہے تھے' لیڈرانہ نخوت سے بیگانہ ان کی بزلہ سنجی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا' مگر کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ شیر و شکر ہونے کی اس قدر صلاحیت رکھنے والے لوگ بھی تا حال اس دنیا اس خطہ ارض پر موجود ہیں' رات کے عابد زاہد دن کے شہسوار رب کی دھرتی رب کا نظام کے نفاذ کے داعی' کامیابی ان کے قدم کیوں نہیں چومے گی؟ کہ ان کی زندگی کے سارے ڈھب ہی کامیاب لوگوں کی تاریخ ساز زندگی و شخصیت کا عکس ہیں' جو حصول اقتدار کے غم میں گھلے نہیں جاتے جو عظمت رفتہ کے کسی کھوئے ہوئے گم گشتہ خواب کی تعبیر لگتے ہیں۔ یہ میرا ہی احساس نہیں جسٹس تقی عثمانی کی گود میں پلے مفتی مسعود تحسین کی رائے اور خیال بھی یہی ہے کہ "امیر تنظیم الاخوان" محمد اکرم اعوان اسلاف کے افکار و خیالات کی تازہ جھلک ہیں' زندہ تابندہ تصویر ہیں' ان کے مشن کی تکمیل کا ایک اور سنگ میل ہیں" نوجوان مفتی نے نگارخانے سے متصل قاسم باغ کے بڑے گراؤنڈ میں لگے سٹیج پر جمعیت علمائے ہند کے عظیم رہنماؤں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی تاریخ ساز جدوجہد کے

زائد جب مولانا کی شب و روز کی کاوشوں سے ملانے' تو چند ساعتوں کے لئے ہزاروں کے اجتماع پر سکوت طاری ہو گیا۔ اجتماع کہ جس کی تیاریاں پچھلے ایک ماہ سے جاری تھیں شہر کے ہر تیسرے رکشہ کی پشت پر بینر' شہر کی ہر سڑک ہر چوک اور ہر موڑ پر ایک وسیع و عریض بینر انقلاب کے نعروں سے مزین' نئے نظام کے متروہوں سے مرصع نئے امام کے پیام سے منقش' جس کی کشش سے مہران تا خیبر کونسا چھوٹے سے چھوٹا شہر ہو گا جس سے کوئی قافلہ ملتان نہ پہنچا ہو' چھوٹے بڑے شہروں کے لوگ بس ایک ہی جذبے سے سرشار تھے کہ اب نفاذ اسلام کی خاطر جان کی بازی لگانے کا وقت آچکا ہے اب انسانیت کی بقاء کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اسلامی نظام کی راہ میں حائل ہر پتھر اب خود بخود ہٹ جائے گا جادہ جہاد پر چلنے والوں کو منزل کے نشان قریب سے قریب تر نظر آرہے ہیں' ان کی خوش فہمی ہے یا اللہ پر یقین کامل کی انتہاء بہر کیف فضا میں تبدیلی کے در آنے کی خوشبوئیں اب عوام کے نتھنوں سے چھونے لگی ہیں۔ شعور کی بیداری کے آثار ہی تو ہیں کہ کسی ایک آواز پر سینکڑوں میل کی مسافتیں طے کر کے قافلے کے قافلے عازم سفر ہوتے ہیں۔ شہر میں ایک نیا شہر بس جاتا ہے' کوئی مسافر کسی میزبان کی آس پر سفر نہیں کرتا خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ان قافلوں کی عظمت پر رشک آتا ہے' ان کے جذبہ حریت پر فخر سا ہونے لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں روشن امید کے ان دیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جن کے نور سے وہ دین کی گمشدہ راہوں کو اجالنے کی سعی پیہم کر رہے ہیں۔

لمحہ شکر ہے کہ راہ حق کے جانبازوں اور جانثاروں کو ان کا امیر خوابوں کے سہارے اپنے ساتھ نہیں رکھے ہوئے' نہ ہی ان کے منہ میں امید کی چوسنیاں دے کر انہیں اقتدار کے ایوانوں کے گھیراؤ جلاؤ پر اکسانے کی کوشش کر رہا ہے۔

پورے شرح صدر کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انقلاب کے لئے جس خون کی

ضرورت ہوتی ہے وہ خون مولانا اکرم اعوان نے جمع کر لیا ہے' وہ خون جس میں جاگیرداری' سرمایہ داری اور جرنیلی حاکیت کی نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ "تنظیم الاخوان" کے امیر بو جھل الفاظ پر مشتمل لچھے دار تقریروں کے ذریعے سادہ لوح عوام کے جذبوں کو استعمال نہیں کرتے پھرتے' وہ معروضی حقائق پر بات کرتے ہیں وہ افتادگان خاک کے جذبات واحساسات کی زبان بولتے ہیں' وہ حکمرانوں سے سوال کرتے ہیں کہ تمہارے ملک کے امیروں کے کتے یخنی پئیں اور غریبوں کے بچے صاف پانی کو ترسیں تمہارے وزیروں کے بچے ایئر کنڈیشنڈ گھر میں رہیں ٹھنڈی کاروں میں سفر کریں اور غریبوں کے بچوں کے رہنے کو گھر نہ ہو یہ کہاں کا انصاف ہے ؟

تمہارے کارخانوں کی چمنیوں سے مزدوروں کے لہو کی باس آتی ہے وہ مزدور جن کے بچوں کو تن ڈھانپنے کا کپڑا میسر نہیں اور تمہارے بچے ریشمی لباس زیب تن کرتے ہیں۔ تمہارے شاہی نوکروں کا علاج بیرون ملک کے بھاری فیسوں والے ہسپتالوں میں سرکاری خرچے پر ہو اور کسان کی بیٹی اور بیوی خون تھوکتے تھوکتے مرجائے' یہ کہاں کا عدل ہے ؟

ایسے نظام پر لعنت' اس نظام کے استحکام کے لئے جدوجہد کرنیوالوں کی ہر سعی اور ہر کوشش قابل صد مذمت ہم اس نظام سے بغاوت کرتے ہیں۔ باغی ہاتھ اٹھا اٹھا کر بازو ہلا ہلا کر اپنے امیر کی تائید کرتے ہیں۔ ان کے ایک حکم پر سروں کا نذرانہ پیش کرنے کا اعادہ کرتے ہیں وہ عہد جو امیر کے ہاتھ پر بیعت کی صورت پہلے ہی طے ٹھہرا' فضا نعروں سے گونج اٹھی ہے۔

خاتمہ ہو ظلم کا
عدل ہو اسلام کا
بدل دو ساری فضاء
نیا نظام لائیں گے' نیا امام لائیں گے

لیاقت باغ کا آخری جلسہ

روزنامہ اساس پنڈی 21 اکتوبر 98ء

عین حسین علوی

پنڈال میں دور و نزدیک سے قافلوں کی آمد شروع تھی سیکورٹی پر مامور کارکنان انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ گاڑیوں کی پارکنگ کرا رہے تھے سٹیج سے ان قافلوں کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے انقلاب آفریں اعلانات جاری تھے راقم پنڈال میں گھومتے ہوئے ان اعلانات کو سن رہا تھا تو ذہن میں ماضی کے کئی اسلامی انقلابی جلسوں کی صدائے بازگشت گونجنے لگی۔ جن کے الفاظ و انداز تو یقیناً مختلف ہوا کرتے تھے لیکن کچھ اسطرح کے جذبات اور امیدوں کے نمائندہ الفاظ بول کر اپنی خواہشات کو زبان دی جاتی رہی ہے یہ اور بات ہے کہ ایسے الفاظ صرف مستقبل کے مورخ ہی کے کام آتے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد امیر الاخوان جلسہ گاہ میں تشریف لے آئے پنڈال جو کہ اس وقت تک بھر چکا تھا پر محفل کے استقبال کے لئے سراپاء محبت نظر آ رہا تھا۔ باقاعدہ جلسے کے پہلے مقرر جناب قاضی غیاث الدین

جانباز صاحب نے ولولہ انگیز اور جذبات سے لبریز خطاب فرمایا۔ جانباز صاحب کے بزرگانہ جوش وخروش نے نوجوانوں کو بھی گرما دیا۔ جانباز صاحب سے غائبانہ تعارف تو ایک زمانے سے تھا جب وہ پیپلز پارٹی کے سرگرم رہنما ہوا کرتے تھے۔ دراصل سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی کارستانیوں کا ردعمل ان جیسے کثیر سیاسی کارکنوں کو بھٹو صاحب کی طرف کھینچ لایا تھا۔ مساوات محمدی ﷺ کا نعرہ ہی ایسا پرکشش تھا کہ جانباز صاحب جے اے رحیم، شیخ رشید، طارق عزیز، معراج محمد خان اور نہ جانے کتنے سوشلزم سے متاثر سیاسی مخلصین پروانے کی مانند پیپلز پارٹی کی طرف لپکے۔ لیکن جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ کچھ تو جلد ہی وہاں سے نکل آئے جب کہ کچھ بہتری کی امید پر نیم دروں نیم بروں جڑے رہے اور خزاں رسیدہ پتوں کی طرح اپنی اپنی باری پر جھڑتے رہے۔

جانباز صاحب کا خطاب واقعتاً ایک منجھے ہوئے سیاست دان کا خطاب تھا البتہ جوش اور جذباتیت کی آمیزش بھی اس میں موجود تھی اس لئے سٹیج سیکرٹری صاحب نے ان کے خطاب کے بعد اس جلسے کو لیاقت باغ کا آخری جلسہ قرار دیا چونکہ اسکے بعد تو عملی تحریک چلے گی۔ خطاب سن کر ذہن ان کے کالموں کی طرف مڑ گیا جو کہ اسی سال مارچ اپریل میں تواتر کے ساتھ "روزنامہ اساس" میں چھپتے رہے ہیں۔ جانباز صاحب تو شاید بھول گئے ہوں۔ لیکن مجھ جیسے کتنے سادہ لوح ان کالموں کی پیشگوئی کی بناء پر جون 98ء میں انقلاب اسلامی کی آس باندھ بیٹھے تھے۔ دراصل جانباز صاحب نے اوپر تلے چار پانچ کالموں میں کچھ اس طرح سے سماں باندھ دیا تھا اور چونکہ پیشگوئی کی بنیاد امیر الاخوان مولانا محمد اکرم اعوان صاحب کا یقین آمیز فرمان تھا کہ "جون میں سبھی کچھ بدل جائے گا یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے----اللہ کریم کو اپنی مخلوق پر ترس آ گیا ہے"

اب ظاہر ہے جانباز صاحب نے اسطرح کے پختہ الفاظ میں اور ایک صاحب کشف بزرگ کی طرف نسبت کر کے جب پیشگوئی فرمائی تو ظلم و ناانصافی سے ستائے ہوئے مظلوم آخر کیونکہ یقین نہ کرتے۔ لیکن اسے اپنی بدقسمتی ہی کہیے کہ جون بھی گزر گیا لیکن کچھ بھی نہ بدلا نہ تو حکومت بدلی اور نہ ہی فرسودہ نظام ختم ہوا البتہ شکنجے مزید کستے ہی گئے بلکہ مسلسل کستے ہی چلے جا رہے ہیں۔ لیکن جانباز صاحب آس دلا کر ایسے بھولے کہ وضاحت کرنا بھی ضروری نہ سمجھا کہ انقلاب موعودہ وقت پر کیوں نہیں آسکا حالانکہ ان کے بقول وہ تو اللہ کا فیصلہ تھا۔ جس کے بارے سنا یہی ہے کہ اٹل ہوا کرتا ہے۔

اس تناظر میں گزشتہ دنوں جب معلوم ہوا کہ 18 اکتوبر کو امیر الاخوان لیاقت باغ میں خطاب فرمانے والے ہیں اس لئے جستجو بڑھی۔ جلسے کے حوالے سے شہر میں پوسٹر دیکھے جو "فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے" کے عنوان پر مبنی تھے۔ اس لئے مزید دلچسپی پیدا ہوئی۔ جلسہ گاہ میں الاخوان کا نظم و ضبط واقعتا قابل ستائش تھا۔ اس تنظیم کو قائم ہوئے ابھی گو کہ پانچ برس ہی ہوئے ہیں لیکن جلسہ خاصا کامیاب اور منظم تھا۔

جناب جانباز صاحب کے پرجوش خطاب کے بعد میر محفل مولانا محمد اکرم اعوان صاحب جنہیں ان کے مریدین اور ساتھی حضرت جی کہتے ہیں کا خطاب شروع ہوا۔ مولانا کے خطاب کا اپنا ہی اسلوب اور دلپذیر انداز ہے۔ سادہ لیکن دل میں اترنے والا انداز سامعین کو ہمہ تن گوش رکھتا ہے۔ مولانا تاریخی واقعات' تمثیلات اور حالات حاضرہ کو دلچسپ انداز میں مربوط کرتے جا رہے تھے۔ مولانا کا خطاب تو پسند آیا لیکن پوسٹر پر چھپے اعلان اور جلسے سے قبل آغاز انقلاب کی جو نوید سنائی جاتی رہی اس حوالے سے کم از کم راقم کو تو کوئی فیصلہ کن پیغام نہیں مل سکا حکومت کی ناکامی اور ضرورت انقلاب پر مولانا محترم کا تجزیہ بالکل درست لیکن

نصف صدی سے جس تبدیلی کی نوید مختلف دینی قائدین عوام کو سناتے چلے آرہے ہیں وہ کیسے آئے گی۔ الاخوان کے امیر اہلیان راولپنڈی کے لئے اس حوالے سے نیا پیغام دینے تشریف لائے تھے۔ اس خطاب سے دوٹوک انداز میں اس کا اظہار و اعلان نہیں ہوا۔ البتہ جلسے کا مجموعی رنگ اور مزاج نیز حضرت جی کے خطاب کے بین السطور ایک پیغام دے رہے تھے اور وہ الجہاد یعنی مسلح تصادم کا پیغام تھا۔ چونکہ سٹیج سے باربار "تیری بقاء میری بقاء الجہاد' الجہاد" جیسے نعرے لگوائے جاتے رہے۔ مولانا محترم نے بھی کربلا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہمیں کربلا میں اترنے پر مجبور نہ کیا جائے ورنہ ہم ایسی کربلا سجائیں گے کہ صدیوں تک خون بہتا رہے گا" مزید کہ جلسے کے آخر میں کارکنان سے موت پر بیعت بھی لی گئی ہے جبکہ گزشتہ ماہ لاہور کے جلسہ میں بھی اسی طرح کی بیعت لی جا چکی ہے۔

نوید انقلاب

غلام مصطفیٰ ملک

روزنامہ "اساس" راولپنڈی 30 جنوری 1999ء

گاڑی کی رفتار دھیمی ہو چکی تھی۔ جس طرح گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی ایسے ہی جنرل صاحب کی قیمتی گاڑی میں ملک کو درپیش خطرات 'اور مستقبل کے حالات پر گفتگو جاری تھی۔ جنرل صاحب جیسے جہاندیدہ شخص سے الجھنا میں سمجھتا تھا کہ بے وقوفی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ بولنے پر مجبور کرتے۔ رائے سننے کی خواہش کرتے کبھی ہماری باتیں سن کر بے ساختہ ہنس پڑتے۔ اور کبھی سنجیدہ ہو جاتے۔ کبھی شفقت بھرے لہجے میں مشورہ دیتے تو کبھی استاد کی طرح نصیحت کرتے۔ کبھی ڈانٹ دیتے۔ کبھی داد دیتے۔ کہتے ہیں کہ دانا آدمی کے ملازم بھی دانا ہوتے ہیں۔ اس دلچسپ گفتگو میں کبھی ڈرائیور بھی بول پڑتا۔ اور کبھی کوئی گن مین بھی منہ ہلا دیتا۔ بات امریکہ کی اسلامی ممالک میں مداخلت سے چلی اور پاکستان کے حالات پر ٹھہری جنرل صاحب نے پاکستان کے حالات کا صحیح رخ دکھلایا اور نفاذ شریعت کے بل پر بولنا

شروع کر دیا مجھے اس وقت عجیب تعجب ہوا۔ جب مجھے جنرل صاحب نے سوچوں میں گم پا کر پوچھا۔ برخوردار۔ بتاؤ شریعت کے نفاذ کے بعد اسمبلی اور کابینہ میں شریعت کا تعین کون کرے گا؟ میں نے کہا کہ وہاں خالد انور ہیں۔ راجہ ظفر الحق ہیں اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ جماعت اسلامی کے سابقہ ممبر انوار الحق رامے ہیں۔ جو مذہبی معاملات پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ اور خود بھی انہوں نے اسلامیات میں ماسٹر کر رکھا ہے۔ لیکن جنرل صاحب میری بات سن کر مسکرائے انہوں نے سر جھٹکا۔ پیشانی پر آئے بالوں کو درست کیا۔ گہری سانس لی اور شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ برخوردار مجھے راجہ ظفر الحق کی مذہب سے عقیدت سے اختلاف نہیں محمد انوار الحق رامے کی بصیرت سے انکار نہیں۔ لیکن جس کا کام اسی کو ساجھے کتنے علماء ہیں جو شریعت بل کو قابل اعتبار قرار دے چکے ہیں۔ کتنے علماء ہیں جو شریعت بل کے متعلق اطمینان رکھتے ہیں؟ کتنے علماء ہیں جن کو آپ کی حکومت نے اعتماد میں لیا ہے؟ اسلامی نظریاتی کونسل کی کتنی سفارشات کو شریعت بل کا حصہ بنایا گیا؟ شرعی عدالت کے فیصلوں کا احترام شریعت بل میں کتنا ملحوظ خاطر رکھا گیا؟ اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ یہ شریعت بل عوام کی مسائل سے توجہ ہٹانے کا ایک آلہ۔ اقتدار کو طول دینے کا بہانہ ہے عوامی حمایت حاصل کرنے کا ایک نعرہ ہے۔ ورنہ کچھ بھی نہیں وہی سب کچھ ہے۔ جو 73ء کے آئین میں ہے آٹھویں ترمیم ہے۔ ورنہ یہ کچھ بھی نہیں جنرل صاحب خاموش ہوئے اور پھر بولے اب تم بتاؤ کیا اس "ٹوٹے بھجے" شریعت بل سے ملک میں اسلامی نظام آئے گا۔ ایسی صورت میں کہ شراب سر عام ملتی ہو۔ شباب ہر چوک چوراہے میں بکتا ہو۔ کرپشن' لوٹ مار' اقربا پروری عام ہو' جہاں اپنوں کو نوازا جاتا ہو۔ انصاف کوڑیوں کے بھاؤ بکتا ہو۔ تھانے نیلام ہوتے ہوں علاج صرف امراء کا ہوتا

ہو۔ روزگار صرف بڑوں کے بیٹوں کو ملتا ہو۔ احتساب صرف دشمنوں کا ہوتا ہو۔ جہاں غریب صرف ظلم سہتا ہو۔ بڑوں کی حضوری کرتا ہو اور جہاں قانون کے محافظ ہی قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوں۔ ایسے ملک میں چہرے بدلنے سے نہیں نظام بدلنے سے تبدیلی آئے گی اور تبدیلی صرف اخبارات کی خبروں میں۔ اور فائل کے کاغذوں میں نہیں بلکہ عملی طور پر آئے گی تو اس قوم کی حالت سنورے گی۔ ورنہ یہ کاغذی پلاؤ اس قوم کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتے۔ جنرل چپ ہوئے تو ان کی آنکھوں میں تیرتے آنسو مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ گاڑی کا ڈرائیور جذبات کی رو میں بہہ کر رفتار بڑھا چکا تھا۔ میں نے کہا جنرل صاحب ان تمام مسائل کا حل کیا ہے۔ جنرل صاحب نے ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو روکا۔ گھٹی ہوئی آواز کو کھنکھار کر صاف کیا۔ میری طرف چہرہ کیا۔ اور گویا ہوئے بیٹا ''انقلاب' صرف انقلاب'' ایسا انقلاب جو سب کچھ بدل دے۔ سارا سسٹم تبدیل کر دے۔ جو غریب کو اس کا حق دے۔ جو مظلوم کی داد رسی کرے۔ جو میری دنیا کے غریبوں کو جگادے۔

کون ہو جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو؟ جنرل صاحب چپ رہے۔ گاڑی چوراہے پر پہنچ چکی تھی مجھے یوں لگا جیسے یہ گاڑی چوراہے پر پہنچ کر پاکستانی قوم کی طرح اپنی منزل سے بھٹک جائے گی اور کسی بند گلی میں پہنچ کر رک جائے گی لیکن گاڑی کا مسافر کوئی عام شخص نہیں ایک جنرل تھا۔ لیکن سب تو جنرل نہیں ہوتے۔ ان کو تو راہ دکھلانے والا کوئی ہونا چاہئے۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور دیواروں پر چپکے اشتہارات اور لکھے نعروں پر میری نظر پڑی۔ میلی ہوئی دیواروں اور پھٹے ہوئے اشتہاروں میں ایک چہرہ ایسا بھی نظر آیا جن پر نورانیت تھی۔ سکون قلب کی اطمینانیت تھی۔ جن کے ساتھ میرا تعلق اتنا پرانا ہے کہ میں

گزرے لمحوں کو شمار بھی کرنا چاہوں تو ان کی رفاقت کے آغاز کا اندازہ نہیں کر پاؤں گا۔ وہ دن کسی دھندلی ہوئی تصویر کی طرح میرے ذہن میں نقش ہے۔ جب میں والد محترم کے ساتھ جناب صوبیدار حیدر زمان صاحب کی معیت میں "منارہ" پہنچا تھا اور حضرت جی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی میرے ذہن کے تمام تاریک گوشے روشن ہو گئے جنرل صاحب کی گفتگو کا نتیجہ تھا یا حضرت جی سے دلی، ذہنی، فکری، روحانی' لگاؤ کا اثر کہ میری سوچیں ایسے راستے پر چل نکلیں۔ جن کے اختتام پر مولانا محمد اکرم اعوان نظر آتے ہیں' میرے مربی' میرے محسن' میرے شیخ' مولانا اکرم اعوان' جو سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ' تنظیم الاخوان کے امیر' صقارہ ایجوکیشن سسٹم کے سربراہ، مفسر قرآن، شاعر' ادیب' صنعتکار' زمیندار' بیکار ہیں وہ تمام خوبیاں' وہ تمام صفات جو کسی مکمل انسان میں ہونی چاہیں کے مالک ہیں اللہ نے انہیں جہاں تصوف کی دولت سے نوازا ہے۔ وہیں علم و فکر کی حکمت و دانائی اور چشم بصیرت عطا کی ہے جو ظالم سے نبرد آزما ہونے کے لیے گدی کو چھوڑ کر' آرام و سکون کو ترک کر کے اسلامی نظام کے نفاذ کے نوید انقلاب کے ساتھ میدان میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔۔ جو مغربی جمہوریت کو قوم کے لیے زہر قاتل اور اسلامی نظام کو آب حیات قرار دیتے ہیں جو قدامت پسند ہونے کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں۔ اور طاغوتی طاقتوں، سامراجی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ جو مملکت خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اپنی جان کا آخری قطرہ خون بہا دینے کا عزم کر چکے ہیں۔ جو موت کو گلے لگانے کا حکم دے چکے ہیں اور موت پر بیعت لے چکے ہیں۔ ہاں یہی شخص جو نوید انقلاب لے کر آیا ہے امام انقلاب بن سکتے ہیں ورنہ دعوے کرنے تو آسان ہیں لیکن اسلامی حکومت کا عملی نمونہ پیش کرنا اور اسلام کی خاطر سر کٹانا بہت مشکل کام ہے۔

شک کے مارے ہوئے لوگو "شریعت" ایسے نافذ ہوگی

شکیل پراچہ

روزنامہ لشکر 17 ستمبر 98ء

یہ دور بلا شبہ تشکیک کا دور ہے یونانی سوفسطائیوں کی طرح بعض اوقات "ذہانت" اور قلم کی کمائی کھانے والے دن کے اجالے کے بارے میں بھی شکوک و شبہات پیدا کر دیتے ہیں جب سے حکومت نے پندرھویں آئینی ترمیم کے ذریعے نفاذ شریعت بل پیش کیا ہے یہ "تشکیکیئے" ایسی ایسی دور کی کوڑی لا رہے ہیں کہ فیثاغورث بھی ان کے سامنے صاحب یقین لگنے لگتا ہے "اس ملک میں شریعت نافذ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ وزیر اعظم نے یہ بل زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنی ذات کے لئے حاصل کرنے کے لئے تین شقوں کا سہارا لیا ہے"

ایک اور شک آلود ذہنیت سوال داغتی ہے کہ شریعت بل کی ضرورت ہی نہیں تھی اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس ایک شریعت بل پہلے ہی موجود ہے اس بل

کو ہی نافذ نہیں کیا جا سکتا تو اب سات سال بعد یہ کام کیسے ہو گا ایک تیسرا دھڑ کا لگا تا ہے کہ پارلیمنٹ میں شرابی' زانی' سود خور' خزانہ چور اور حرام خور بیٹھے ہوئے ہیں شریعت کیسے نافذ ہو گی؟

اسی طرح کا ایک اور تشکیکیا چوراہے میں کھڑا خمار زدہ لڑکھڑاتی آواز میں اپنی پٹاری سے دو سوال نکال کر صدا لگاتا ہے "شریعت نافذ کرنے والے کون ہیں؟ کیا ہیں؟ اور اس سے بھی زیادہ خطرناک سوال یہ ہے کہ جن پر شریعت کا نفاذ ہو گا وہ کون ہیں؟ کیا ہیں اور کیسے ہیں؟ اور یہ سوال اگل دینے کے بعد اسے مزید ابکائیاں آتی ہیں کہ جاگیروں اور صنعتوں کے مالک جو محلات میں رہتے ہیں' قیمتی گاڑیوں میں پھرتے ہیں' بیش قیمت گھڑیاں' جوتے اور ملبوسات استعمال کرتے ہیں یہ حکمران شریعت نافذ نہیں کر سکتے اور یہ کہ عوام چونکہ ایرے غیرے' نتھو خیرے للو پنجو اور مالو مصلی ہیں اور وہ اپنے گھروں کا گند باہر گلیوں میں ڈال دیتے ہیں اسلئے ایسے عوام پر بھی اسلام نافذ نہیں ہو سکتا شریعت کے نفاذ کو محض ایک سیاسی نعرہ سمجھنے والوں کو اس بات کی سمجھ آ ہی نہیں سکتی کہ اللہ نہ صرف تمام جہانوں کا مالک ہے بلکہ وہ تمام زمانوں کا بھی مالک ہے ارے کم نظرو! جس نے شریعت دی ہے وہ اس کے نفاذ کے جملہ لوازمات سے کیسے بے خبر رہ سکتا ہے؟

شریعت کیا ہے؟ قرآن و سنت پر مبنی نظام کیسا ہوتا ہے؟ اور پاکستان میں شریعت کا نفاذ کیسے ہو گا؟ یہ نظام نافذ کرنے والے کون ہوں گے؟ اور یہ کہ وہ عوام کہاں ہیں جن پر شریعت نافذ کی جائے گی؟ ایسے اور اسی طرح کے دیگر سوالات کا جواب لینے کے لئے میں آپ کے سامنے ایک منظر پیش کر رہا ہوں اور ان سب تشکیکیوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ 13 ستمبر کے اردو انگریزی کے سبھی قومی اخبارات میں تنظیم الاخوان کے بارہ ستمبر کے جلسہ لاہور کی رپورٹنگ کو "ایمان" کی

آنکھوں سے پڑھیں شاید ان کو اپنے خود ساختہ سوالوں کے جہنم سے بچ نکلنے کا ایک یقینی راستہ مل جائے۔ موچی دروزہ لاہور کی تاریخی جلسہ گاہ ہے اس میں تنظیم الاخوان ایک جلسہ منعقد کر رہی ہے جلسے سے تنظیم کے سربراہ امیر محمد اکرم اعوان خطاب کر رہے ہیں سامعین کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار سے کسی طرح کم نہیں سامعین میں خواتین کی ایک بڑی تعداد بھی شریک ہے مردوں میں اکثریت تنظیم الاخوان کے ورکرز کی ہے نام کے مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد حاضر ہے جلسہ گاہ سے باہر ہر طرف ٹریفک بلاک ہے اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ دم بخود کھڑے ہیں اسلام آباد اور لاہور سے جلسہ کی کوریج کے لئے فارن اور قومی پریس کے نمائندہ افراد بھی موجود ہیں۔ ایک دراز قد' باریش اور کشادہ چہرے والا انسان ڈائس پر آتا ہے اور درود و سلام کے بعد یہ انسان ہجوم سے مخاطب ہوتا ہے "ہم اب اس ملک پر کسی فاسق و فاجر کو حکومت نہیں کرنے دیں گے اسلام ہی پاکستان کا مقدر ہے حکمران بھی سن لیں امریکہ بھی سن لے شریعت کی مخالف قوتیں بھی سن لیں اب پاکستان میں یا اسلام نافذ ہو گا یا ہم اپنی گردنیں کٹائیں گے" یوں لگتا ہے جیسے یہ آواز سیدھی آسمانوں سے آ رہی ہے پارلیمنٹ میں بیٹھنے والو! تم سن لو اللہ رب العزت نے تمہیں موقع دیا ہے کہ تم ملک میں اسلامی نظام نافذ کر کے اپنی عاقبت سنوار لو اسلام ہی میں ہم سب کی نجات ہے سودی معیشت ہمارے تمام مسائل اور مشکلات کا سبب ہے لوگو! فیصلہ تو ہو چکا ہم شہادت کا راستہ اختیار کر چکے ہیں اب ہم لوٹ کر اپنے گھروں کو نہیں جائیں گے۔ اس موقع پر اکرم اعوان کہتے ہیں موت کے اس راستے میں کون ہے جو میرا مددگار ہو؟ سوال بھی آسمانوں سے آیا ہوا لگتا ہے لیکن اس قدر پر شکوہ ہے اور اس قدر محبوبیت اپنے اندر رکھتا ہے کہ ہجوم کو فیصلہ کرنے میں ساعت بھی نہیں لگتی جواب آتا ہے "ہم حاضر ہیں" جواب دینے والوں میں شامل باریش 'کلین شیو'

صرف مونچھوں والے' خواتین' بچے' مرد جلسہ گاہ کے اندر موجود منڈیروں سے لٹکے ہوئے کوٹھوں پر چڑھے ہوئے سڑک پر کھڑے ہوئے ٹرکوں اور بسوں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے ان ایرے غیروں' نتھو خیروں' مالو مصلیوں' پنچوؤں اور للو پنچوؤں کو یک دم کیا ہو گیا؟ یہ سبھی تنظیم الاخوان کے ورکرز تو نہیں' یہ سب امیر محمد اکرم اعوان کے مرید تو نہیں؟ تو آخر یہ سب کیوں کہہ رہے ہیں کہ ہم حاضر ہیں؟ میری دانست میں ان سب کو اپنے زندہ رہنے کا جواز مل گیا ہے۔

"جو لوگ موت کے اس راستے میں ساتھ دینے کو تیار ہیں وہ جس جگہ بھی کھڑے ہیں ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیں اور اقرار کریں کہ اے اللہ میں اپنی زندگی اور موت تیرے دین کے نفاذ کے لئے آج سے ابھی سے وقف کرتا ہوں"

ہارون رشید کہتا ہے کہ اس نے تیس برسوں میں ایسا جلسہ نہیں دیکھا' ایسے لوگ نہیں دیکھے' ایسا رہنما نہیں دیکھا' ایسی آواز نہیں سنی محسن رضا کہتا ہے کہ اسنے ایسا جادو نہیں دیکھا' ایسی تقریر نہیں سنی ایسی تاثیر نہیں دیکھی' بی بی سی کا شاہد ملک اپنے شب نامہ میں جلسہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے مولانا محمد اکرم اعوان کے ہاتھ پر ہزاروں لوگوں نے موتکی بیعت کی مولانا کا تیار کردہ جانبازوں کا دستہ چے گویرا کی طرح کی ٹوپی پہنے اور داڑھی رکھنے والے نوجوانوں پر مشتمل ہے جلسہ میں اکثریت ایسے نوجوانوں کی تھی جنھوں نے سروں پر مہر نبوت کے نکس والے جھنڈے کا کفن باندھ رکھا تھا لیجئے جناب! جواب حاضر ہے کہ اس ملک میں شریعت کون نافذ کرے گا اور کن لوگوں پر نافذ ہو گی اسلام امن سکون اور عدل پر مبنی معاشرے کی ضمانت دیتا ہے اور تنظیم الاخوان کے جلسہ میں موجود افراد نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام ہی پاکستان کا مقدر ہے اور یہ کہ شریعت نافذ کرنے والے مریخ سے نہیں آئیں گے

وہ نہیں کہیں ہیں۔

آخر میں مَیں ان شک پرستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ "ذہانت" اور قلم کی کمائی کھانے کے بجائے تنظیم الاخوان کے امیر سے رابطہ کریں اور اگر میرے آج کے اس کالم میں کوئی سوال ادھورا رہ گیا ہے تو ان سے جواب لے لیں امیر محمد اکرم اعوان سے ملاقات کے لئے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں البتہ جواب سننے کا حوصلہ شرط ہے۔

شفا کی پڑیا!

نوائے وقت 30 جولائی 1999ء

بشریٰ اعجاز

نیازی پٹھانوں کی اصل اور خالص خو بو رکھنے کے باوجود ڈاکٹر اجمل نیازی میں دعا کا سلیقہ اور ادب کا طریقہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اکثر اہل ادب کی محفلیں بڑے طریقے اور سلیقے سے سجایا کرتے ہیں اور ان میں اپنی اچھی باتوں سے رنگ بھر دیا کرتے ہیں۔ بہت دن ہوئے انہوں نے اہل اللہ کے لیے ایک محفل سجائی اور اس میں شہر کے نامور ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کو مدعو کیا۔ شیزان میں اس روز خوب رونق تھی۔ اہل ادب جمع تھے ہال میں سکوت طاری تھا۔ سامنے کرسی پر اجمل نیازی سر جھکائے محبت میں لت پت بیٹھا تھا۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر وہ شخصیت تشریف فرما تھی ،جس کی خاطر وہ بزم سجائی گئی تھی۔ مولانا محمد اکرم اعوان اپنی نرم مسکراہٹ اور وستانہ انداز میں اہل اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ محبت کی وہ منزل جس کے ایک کنارے پر

رب رہتا ہے، جس کے دوسرے کنارے پر رب کے رسول کا قیام ہے۔

جس کا سلسلہ دل کی گزر گاہ سے ہو کر نکلتا ہے۔ دل کی گزر گاہ جہاں ھو کے نور کی فراوانی ہے اس نور کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے بے دریغ لٹانے والی شخصیت رب کے ساتھ بندے کے تعلق کو بڑے سادہ انداز میں بیان کر رہی تھی۔ فنافی الشیخ فنافی الرسولؐ اور فنافی اللہ، ان تینوں درجات کا ذکر وہ عالمانہ اور ناصحانہ نہیں، بلکہ خالص دوستانہ انداز میں کر رہے تھے۔ مگر سرما کی اس خنک شام شیزان کی شیشے کی دیوار کے پرلی طرف جو دنیا تھی، اس میں آوازیں تھیں، ہنگامہ تھا، آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی بے حجاب روشنی تھی، جس میں نظر کو کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ حاضرین محفل میں سے کچھ بغور سن رہے تھے۔ کچھ دیکھ رہے تھے اور کچھ بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے عہد حاضر کے اس بے مثل صوفی کی باتیں، ہم جیسوں کے تو سر سے گزر ہی رہی تھیں، مگر میں نے دیکھا اہل دانش بھی ذہنی طور پر کچھ غیر حاضر سے تھے۔ مگر وہ تھے کہ اپنی دھن میں کہے جا رہے تھے۔ ان کے خطاب کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا جو خاصی دیر چلتا رہا۔ اسی دوران اشفاق صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا، حضرت، جو آپ نے فرمایا وہ بجا، اس سے انکار کی مجال نہیں، مگر عرض یہ ہے، ہمیں اور کچھ نہیں شفا کی وہ پڑیا چاہئے جو ہمارے اندر کی حالت کو بدل دے۔ یہ سن کر صوفی کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک جاگی۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب روشن سی کیفیت کا رنگ پھیل گیا۔ انہوں نے دھیمی مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں جو بار بار بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی ایک دم سے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ حکایتوں اور قصوں میں وہ جو مرد کامل کی اک نگاہ سے دل کی دنیا بدل جانے کا ذکر ہے پل میں چور کو قطب بنانے کا تذکرہ ہے، کچھ ایسا ہی جادو ہونے والا تھا۔ میں دم خود تھی، حاضرین محفل پر سکوت طاری تھا۔ مگر جب صوفی نے تصوف کی پٹاری سے شفا کی پڑیا نکالی تو میں نے دیکھا تعویز گنڈوں، ٹونے ٹوٹکوں اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے

لیے ہر قسم کے شارٹ کٹ کے عادی مجھ جیسوں کے منہ لٹک گئے۔ یہ کیا تزکیے کے لیے اتنی مشقت اتنا مجاہدہ تنہا بیٹھ کر اللہ ہو کا ذکر، یعنی سانس کی اندر باہر مار اماری۔ بھلا نئی زمانہ اتنا وقت کس کے پاس ہے، جو اس مشقت سے گزرتا پھرے۔ ڈسپوزیبل رشتوں اور چیزوں کے دور میں، گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بھاگتے انسان کو اتنی فرصت کہاں۔ سب کی خاموش رائے سے میں بھی متفق تھی۔ انہوں نے اللہ ہو کے ذکر کی مشق کرائی۔ تو بظاہر سبھی آنکھیں بند کر کے پاس انفاس میں مصروف تھے۔ مگر در حقیقت کوئی کہاں تھا۔ یہ اللہ جانتا تھا۔ شام ڈھلے جب میں شیزان سے نکلی تو خاصی مایوس تھی۔ بقول اشفاق صاحب ہمیں تو شفا کی ایسی پڑیا چاہئے جو پل میں تزکیہ نفس کر دے۔ جو ہمارے جھوٹ، منافقت، ریاکاری، بے عملی اور بے دلیلی کے گندے برتن کو پل میں چمکا دے۔ ہمیں دھو دے۔ بس جس میں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے۔ ہم حرکت کے بغیر شکم کو سیر نہیں کر سکتے۔ تگ و دو کے بغیر رزق نہیں کما سکتے۔ کوشش کے بغیر عمل کی راہ پر اک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تو کیا قرب الٰہی ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جائے گا۔ "دنیا میں افرادی طاقت کے لحاظ سے مسلمان پہلے نمبر پر ہیں۔ دنیا کی چھ ارب آبادی میں مسلمانوں کی تعداد دو ارب ہے۔ باقی چار ارب ایک سو بائیس اقوام ہیں۔ مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ حج کے لئے ہر سال اتنی درخواستیں وصول ہوتی ہیں کہ قرعہ اندازی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تو پھر کیا بات ہے۔ مسلمان ترقی میں اقوام عالم سے کیوں اتنا پیچھے ہیں مجھے تو اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ ہے ذکر الٰہی کی کمی، میں سمجھتا ہوں اگر ہم ذکر کو زندگی کا حصہ بنالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دین و دنیا میں ترقی نہ کر سکیں۔ منزل مراد تک نہ پہنچ سکیں۔" صوفی اپنے مخصوص سادہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ میں دم بخود بیٹھی سلطان العارفین کی ہو کی پکار اپنے چاروں طرف سن رہی تھی۔ ذریعہ ملاقات اب بھی ڈاکٹر اجمل نیازی ہی تھے۔ گو درمیان میں کئی سال گزر چکے تھے۔ اپنے استفسارات، کے ساتھ چیدہ چیدہ

اہل ادب بھی موجود تھے۔ شاعری بھی چل رہی تھی، سوالات بھی جاری تھے۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ اللہ کا وہ بے مثل بندہ اپنے مشن میں روز اول کی طرح پر جوش تھا۔ ہم اپنی بے عملی میں حسب سابق سرگرم تھے۔ ماحول میں وہی عقل والوں کی ٹھنڈی جامد خاموشی تھی۔ مگر سینے کے اندر دل کے مقام پر اللہ ہو کا تیز نشتر چبھ رہا تھا۔ دل گھائل ہو چکا تھا۔ قرآن میں رب کہہ رہا تھا۔ 'اپنے پروردگار کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ' میں جب مرد کامل کے پاس پہنچی تو اندر سے گھائل تھی۔ چور چور تھی مجھے شفا کی اس پڑیا کی سخت ضرورت تھی، جو مرد کامل کی اک نگاہ کا جوہر ہے۔ درد دل تو مالک کی دین ہے۔ جسکو جتنا چاہے عطا کرے۔ ہم تو اس کی توفیق سے بانٹنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ جس کی جتنی استعداد ہے آئے اور لے جائے ۔ محبت میں کوئی کسی کا شریک نہیں، یہ ایک ایسی بے آب و گیاہ تنہائی ہے۔ جس کا نوحہ خود رب کریم نے لکھا ہے۔ جاؤ اس تنہائی کو گلے لگالو، جو کئی محفلوں سے زیادہ آباد اور پر رونق ہے۔ پاس انفاس کی مشق، اللہ ہو کا ورد، تہجد اور مغرب کے وقت میں اہل برزخ سے ملاقاتیں۔ روح کا سپردگی کی لذت سے چور چور ہونے کا تجربہ تصوف ہے! مومن کے قلب میں غیر اللہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مگر افسوس وہاں ازل سے غیروں کا ڈیرا ہے وہ رب جو اس بسیط کائنات کا واحد سچ اور ہمیشہ زندہ رہنے والی حقیقت ہے، اس کا قرب آسان نہیں۔ وہ کئی حجابوں میں مستور ہے۔ اک خاص حد سے آگے فرشتوں کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ جبریل امین کو بھی اک مقام سے آگے جانے پر اپنے پروں کے جلنے کا اندیشہ تھا۔ مگر محترم شیخ کہتے ہیں۔ اس کا قرب بہت آسان ہے۔ اللہ ہو کے ذکر کو اس سے رابطے کی کڑی بنالو تعلق نا صرف بندھ جائے گا بلکہ اتنا مستحکم ہو جائے گا کہ ملائکہ رشک کریں گے۔ میں کہتی ہوں، وہ شفا کی پڑیا جس کا تذکروں میں ذکر ہے وہ تو ازل سے ہمارے اندر موجود ہے۔ بس اک مرد کامل سے رابطے کی ضرورت ہے۔

بابِ تمثال

کرنیں

ارشادات شیخ المکرم

☆ "خلوص کے ساتھ اللہ کی اطاعت میں کام کیا جائے تو تھکاوٹ نہیں ہوتی' عبادت کا بوجھ اگر محسوس کرتے ہیں تو یہ دلیل ہے کہ اطاعت سے تجاوز ہو رہا ہے اور خلوص نہیں رہا۔"

☆ "سب کمزوریاں انسان کے اپنے اندر ہوتی ہیں ورنہ باہر سے کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

☆ "خط پڑھنے سے بھی توجہ اور بات ہو جاتی ہے۔"

☆ "مشاہدات اللہ کی نعمت ضرور ہیں مگر عملی کام بہت ضروری ہے۔"

☆ "جب مالی کسی باغ کو سنوارنا چاہتا ہے تو خوب تراشتا ہے اور ننھی ننھی کونپلیں رہ جاتی ہیں' بڑی بڑی شاخیں کٹ کٹ کر گرتی ہیں۔"

☆ "بے دینوں کے ہاتھوں دین کا نفاذ کبھی نہیں ہوا نہ ہوگا۔"

☆ "قرآن حکیم ہدایت کی نیت سے پڑھا جائے تو اللہ اپنی طرف آنے کے کئی راستے کھول دیتا ہے۔"

☆ "غیر ذمہ داری اور بددیانتی ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیتی۔"

☆ "جب انسانوں میں اللہ سے تعلق اور اپنی پہچان پیدا ہوتی ہے تو وہ کفر پر شدید اور آپس میں مہربان ہو جاتے ہیں۔"

☆ "شکر سے عاجز ہو جانا شکر ہے۔ اللہ کا شکر یہ ہے کہ بندے کو یہ احساس ہو جائے کہ جتنے انعامات اللہ کے ہیں اس کا میں شکر ادا نہیں کر سکتا۔"

☆ "اس سے بڑا بدنصیب کوئی نہ ہوگا جو سجدے کر کے تکبر میں مبتلا ہو جائے۔"

☆ "عبادت کا حاصل یہ ہے کہ بندے کو اپنی ذات کا شعور ہو جائے۔"

☆ "کوئی بھی شے زہر نہیں مگر اسی کی مقدار میں جب فرق آتا ہے وہی زہر بن جاتی ہے کسی بھی چیز کی زیادتی حد سے بڑھنا' اعتدال سے آگے جانا سم قاتل بن جاتا ہے۔"

☆ "عبادت کا مفہوم نبیؐ نے یہ بتا دیا کہ جو توفیق عبادت ہوتی ہے اس کا شکر ادا کرنا ہی عبادت کا مفہوم ہے کوئی ذکر کرتا ہے تو جو توفیق ذکر عطا ہوتی ہے اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ کوئی نماز پڑھتا ہے تو جو توفیق سجدہ عطا ہوتی ہے اس کا شکر ادا کرتا ہے۔"

☆ "عبادات کا اذکار کا مفہوم یہ ہے کہ شکر ادا کرنے کا سلیقہ آ جائے۔"

☆ "عبادات اپنی تلاش ہے۔ اپنا وجود مل جائے تو پھر اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اور اس کی ذات اللہ کی مخلوق کے فائدے کا سبب بن جائے۔"

☆ "اصل اور حقیقی زندگی یہ ہے کہ اللہ کی زمین پہ پھر عظمت الٰہی کو قائم کرے۔"

☆ "انسانیت کا کمال اسلام ہے اور بہترین انسان مسلمان ہے۔"

☆ "مسلمان کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ

"وہ انسان جو زمین پر بستا ہے اور اس کا رشتہ عرش عظیم پر ہو وہ انسان جو غذا مادی کھاتا ہو اور اس کا دل نور الٰہی کی جلوہ گاہ ہو۔ وہ انسان جو کام دنیا میں کرتا ہو اور اسکے نتائج جو قیامت کو سامنے آئیں گے ان کو نظر میں رکھتا ہو ایسے بے مثل انسان کو محمد الرسول اللہ کہتے ہیں۔"

☆ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم ترین معجزہ یہ ہے کہ آپؐ نے دوزخ کی منڈیروں پر گھومتے لوگوں کو اچک لیا اور ان کے نفرتوں سے بھرے دل جو ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ باپ بیٹے کا' بھائی بھائی کا' رعیت حکومت کا۔ حاکم رعیت کا' مالک مزدور کا' ہر ایک دوسرے کا دشمن تھا۔ نفرتیں مٹا کر محبتوں کے دریا بہا دیئے یہ کہ تم سارے ماں جائے بھائیوں کی طرح ہو گئے۔"

☆ "مسلمانوں نے حیثیت قوم بہانہ اپنا رکھا ہے کہ اپنی کوتاہیوں کو اللہ کی مرضی کے نام کا خوبصورت غلاف پہنا دیتے ہیں اگر چہ یہ حق ہے کہ اسکی مرضی کے بغیر ذرہ تک حرکت نہیں کرتا مگر انسان اپنی پوری کوشش' پورے خلوص سے کرنے کا مکلف اور ذمہ دار ہے پھر کام نہ ہو سکے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے پوری ہمت کی مگر اللہ کو منظور نہ تھا مگر سستی کر کے اس پر پردہ ڈالنا مناسب نہیں۔"

☆ "دل کا تزکیہ ہو جائے تو آدمی کے لئے نہ صرف دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے بلکہ وہ دنیا میں بھی اور امور دنیا میں بھی کامیاب رہتا ہے۔"

☆ "تصوف کا دعویٰ بہت سے لوگوں نے آسانی سے کر لیا ہو گا مگر اس کا علاج یہ

نہیں کہ اسے چھوڑ دیا جائے اگر ایسا کیا جائے تو جھوٹوں کو تو خالی میدان ہاتھ آجائے گا جیسے خدائی کے جھوٹے مدعی کا جواب اللہ کی عظمت کے بیان سے اور جھوٹے مدعی نبوت کو حقیقی نبی کے کمالات بیان کر کے لاجواب کیا جاسکتا ہے اسکے مدعیان کا علاج بھی یہی ہے کہ اس شے کی اصل صورت کو عام کیا جائے تاکہ لوگوں کو کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کا موقع ہاتھ آئے۔"

☆ "ضرورت ہے کہ آج پھر اس نور قلب کو تلاش کیا جائے جس کے باعث مسلمانوں کو نہ صرف معرفت باری نصیب ہوئی تھی بلکہ معاملات دنیا میں بھی انہیں کمال حاصل ہو گیا تھا۔"

☆ "کسی مسلمان ملک میں اب امن و سکون نظر نہیں آتا تو اس سب خرابی کے ذمہ دار ہم ہیں جو اسلام پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ اسلام اس کا ذمہ دار نہیں وہ ان سب خرافات سے روکتا ہے اب اگر لوگ صحیح نہیں کر رہے تو آپ خود تو درست عمل کر کے ثابت کریں کہ اسلام قابل عمل اور انسانیت کا مذہب ہے اور یہ اللہ کا دین ہے۔ اگر اکیلا فرد بھی اس پر عمل کرے گا تو یقیناً فلاح پائے گا۔"

☆ "کسی چیز کی کمی نے مسلمان کو اتنا گرادیا کہ وہ بے بس و مجبور کٹھ پتلی اقوام عالم کی گھرکیاں سہہ رہا ہے اگر ہم اس نقطہ پر غور کریں تو بات ایک ہی سامنے آتی ہے کہ جب ان سارے کمالات کا سبب کمال یقین ہے اور کمال ایمان باللہ ہے تو اسی میں کمی ہے یا ہم سرے سے اسے کھو چکے ہیں کہ اس درجہ رسوا ہو رہے ہیں۔"

☆ "ہم جیسے بھی ہیں مسلمان ضرور ہیں تو پھر کمی کیا ہے۔ میرے خیال میں ایمان تو ہے کمال ایمان نصیب نہیں یقین تو ہے مگر وہ غیر متزلزل اور کامل نہیں اس

لئے کہ یقین کامل اور مضبوط ایمان کے لئے علم کی ضرورت ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ذاتی طور پر اللہ کی ذات اور صفات کے بارے میں جانتے ہوں اس کی رضامندی و ناراضگی کے اسباب پر نظر ہو اسکی عظمت نگاہوں میں پھرتی ہو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ صرف رشتہ ایمان نصیب ہو بلکہ عشق کی حد تک اور جنوں کی حد تک محبت ہو اسکی کتاب کو سمجھتے ہوں اسے بار بار پڑھتے ہوں اور یوں اس ذات بے ہمتا سے شرف ہم کلامی نصیب ہو تو یقین کامل حاصل ہو اور پھر اس کی رضا کی خاطر تعمیل ارشاد کی فکر بھی ہو نیز جب اس سے پیار ہو تو لامحالہ اسکی مخلوق سے شفقت بھی نصیب ہو اور یوں ہم سب کی بہتری اور فلاح کی فکر کریں۔"

☆ "مسلمانوں کو یقیناً یہ احساس نصیب ہوگا کہ ہم سب کی کوتاہیاں اور دین سے بے خبری ہمارے دینی اور قومی زوال کا سبب بن رہی ہے۔"

☆ "اسلام محض روایات کا مذہب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بھی آسمانی مذہب محض روایات تک محدود تھا۔ چونکہ روایات اور بات ذہن و عقل تک رسائی رکھتی ہے مگر آسمانی مذاہب کے ساتھ کیفیات بھی تھیں جیسے ہر کلام کرنے والے کی ذات کا ایک اثر اس کے کلام میں ہوتا ہے ویسے ہی ذات باری کی تجلیات اسکے ذاتی کلام کا خاصہ ہوتی ہیں اور یہی نور سب آسمانی مذاہب کی جان تھا۔"

☆ "قلب رسول اللہ ﷺ سے ایک خاص نور قلب مومن میں منعکس ہو کر اسے مقام صحابیت پر فائز کر دیتا تھا۔ خاص طور پر یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ نور انہیں صرف اللہ سے محبت ہی نہیں دیتا بلکہ معاملات و تجارت سیاست اور جہاد جو بھی ہو ان میں دوسروں سے بہت بلند اور اعلیٰ شعور اور قوت کار بخشتا تھا، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ نے ہر پہلو سے دنیا کی قیادت حاصل کر لی فتوحات بے

مثال کردار بے داغ اور سیاسی حکومتی نظام بے نظیر ٹھہرا۔"

☆ "کاملین کی توجہ سے عملی زندگی یقیناً بدل جاتی ہے۔"

☆ "جب توجہ نصیب ہوتی ہے تو دل ذاکر ہو کر عملی زندگی میں بھرپور انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ سب لوگ بایزید بسطامیؒ تو نہیں بن جاتے مگر نیکی میں رغبت اور برائی سے نفرت ہر ایک کو نصیب ہوتی ہے۔

☆ "اللہ کی رضا مندی کے لئے شیخ سے راہنمائی لے کر خلوص سے عمل کی کوشش کرنا مریدی ہے۔"

☆ "آیئے ہم اسلام کو اپنا ذاتی مسئلہ جاننا شروع کریں اسکی اہمیت کا احساس کریں اور دینی علم خود بھی حاصل کریں اور اپنی اولاد کو بھی دین کا علم سکھانے کا اہتمام کریں تاکہ ہمارے ڈاکٹر، انجینئر اور سیاستدان دین کے خادم اور بہترین مسلمان اور بہترین انسان بھی بن سکیں۔"

☆ "لطائف منور ہوتے ہیں تو نیکی کی نہ صرف رغبت دلاتے ہیں بلکہ اسکا فلسفہ بھی پلے پڑتا ہے اور برائی کی بھدی صورت بھی سامنے آجاتی ہے اور دینی علم میں بھی لذت انہی سے نصیب ہوتی ہے ورنہ علم محض فلسفہ لگتا ہے اور عمل نرا بوجھ۔"

☆ "جسے نور ایمان نصیب ہوا اور ایک ملاقات آپ ﷺ کی ذات گرامی سے ہوئی وہ بالکل دوسرا آدمی ہو گیا۔ رنگ، قد اور نقش تو وہی رہے مگر اندر سے انسان بدل گیا ہو اور پورا نوے درجے بدل گیا یعنی ڈاکو تھا اگر تو غریب پرور اور سخی بن گیا۔"

بابِ مراسلت

شاہدرہ لاہور

جناب مولانا محمد اکرم اعوان صاحب

جناب عالی!

میں شاہدرہ لاہور میں رہتا ہوں اور تنظیم الاخوان کا ادنی سارکن ہوں۔ میں بلدیہ لاہور میں بطور ٹیکس کلیکٹر کا کام سرانجام دے رہا ہوں۔

کچھ ذاتی مسائل ہیں آپ سے حل کروانا چاہتا ہوں بندہ آپ کا ممنون ہوگا۔

جناب تقریباً چار سال پہلے میں سیکٹر 1 کے نمائندہ جناب شہباز بیگ اور ملک عمران اعوان کے ساتھ اویسیہ سوسائٹی مسجد میں آپ کا خطاب سننے گیا۔

جناب میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ کسی نے بھی مجھے اسکے بارے میں تفصیل سے نہ بتایا جناب واقعہ کچھ یوں تھا۔

کہ آپ تبلیغ کر رہے تھے وہاں بیٹھا ہوا ہر فرد میری طرح آپ کی باتوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میں نے آپ کی طرف دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ حضور اکرم ﷺ ممبر پر خطاب فرما رہے ہیں تو میں پہلے تو میں سمجھا کہ شائد کوئی دماغ کا حصہ سو گیا ہو اور سوتے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہو گیا ہو۔ لیکن میں نے اپنے دماغ کو جھٹکا لگایا دوسرے لوگوں کی طرف دیکھا جو سر جھکائے آپ کی تقریر سن رہے تھے پھر میں نے مسجد کے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد پھر آپ کی طرف دیکھا تو پھر وہی سین میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اور میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور آپ کی تقریر سنتا رہا بعد میں دوستوں سے پوچھا مگر کسی نے میرے دل کی تسلی نہ کی۔

جناب نہ تو میں نے حضور اکرم کو کبھی دیکھا ہے اور نہ ہی پہچان ہے تو یہ کیا واقعہ

رونما ہوا ہے۔

جناب مجھے بتایا جائے کہ کیا واقعی آپ کی جگہ پیغمبر بیٹھے ہوئے خطاب کر رہے تھے اور اگر نہیں تو مجھے کیسے محسوس ہوا۔ کیوں کہ آنکھیں بھی کھلی تھیں میں سویا بھی نہیں تھا تو یہ اچانک کیوں اور کیسے ہو گیا۔

جناب عالی والد صاحب عرصہ ۲۵ یا ۳۰ سال سے نوائے وقت کا مطالعہ کر رہے ہیں وہ آپ کی یعنی ہماری تنظیم سے خوف کھاتے ہیں اور مجھ پر پابندی لگاتے ہیں خیر میں ان کی بات مانے بغیر کام کر رہا ہوں جناب مجھے اس کا حل چاہئے کیوں کہ میں اللہ تعالیٰ کا کام کرنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں۔ لیکن سختی کی وجہ سے اکثر گھر والوں سے لڑنا پڑتا ہے۔ اور کرنل صاحب کی ایک بات جو یہ ہے کہ کرنل صاحب نے بتایا کہ اگر آپ کسی مسئلے میں پھنسیں گے تو ہم آپ کے پیچھے نہیں آئیں گے۔ والد صاحب طعنے مارتے ہیں کہ جس تنظیم کے لئے تم کام کر رہے ہو وہ تمہارے پیچھے بھی نہیں آئے گی اگر پکڑے گئے۔

جناب میں نفاذ اسلام کے لئے کام کرتا ہے۔ ایک بات بتاتا چلوں کہ میں اکلوتا بیٹا ہوں ایک بیوہ بہن ہے جس کے بچے ہیں اور والدین جن کی خدمت کر رہا ہوں۔ جناب کچھ مسائل تنظیمی لحاظ سے ہیں جو میں بعد میں بتاؤں گا۔

آپ کا غلام

نو بہار بٹ جانباز

وانڈالہ روڈ محلہ رسول نگر شاہدرہ لاہور

فون نمبر ۹۲۰۸۵۹ ے

عزیزم مولانا اکرم صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اس دفعہ کے رسالے میں سوال جواب میں کسی نے لکھا ہے کہ ہم آپ کو ذکر کراتے دیکھتے ہیں آپ نے جواب دیا ہے کہ یہ فیض کی تقسیم ہے اب تو عرصہ کی بات ہے میں نے بھی دیکھا کہ بڑے حضرت جیؒ آئے اور ذکر کرایا۔ دو دفعہ انہوں نے خود کرایا ایک دفعہ اپنے ہمراہ وہ آپ کو لائے اور ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صدیقؓ بھی آئے اور انہوں نے ذکر کرایا۔ اسکے علاوہ دو مرتبہ ذکر میں جب میں اقربیت پر پہنچا تو بڑے حضرت جیؒ مجھے وہاں سے لے کر چلے دریا رحمت میں غوطہ دیا مسجد نور سے ہوتے ہوئے حضورؐ کی محفل میں صحابہ سے پیچھے لے جا کر بٹھا دیا۔ ان تمام اذکار کرانے والے کرنل محبوب تھے۔ ویسے تو بہت عرصہ پہلے بالکل شروع ہی میں حضرت جیؒ نے اپنا دیدار بھی کرایا۔ میں عصر پڑھنے مسجد جا رہا تھا تو ایک بزرگ کو سیڑھیوں سے اترتے دیکھا۔ پہچان بھی گیا اور عرصہ بعد حضرتؒ کا فوٹو کرنل مطلوب کے پاس دیکھا۔ لیکن آج تک حضرت جیؒ ہم کلام نہیں ہوئے دو دفعہ ان کی قبر پر بھی حاضر ہوا۔ لنگر مخدوم بھی کئی دفعہ گیا لیکن وہاں نہ ہی کوئی گفتگو ہوئی اور نہ ہی مشاہدہ۔ حضرت امام بخاریؒ کے مزار پر بھی حاضری دی ان سے ہم کلامی نہ ہو سکی۔ لیکن خواجہ نقشبند کے مزار پر انوارات کی شدید بارش بھی دیکھی اور ہم کلامی بھی ہوئی۔ خواجہ احرارؒ نے تو کرم کی حد کر دی۔ اپنے پنڈال میں بلایا نہایت عمدہ لبادہ عطا کیا اور اس پر زرق کلا رکھ کر مسکرائے اور کہا اب جاؤ۔ ویسے ذکر میں کعبہ اور مسجد نبوی کی پرانی شکل بھی دیکھی۔ ایک دفعہ تو بیعت رضوان دیکھی اور پھر حضورؐ کے

ہاتھ خود بیعت کرتے دیکھا۔ ایک دفعہ نماز فجر کے بعد مثل رہا تھا سامنے جیسے کسی نے کوئی کھڑکی کھلوا دی پرانی مسجد نبوی اس میں حضورؐ جماعت کرا رہے ہیں صحابہ کی صف اور آخر صف میں خود کو بھی دیکھا۔ منارہ میں آپ کے ذکر میں مسجد نور اور دریا رحمت بھی دیکھا۔ ایک ایسا درخت نور باری تعالیٰ کا دیکھا جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان میں تھیں۔

لیکن کبھی کوئی چیز میری مرضی سے نہیں ہوئی۔ خود بہ خود یہ نظارے دیکھے یہ بھی جانتا ہوں اس میں نہ تو میرا کوئی کمال ہے نہ بڑائی۔ بچپن سے بزرگ کی صحبت تھی مرنے گئے تو اللہ کی طرف سے اشارہ حیدر آباد جانے کا ہوا وہاں بزرگ نے مجھے مجدد الف ثانیؒ کی طرف کرنے کی کوشش کی انہوں نے موجودہ شیخ زمانہ حضرت اللہ یار کی طرف کر دیا۔ اور شروع بیعت سے ہی بڑے حضرتؒ کی توجہ اور منارہ میں پہلی ہی دفعہ سے انوارات و مشاہدات نصیب ہوئے۔ ہمارے گھرانوں میں کب سے پیری مریدی کا سلسلہ ختم ہوا اور میں بھی اس میں یقین نہیں رکھتا تھا اور وہ تو یونہی کرنل محبوب کی دوستی میں لنگر مخدوم ۱۹۸۷ء میں پہنچ گیا۔ لیکن وہاں جو کچھ دیکھا وہ ڈرامہ نہیں تھا۔ اصل اور نقل کے فرق کی توفیق باری تعالیٰ نے دل کو دے رکھی تھی۔ دل نے پہچان لیا کہ یہ اصل ہے اور یوں بیعت ہوئی۔ اب زمانے کے تغیر کو دیکھ کر دل یہ گواہی دے رہا ہے کہ سندھ کے ہاری اب آزاد ہونے والے ہیں۔ ظلم کی رات اب اختتام کو ہے۔ باری تعالیٰ موسیٰ کی قوم کی طرح ان پر بھی اپنی رحمت نازل کرنے والا ہے۔ یہ قوم اور اسکا وقت لنگر مخدوم کی طرف جھکنے والا ہے۔ یہ کیسے ہوگا مجھے معلوم نہیں لیکن میں نے ۱۹۹۰ء اپنی آنکھوں سے حضورؐ اور ابو بکر صدیقؓ کو کعبہ میں دعا مانگتے دیکھا ہے اس وقت تو میں یہ سمجھا تھا کہ بے نظیر کے جانے کی دعا ہے لیکن نہیں یہ تو اس عجیب زمانے کے جانے کی دعا تھی۔ اب وقت بدلنے ہی والا

ہے خدا خیر کرے نیکی کی طرف بدلے۔ خدا کا عذاب بھی آسمان سے اترتے دیکھا ہے لیکن ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔ گڑبڑ تو ہو گی کچھ مریں گے بھی، لیکن زیادہ نہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

دل کی نظر تو یہ کہتی ہے کہ اب یہ ایسے ہی ہو گا اور یہی بے سرو سامان جماعت ہی نے کرنا ہے لیکن اگر یہ کام جلد ہونا ہے تو دنیوی اسباب کو نمودار ہونے چاہئے نہ ہی طاقت ہے نہ ہی دولت 'نہ ہی اثر و رسوخ شیخ کی بھی گرتی ہوئی خراب صحت۔ جن کو اللہ نے درد دل دیا ان کو وصال سے بہرہ مند نہ کیا اور جن کو وصال دیا ان کو یقین و ایمان کی دولت عطا نہیں کی۔ اب اللہ تعالیٰ اپنی شان و کرم سے یہ چیزیں کیسے یک جا کرتا ہے اور کس حسن سے یہ کام ہو جانے والا ہے یہ بات تو اپنی مثال آپ ہو گی اور جب بھی ہو گی کن فیکون کی ہی مثال ہو گی۔ ہم لوگ تو زیادہ سے زیادہ اپنی بات لوگوں تک حسب توفیق پہنچا ہی سکتے ہیں۔ یقین و ایمان کی ڈوری میں قوم کو پرونا تو اللہ کا ہی کام ہے۔ دلوں کی دنیا تو لمحوں میں بدل جاتی ہے۔ توفیق بھی باری تعالیٰ کا انعام ہے جس بات کی حسرت لیے میری اپنی کئی نسلیں دنیا سے بیت گئیں کہ شاید اسلام کا دور دورہ دیکھیں، وہ شاید میری نسل یا میرے بعد آنے والے دیکھیں۔ بنی اسرائیل نے بھی تو اللہ کی رحمت کا انتظار اور موسیٰ کی آمد کا کئی نسل انتظار کیا۔ باران رحمت کا انتظار تو بعض اوقات کئی نسل پر محیط ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ہماری قوم کو صلہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

آپ کا مرید

جلال احمد خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

واجب الاحترام شیخ المکرم!

آداب عرض۔ اسلام علیکم۔

کافی دنوں سے کوشش تھی کہ جناب کو عریضہ لکھوں لیکن دل میں یہ آتی ہے کہ ان کا قیمتی وقت میرے خط کی وجہ سے ضائع نہ ہو جائے۔ جناب کے حکم کے مطابق۔ اعتکاف کے لیے منارہ نہیں آسکتا۔ یہاں الحمد للہ گزشتہ سال بھی 40 کے قریب آدمی معتکف تھے۔ چند ساتھی جناب خدمت میں اعتکاف کے لیے حاضر ہیں ان میں سے ایک آدمی جن کو یہ عریضہ دے رہا ہوں۔ ان کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام حاجی عبد الغنی ہے اور انہوں نے کافی حج کیے۔ پیری مریدی کا سلسلہ بھی شروع کیا ہوا ہے۔ ایک دن ایک ساتھی نے مجھے کہا کہ حاجی صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جب میں گیا تو وہاں کافی احباب موجود تھے حاجی صاحب کہنے لگے کہ ہم ذکر کرنے والے ہیں اور یہ ذکر آپ کا ہے میں نے کہا حاجی صاحب ذکر تو اللہ رب العزت کا ہے۔ کہنے لگے ہم نقشبندیہ قادریہ سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کی نسبت بھی نقشبندیہ ہے تو آپ ہمارے ساتھ ذکر کریں گے؟ میں نے عرض کی جی ضرور۔ انہوں نے زبان سے ہر سانس پہ بلند آواز سے ذکر شروع کیا میں نے سانس پر شروع کر دیا۔ دوسرے دن حاجی صاحب کہنے لگے کہ میں آپ کی مسجد میں ذکر کے لیے آجایا کروں۔ میں نے عرض کی حاجی صاحب یہ بھی بات پوچھنے والی ہے۔ حاجی صاحب چند دن ذکر کے لیے آئے اور لنگر مخدوم کا اجتماع آگیا۔ میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ میرے محبوب شیخ المکرم لنگر مخدوم آرہے ہیں۔ اور میں ساتھیوں کے ساتھ لنگر مخدوم جارہا ہوں۔ حاجی صاحب کہنے لگے گاڑی میں جگہ ہے تو مجھے بھی

ساتھ لے چلیں میں نے کہا آپ ایسا کریں گاڑی میں بیٹھ جائیں اور میں چونکہ علاقہ کو جانتا ہوں میں بس پر آجاؤں گا۔

لنگر مخدوم پہنچے حاجی صاحب جناب کی صحبت میں بیٹھے اللہ رب العزت نے کایا پلٹ دی۔ واپسی پر گھر آکر میں نے حاجی صاحب سے پوچھا کیسا رہا پروگرام کہنے لگے مجھے افسوس ہے کہ میں نے سینکڑوں انسانوں کو گمراہ کیا۔ آپ کے شیخ کی توجہ نے میری کایا پلٹ دی۔ حاجی صاحب ذکر کے لیے آتے لوگ مجھے کہتے کہ آپ اس آدمی کو ذکر کی دعوت دیتے ہیں جس کے قدموں میں لوگ گر پڑتے ہیں اور شرک کرتے ہیں۔ میں نے کہا بھئی بات یہ ہے کہ میرے پیرومرشد اگر کافر کو اللہ رب العزت کا ذکر سکھاتے ہیں۔ میں ایک مسلمان کو اسکے اپنے رب کا نام لینے سے کیسے روک سکتا ہوں۔ حاجی صاحب کے مریدین آتے ہیں اور یہ ان کو ذکر کے لیے مسجد میں لے آتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے بعض شہروں میں ذکر قلبی شروع کرایا ہوا ہے۔ منارہ چالیس روز لگانے کا پروگرام ہے حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میرا مقصد اب پیری مریدی نہیں بلکہ ان لوگوں کو جن کو میں نے گمراہ کیا ایک کامل ہستی کے سامنے پیش کرنا ہے تاکہ میں اس آخرت کی شرمندگی سے بچ سکوں۔

حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت مولانا اکرم صاحب سے دلی محبت اور عقیدت ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میری زندگی کا زیادہ وقت حضرت شیخ المکرم کی صحبت میں گزرے۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میری خواہش یہ ہے کہ میں اپنے تمام ساتھیوں کو دس دس بارہ بارہ کر کے حضرت شیخ المکرم کی خدمت میں پیش کرتا رہوں۔ حاجی صاحب باقاعدگی سے ذکر کرتے ہیں۔ دن کے دس بجے قاری شبیر احمد صاحب اور مولانا عبدالحق صاحب کے بیٹے ذکر کرانے جاتے ہیں۔ حضرت دعا کے لیے درخواست ہے۔ باقی بہت کمینہ شخص ہوں اس قابل نہیں کہ آپ کی جوتیوں

والی جگہ پر بھی بیٹھ سکوں۔ صرف یہ دعا فرمادیں کہ آخری سانس بھی مالک حقیقی کی یاد میں نکلے۔ تمام ساتھیوں کی طرف سے اسلام علیکم۔ حافظ شبیر احمد صاحب سلام عرض کرتے ہیں صرف یہ عریضہ اس لئے تحریر کیا۔ حاجی صاحب مجھے فرماتے تھے کہ آپ ساتھ آئیں میں نے عرض کی کہ ہمیں حکم نہیں ہے ہم ساتھیوں کو یہاں ذکر کرائیں گے۔ حاجی عبدالغنی صاحب اور ان کے ساتھ اور بھی ساتھی اعتکاف کے لیے حاضر ہیں ان کی اور میری استقامت کے لیے دعا فرمادیں۔

والسلام

آپکاخادم

محمد حسین شاہ

105/D-B ضلع ساہیوال

باسمہ تعالیٰ

از حال

صادق آباد

مدظلہ العالی

مربی و مرشدی اعلیٰ حضرة دامت برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ ہے کہ۔

بہت بڑا عرصہ گزرنے کے بعد خط لکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ دل چاہنے کے باوجود مجبوری حالات کے سبب زیارت اور صحبت سے محروم رہا ہوں۔ اس کم نصیبی پہ دل روتا ہی رہتا ہے۔ لیکن آپ کی خصوصی توجہ کے بدولت اخلاص محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ آپ کے ساتھ محبت میں اضافہ ہوا ہے۔ الحمد للہ۔ میرے آقا صحبت کو کافی عرصہ ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ سستی اور کاہلی آ گئی اور فجر کی نماز بھی قضا ہونے لگی تہجد تو کجا رہا۔ لیکن ایک وقت کا ذکر تقریباً پون گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ کرتا رہتا تھا۔ جب فجر کی نماز ہوتی تو دل پریشان ہوتا تھا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے نماز کے قضا ہونے کا دل میں بہت دکھ ہوتا تھا اور اس کمزوری کو دفع کرنے کے لیے روزانہ عزم کرتا تھا کہ نماز قضا نہیں کرونگا۔ لیکن پھر بھی قضا ہوتی تھی یہ صحبت شیخ کے میسر نہ ہونے کا نتیجہ تھا جو مجھے یقین محسوس ہوتا تھا۔ میرے اس حال پہ میں اپنے آپکو منافق محسوس کرتا تھا اور جو کبھی آنسو نکلتے ہیں انہیں مگرمچھ کے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہ سمجھتا تھا۔ ایک دن کسی دوست سے المرشد لیا کہ میں پڑھوں اس

میں آپ کی تقریر پر تحریر تھی کہ ایک شخص ایسا ہے جس کی روح میرے ساتھ ذکر کرتی ہے میں جہاں بھی ہوتا ہوں اس کی روح میرے ساتھ ذکر کرتی ہے اس نے خواب دیکھا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ ذکر کرتا ہے لیکن ہر طرف پانی ہے آپ پانی میں ذکر کر رہے ہیں ہر طرف دھند ہی دھند ہے آپ نے اس کی تعبیر کے متعلق فرمایا تھا۔ میں نے بھی سوچا صحبت شیخ سے بہت عرصہ محروم رہا ہوں اور میں اپنے شیخ عالی مقام کی خدمت اقدس میں اپنے روح کو پیش کر کے ذکر کسی کے فائدہ حاصل کر سکتا ہوں اور میں نے بھی اپنا معمول بنالیا ہے۔ جب بھی ذکر کروں تو میں اپنی روح کو آپ کی خدمت میں حاضر کر کے ذکر کروں اور یہیں سے ایسا کر کے بہت سا فائدہ پایا ہے اور یقین ہو گیا ہے کہ میری روح آپ کی خدمت عالیہ میں پہنچتی ہے تب تو فائدہ ہوا اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے آپ سامنے ہوتے ہیں اور آپ کے قلب مطہر سے ایک بڑی نارچ کی طرح میری طرف روشنی آرہی ہے اس سے الحمد للہ میری سستی بھی گئی ہے۔ تہجد بھی نصیب ہوتا ہے نماز کے اندر خشوع خضوع بھی نصیب ہوتا ہے اور نماز کے اندر معیت باری بھی نصیب ہوتی ہے نماز کے پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ صرف میری روح ہے میری ہم شکل ہے اور اس کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ ساتھ ہیں جو ہر جگہ ہیں اور اس کو سجدہ کرتا ہوں بہت لطف نصیب ہوتا ہے سکون سا آتا ہے اور دنیا سے پیار کم ہو کر آخرت اور باری تعالیٰ اور نبی پاک ﷺ کی ذات سے پیار زیادہ ہونے لگا ہے۔ اور آنکھوں اور کانوں اور زبان میں مصروف رہوں لیکن لوگوں کے اندر مصروفیت کے سبب چپ رہتا ہوں اور دھیان اللہ کی ذات پاک کے ساتھ لگا رہتا ہے اور اعلیٰ حضرت ایک حمد باری تعالیٰ نعت کہوں یا معرفت کا در نایاب کہوں جس کا ایک ایک نکتہ نور سے چمکتا ہے جو سر اسر معرفت کی بات ہے۔ اس شعر کو پڑھا تو آنکھوں سے آنسو نکل پڑے کہ میرے شیخ نے معرفت

کو کتنے آسان الفاظ کے اندر ان گوہروں کو پرو دیا ہے جو ویسے تو سارا شعر عجیب رازو نیاز سے بھرا ہوا پایا ہے عام مقتدی سالک جس طرح میں ہوں اپنے مطلب کی بات کو میں نے یوں سمجھا

شعر:- پائی ہے خبر میں نے نبی پاکؐ کے در سے
پانا ہی تجھے مقصد تخلیق ہے میرا

اس سے مجھے یہ سبق ملا کہ میرے تخلیق کا مقصد ہر ایک انسان کے تخلیق کا مقصد ہے ہی معرفت باری کے لیے اور نبی کی تعلیمات کا مقصد بھی یہی ہے۔

شعر:- پانے کا تجھے سہل طریقہ یہ ملا ہے
جو جان سے جائیگا پتہ پائیگا تیرا

اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ عاشق کے لئے جان بھی کوئی چیز نہیں، اہمیت نہیں رکھتی معرفت تب نصیب ہو گی جب انسان صحت و نیند وغیرہ قربان کرے گا اور مجاہدہ کریگا۔

اعلیٰ حضرت آپ کے اس شعر نے مجھے خوابِ غفلت سے نکالا ہے ہمیں اور توفیق مل گئی ہے اور سونے پر سہاگے سے زیادہ پر نور اشعار نے رونق بخش دی ہے اور مراقبات کے اندر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری روح کے اندر اللہ تعالیٰ کا قرب ہے جس کی ذات ہر جگہ ہے مجھے اپنی روح کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا ہر مراقبے میں محسوس کرتا ہوں کہ میری روح کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہیں۔ جب مراقبہ فنا پر پہنچتا ہوں تو پریشان سا ہو جاتا ہوں جب روح کی تخلیق تجلی باری تعالیٰ سے ہے اس کا تعلق و نفخت فیه من روحی سے ہے اور باقی ہر مخلوق فنا ہو گی اور مراقبہ فنا میں ہر مخلوق فنا ہے لیکن اللہ پاک کی تجلی سے میرا روح ہے اور سجدے میں ہے یہ کیا ممکن ہے فنا ہو گی اور روح کے فنا کا عقیدہ کفر ہے یا پھر اگر یوں سمجھوں کہ ہر چیز

کے پیدا کرنے سے پہلے صرف اللہ پاک کی ذات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور فنا میں بھی یہی ہے تو اور بات ہے۔ یہاں آکر پریشانی ہوتی ہے مجھے سمجھا دیں۔ اور بقا کے مراقبے میں ہر جگہ اللہ پاک ہے میری روح کے ساتھ اور اندر ہر جگہ میں اللہ پاک ہیں اور سارا زمانہ اسی کے ساتھ قائم ہے درخت اور ساری کائنات زمین وغیرہ اسی سے قائم ہے اور مراقبہ میں کعبہ میں بھی اللہ تعالیٰ کو اپنے اندر اور ہر جگہ میں کعبہ ہی محسوس کرتا ہوں لیکن اپنے اندر زیادہ روشنی محسوس کرتا ہوں تلبیہ پڑھتے وقت یوں لگتا ہے وہ اللہ پاک تو میرے ساتھ ہے اور مراقبہ مسجد میں کرنل محبوب صاحب نے فرمایا تھا 1500 سال پیچھے نبی پاک ﷺ کی حیات کے زمانے میں روح خدمت میں پہنچتی ہے وہیں بھی روح پہنچتی ہے یوں لگتا ہے نبی پاک ﷺ کے ساتھ اللہ پاک ہے دونوں اکٹھے ہیں وہی اللہ ہمارے ساتھ اور ہر جگہ اور درود اللہ پاک اور نبی پاک ﷺ کے روبرو پڑھتا ہوں اور روضۂ اطہر میں بھی یہی کیفیت ہوتی ہے لیکن یہاں صدیق ؓ کے موجود ہونے کا احساس ہوتا ہے اپنی روح کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ حضرت میری اصلاح فرمائیں اور دعا فرمائیں اور طریقہ فرمائیں کہ ہمیشہ نبی پاک ﷺ کو دیکھوں۔ کچھ عرصہ کے لئے صادق آباد میں رہوں گا کیونکہ یہاں میرے سسرال والے بھی رہتے ہیں۔ میری بیوی آپ کی مرید ہے بیمار رہتی ہے ذکر میں بہت سست ہے لیکن آپ کے ساتھ عقیدت بہت رکھتی ہے بڑا احترام کرتی ہے ذکر نہیں کرتی۔

اعلیٰ حضرت دعا فرمائیں کہ میرے یہ مراقبات راسخ ہو جائیں مراقبات کا یہ سلسلہ کبھی نہ ٹوٹے۔ سستی نہ آئے اور ہمت دھیان رہے اور اخلاص قائم رہے۔

آپکا غلام بیٹا

سید نثار احمد شاہ امروٹی

۴۸۲

مکرمی جناب حضرت مولانا محمد اکرم صاحب

السلام علیکم!

یہ دونا چیز آپ کی دعا سے خیریت سے ہے اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہے کہ اللہ آپ کی صحت میں برکتیں دے اور تا زندگی آپ کا سایہ رحمت ہم پر رہے۔ حضرت جی آج اکتالیسواں دن شام کے پانچ بجے آپ کی طرف خط لکھ رہا ہوں۔ تمام بیماروں کو آپ کی ہدایت کے مطابق نقش پلائے گئے۔ الحمد للہ کسی کو دورہ تک نہیں پڑا۔ بھائی صاحب جن کی بیماری اللہ جانتا ہے کہ کیسی تھی۔ چار پانچ آدمی ان کے پہرے دار تھے۔ اندھیری رات کو گھر سے بھاگ کر نکل جاتے تھے۔ اکثر بلند پہاڑیوں یا نالوں کی طرف خودکشی کرنے بھاگ جاتے تھے۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی بھی انہوں نے خود کاٹ لی تھی۔ اب خدا کا کرم آپ کے نقش اور دعا کا یہ وسیلہ ہے کہ نوے (90) فیصد ٹھیک ہو گئے ہیں۔ اب صرف بات چیت کم کرتے ہیں۔ اکثر خاموش رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملنے میں خوف یا ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ بیوی بچوں کو چھوڑ کر باقی کسی سے عام بات نہیں کرتے۔ روزہ، نماز، جمعہ اور نماز تراویح پڑھتے ہیں قرآن پاک کی تلاوت ایک پارہ ہر روز کرتے ہیں۔ ان کے لیے مزید جو ہدایت اس سے آگاہ کریں۔ نقش کا پانی بیمار کے علاوہ صحت یاب بھی فیض سمجھ کر پیتے رہے۔ چھوٹا بچہ جس کی عمر تین سال ہے وہ اکثر رات کو سوتے ہوئے چونک مار کر دونوں ہاتھوں اور چہرہ کو مکان کے چھت کی طرف کر کے جنون کی

حالت میں رونا شروع کر دیتا تھا۔ بلانے سے نہ بولتا اور نہ خاموش ہوتا، اسے بھی حسبِ معمول پلاتے رہے۔ اسے بھی فرق ہے ہفتہ دس دن بعد اس کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے۔ باقی سب بیمار آپ کے حق میں دعا گو ہیں۔ بیماروں کے بارے میں مزید ہدایت فرمائیں۔

والسلام
آپکا مخلص
محمد صغیر خان
آزاد کشمیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت شیخ المکرم

السلام وعلیکم!

میں اس وقت جماعت نہم میں پڑھتا تھا جب سے میں نے ذکر خفی شروع کیا اور اس وقت میں بارہویں جماعت میں پڑھتا ہوں اس طرح مجھے ذکر کرتے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں۔ ماشاء اللہ میں نے آپ کی بیعت بھی کی ہوئی ہے حضرت! بات یہ ہے کہ میں گاؤں سے باہر پڑھنے جایا کرتا تھا وہاں سبزہ ہوتا تھا جس سے طبیعت بہل جاتی تھی اور سبق بھی جلدی یاد ہو جایا کرتا تھا۔

حضرت! جس طرف میں پڑھنے جایا کرتا تھا اس طرف گاؤں کے لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہاں بھوت پریت رہتے ہیں اور وہاں سے بہت سے لوگوں کو سایہ ہو گیا ہے۔ میں اس بات سے نہیں ڈرتا تھا کیونکہ باقاعدگی سے ذکر کرتا تھا اور نماز پڑھتا تھا۔ ایک دو دفعہ مجھے کسی نے آوازیں بھی دیں لیکن میں نے انہیں اپنا وہم سمجھا۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے مجھ سے ذکر چھوٹ گیا یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں اسی طرح پڑھنے جاتا رہا۔ ایک رات میں پڑھ رہا تھا اس وقت رات کا ایک بجا ہو گا یا غالباً دو بجے ہوں گے۔ تمام گھر والے سو رہے تھے صرف میں ہی جاگ رہا تھا۔ میں اپنی کتابوں پر جھکا پڑھ رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ میرے نزدیک کوئی ہے۔ میں اسی طرح پڑھتا رہا میں نے پھر اچانک سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک لمبی داڑھی والا شخص کھڑا ہے میں اس کا صحیح حلیہ نہیں بتا سکتا۔ میں اس سے ڈر گیا مجھ پر غشی طاری ہو گئی اور مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔ گھر والے پریشان تھے وہ ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ ڈاکٹر سے کچھ افاقہ نہ ہوا تو کسی کے کہنے پر عامل کو بلا لائے۔ اس نے اپنا کوئی عمل کیا

تو جن حاضر ہو گئے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ اس کو کیوں تنگ کر رہے ہو تو اس نے جواب دیا کہ ہم اس کے پیچھے کئی دنوں سے لگے ہوئے ہیں اس کے گرد روشنی کا ایک حصار ہوتا ہے جو ہمیں اس کے نزدیک نہیں جانے دیتا تھا۔ آج ہم نے روشنی کا وہ حصار نہ پایا تو آ گئے۔

حضرت! اس نے یعنی عامل نے اسے جانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ عامل کے دو تین بار کہنے پر وہ چلا گیا۔ گاؤں کے کچھ اور لوگ جو اپنے آپ کو اس کام کا ماہر سمجھتے تھے وہ آئے اور انہوں نے دم کیا۔ شام کو پھر وہ جن آن حاضر ہوا تو گاؤں کا کوئی آدمی کالا علم جاننے والے کو بلا لایا۔ حضرت اس جن نے مجھے اس وقت اتنی تکلیف نہیں دی ہو گی جتنی اس عامل نے دی۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑا تھپڑ لگائے۔ پھر ارشد صاحب کو بلایا گیا تاکہ ذکر کروایا جائے اور کچھ افاقہ ہو۔ جب ارشد صاحب نے ذکر شروع کیا تو وہ چیخنے لگا کہ میں جل رہا ہوں ذکر بند کر دو لیکن ارشد صاحب نے ذکر جاری رکھا جب ذکر ختم ہوا تو وہ جا چکا تھا۔

حضرت! اسی طرح اگلے دن پھر ذکر کا پروگرام ہوا میں بھی ذکر کرنے بیٹھا تو پھر مجھے تکلیف شروع ہو گئی لوگ اسی وقت عامل کو لے آئے۔ جن چیخ رہا تھا کہ میں جل رہا ہوں ذکر بند کر دو۔ عامل نے اس سے پوچھا کہ تم جل کیوں رہے ہو تو اس نے کہا کہ گوجرہ سے منارہ تک نور کی اتنی زبردست بارش ہو رہی ہے کہ مجھ سے وہ انوارات برداشت نہیں ہو رہے اس لیے میں جل رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ منارہ میں ایک بڑی بزرگ ہستی رہتی ہے۔ ان کی توجہ اس وقت اسی طرف ہے۔ ان کے سینے سے نور کی ایک شعاع چلتی ہے جو یہاں تک آ رہی ہے پھر اس نے کہا کہ مجھے مسلمان کر دو پھر اسے مسلمان کیا گیا۔ بعد میں اس عامل نے اسے جلا دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اسے آپ کی تعریف اچھی نہیں لگی تھی یا کسی اور وجہ سے یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔

حضرت جی! میرے بھائی جان اور ابو جان ایک حادثہ میں فوت ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا کیجئے۔ اور ہمارے سب گھر والوں کے حق میں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک بننے کی اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم گنہ گاروں کی زندگیوں کو اسلام کے لیے وقف فرمائے اور جو کام آپؐ نے اپنی امت کے ذمہ لگائے ہیں ہمیں پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپکا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور تنظیم "الاخوان" جس عظیم مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اللہ تعالیٰ اس میں آپ کو کامیابی وکامرانی عطا فرمائے۔ (آمین)

والسلام

آپ کا بیٹا

محمد زبیر ارشد

حوالہ نمبر ۱ . . .

(۱۸۱)

دبیر کی دادی لودھراں کا بھائی جو کہ ہمارے سلسلہ کے ساتھی ہیں۔ آئے اور بتایا کہ منیر کو
جنات نے تنگ کیا ہوا ہے۔ کبھی چارپائی سے نیچے گرا دیتے ہیں اور کبھی جلتے چولہے
میں گر پڑتا ہے۔ میں چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کے گاؤں گیا۔ دیکھا
تو وہ بری طرح ڈرا ہوا ہے۔ ذکر کیا۔ اور زبیر کی چارپائی ذکر کے دوران بالکل
نزدیک رکھوا لی۔ ذکر شروع ہونے کے دو چار منٹ بعد وہ تڑپنا شروع
ہو گیا۔ ساتھیوں نے اس پر بمشکل قابو پایا۔
اس کی آواز آتی رہی کہ ذکر بند کر دو۔ میں چل گیا۔
ذکر کے بعد دعا سے فارغ ہوئے تو دیکھا محفل میں بیٹھے ہوئے اسی بچے کے چچا
زنتیا کی بے حال تھے۔ اس کا حال پوچھا۔ تو کہنے لگا۔ کہ میرے ساتھ بیٹھ کر
کسی بزرگ نے ذکر کرایا ہے۔ کہنے لگا۔ کلمہ پڑھ کر بیٹھا ہوں۔
کہ وہ بزرگ مولانا محمد اکرم صاحب تھے۔ کہہ کر رونے لگا۔
دوسرے دن معلوم کرنے والا عامل دوران ذکر آیا۔ تو اس نے جنات
سے بات کی۔ کہ اس بچے کو کیوں تنگ کرتے ہو۔ تو کہنے لگے۔
کہ ایک دن یہ کھیتوں میں آیا۔ ہم نے اس کے گرد سفید دائرہ
دیکھا۔ جب اس کے قریب ہوئے۔ تو ہمارا جسم جلنے لگا۔ ایک دن
گھر کے صحن سے گزرے تو اس کے گرد سفید دائرہ نہیں تھا۔
ہم اس میں سرایت کر گئے۔

(۴)

پھر کہنے لگا کہ گوجرہ سے آنے والے احباب نے جب ذکر شروع کیا۔ تو ہم نے دیکھا کہ ایک سفید دائرہ جنازہ سے گوجرہ تک آ گیا۔ راستہ میں ایک مسلمان جو ذکر کرتے دوران میں مارا گیا۔

اب پتہ چلا ہے کہ وہ سفید دائرہ کیا تھا۔ مجھے کلمہ پڑھاؤ۔ اور کہنے لگا کہ یہ لوگ بالکل صحیح ہیں۔

پھر کہنے لگا مجھے سزا دے لو۔ جو میں نے اس بچہ پر کی ہے۔

چند لوگوں نے اس سے باتیں پوچھیں اور اپنے متعلق سوال کئے۔ جن کے اس نے جوابات دیئے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ ہم ذکر کرنے والوں میں داخل نہیں ہوتے۔

ملک محمد ارشد
گوجرہ

Brigadier
Muhammad Afzal Khan
House No. 8
Allahabad Road
Westridge III
Rawalpindi

17th December, 1990

قابلِ احترام قبلہ حضرت جی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خیریت نامہ مل گیا تھا۔ بریگیڈیئر سہیل کے [illegible] تعویذ بھی اور آپ کے دونوں بیٹوں کی دعوتِ ولیمہ میں بہت بہت شکریہ۔

آپ کو دونوں بیٹوں کی شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ بچوں کو صحت تندرستی کے ساتھ خوش وخرم اور اپنے گھروں میں آباد رکھے آمین۔

ولیمہ پر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ بہرکیف افضل کی آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کی دونوں بہوئیں ماشاءاللہ بہت خوبصورت ہیں۔ اور ایک تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے روحانی نسبت کی بھی سعادت رکھتی ہیں۔ ماشاءاللہ بہت خوش نصیب ہیں۔ اور آپ کے ہاں دعوتِ ولیمہ میں آپ کے حلوے کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ ہم پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد میٹھا کھانے کا قطعاً ارادہ نہ رکھتے تھے۔ لیکن یہ خیال کر کے کہ اگر نہ کھایا تو کفرانِ نعمت ہوگا۔ اور جب چکھا تو اتنا لذیذ تھا کہ کھاتے ہی چلے گئے۔ اور اسی جماعت کے ساتھیوں سے بھی ملاقات کر کے خوشی ہوئی۔

کچھ مصروفیات کی وجہ سے آپ کو خط لکھنے میں دیر ہو گئی۔ آپ کو اپنا ماجرا لکھنا چاہ رہی تھی۔

پچھلے ہفتے مغرب کی نماز کے بعد ذکر کر رہی تھی۔ جب مراقبات پر پہنچی سیرِ فاتحہ سے مراقبات نبوت میں پہنچی تو پھر ثانی [illegible] کے بعد ایک روز تہجد کی دعا میں سلسلہ [illegible] ملنے آ رہی تھی ذکر سے [illegible] رہا تھا وقت نہ تھا مگر حضرت صاحب شام [illegible] [illegible]

تو ایک مسحور کن خوشبو چاروں طرف پھیل گئی۔ جیسے ہزاروں پر آتی ہے۔ یا اس
سے بھی قدرے مختلف۔ ایسے لگا کہ جیسے بڑے حضرت جی بھی ساتھ ہیں۔
ملتزم پر پہنچی تو آنسو جاری ہو گئے۔ جب روضہ رسول پاک صلعم پر پہنچی
تو بڑے حضرت جی اور آپ کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ اندر نور ہی نور تھا
ہر ایک انسان کے قد کے برابر ایک نور کھڑا ہوا نظر آیا۔ خوشبو بدستور
آرہی تھی۔ اچانک پاؤں مبارک نور کے نظر آئے۔ مجھ گناہ گار سیاہ کار نے
الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھتے ہوئے پاؤں مبارک پر اپنا
سر رکھ دیا اور نظر کرم کی درخواست کی۔ اور میں روتی جا رہی تھی۔ اپنی
عرض بھی پیش کرتی رہی۔ اچانک ذکر اتنا تیزی سے جاری ہو گیا۔ اتنا تیز
کہ انسان بے خود ہو جائے اسے روکنا اپنے بس میں نہ تھا۔ میری چیخیں نکل رہی
تھیں۔ اور میں اپنی عرض بھی پیش کر رہی تھی۔ ان کیفیات کو قلم کے سپرد
کرنا مجھے نہیں آرہا۔ کاش میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی معطر خوشبو میں اور
اور اسی حال میں یہ موت آجائے
پاؤں مبارک پر سر رکھے ہوئے گزر جائے۔ یہ اس فانی دنیا کی ساری نعمتیں،
سارے عیش عشرت آرام ان لمحات کے مقابل ہیچ ہیں۔ جو مجھ گناہ گار
کے نصیب میں اس وقت تھے۔ آپ میرے لئے خاص دعا کریں اور مجھ
گناہ گار پر اپنی توجہ بھی عطا کرتے رہا کریں۔ اللہ تعالیٰ مجھ گناہ گار کے
گناہ معاف کر کے توبہ قبول کرے اور اپنے نیک مومن بندوں میں مجھے بھی شامل کر دے
اور آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حرم پاک میں اپنی لونڈیوں اور کنیزوں میں
مجھے شامل کر لیں۔ آمین۔
آپ کی تابعدار بیٹی
آپ کی خدمت اقدس میں اور آپا جی کو ہماری طرف سے نو دہائیاں سلام عرض ہے۔ اللہ کی امان فی امان اللہ۔ نگہت افضل

مدظلہ العالی
محترم حضرت جی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کریم سے امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ یہاں ابھی پہلے والی طرح سیٹ نہیں ہو پا رہی۔ عجیب کیفیت ہے کبھی گُم ہو جاتی ہوں کبھی زور لگا کر واپس آتی ہوں۔ کام اتنے خراب کیے ہوئے ہیں کہ درست کرنے کافی مشکل لگ رہے ہیں بہرحال کوشش جاری ہے۔

ہر کام لیٹ ہو جاتا ہے اب پابندیٔ وقت کی کوشش کر رہی ہوں لیکن بہت تھوڑی کامیابی ہوئی ہے۔ آج کل نیند نے کیا زور کیا ہوا ہے۔ جو دن کو سارا دن سوتی رہی ہوں۔ بہت وقت ضائع کیا۔ باقی رات اپنے آپ کو کوسنے میں گزار دیا۔ آج صبح ذکر کیا تو عجیب بات دیکھی دوائر ثلاثہ میں یحبھم و یحبونہ کے بعد "والذین امنوا اشد حب للہ" پڑھا تو چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا جیسے دائرے کے مرکز کی طرف جا رہی ہوں شکر والحمد لولا ہے ہی نہیں ہو رہا تھا اس میں نے اپنے پاس ایک سفید رنگ کا گھوڑا دیکھا اس پر سوار ہو کر یا فقیرو الی اللہ اور خوب دوڑایا۔ بہت عرصے میں بہت کم فاصلہ طے ہوا ایک انچ سے بھی کم۔ اس کے بعد الاثبات الظاہر والباطن میں بھی دیکھا کہ انوارات دوائر سے مجھ میں اور گھوڑے میں بھی جذب ہو رہے ہیں اس پر سرخ رنگ کی روشنی پڑ رہی ہے۔ فنا بقا میں دیکھا کہ گھوڑا بھی عبادت کر رہا ہے میں اس سے نیچے اتر کر سجدے میں پڑی رہی اور فنا میں گھوڑے کے جسم کے بھی ٹکڑے ہیں اور میرے ٹکڑا الگ اللہ ھو کہہ رہا ہے پھر سب کچھ غائب ہو گیا کچھ سمیت

سیر صلوٰۃ میں دیکھا کہ سجدہ کرتے وقت کچھ نیچے پہلے انوارات سجدے کی جگہ سے اوپر کو اٹھ رہے ہیں روضہ رسول ﷺ پر اپنے آپ کو دیکھا۔ (آج ذکر لیٹ کیا لوٹے بجے اور دم بخود کچھ ہو گئی تو پیچھے آپ نے آکر بتا کر آپ کو کبھی کلا کر میرا ہی) دیکھا کہ آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خاص کمرے پر نزول ہے سخت شرمندگی ہیں آپ ﷺ سے دیر ہونے کی معافی چاہی ناراضگی تو خاص نہیں ہوئی مگر حکم ہوا جب تک اجازت نہ ملے جا نہیں سکتیں جان میں جان آئی۔ تسلی ہوئی کہ اتنا عرصہ آپ ﷺ کی زیارت ہوں کہ سامنے رہنا تو بڑا انعام ہے۔ اپنے پر رونا آیا۔ اپنی سستی پر سخت شرمندگی ہوئی۔ پھر آپ کو وہاں دیکھا۔ بہت دیر بعد آپ ﷺ نے فرمایا چلو مسجد نبوی ﷺ آپ کے ساتھ وہاں آئی وہاں بھی حکم ہوا اجازت سے پہلے نہیں جا سکتیں۔ بہت دیر درود شریف کا ورد کرتی رہی فنا فی الرسول کا مراقبہ بھی کیا مگر ابھی آنے کی اجازت نہ ملی بہت دیر کے بعد چلی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا اب جانا چاہو تو جا سکتی ہو۔ وہاں سے آنا دل چاہتا ہے کچھ دیر اور گزاری۔

مولانا صاحب کتنی قیمتی ہیں جو صفات میرے انسان کو بخت رہی ہیں جو آپ الفاظ بیان نہیں کر سکتے

اور لوگوں کی زندگی کو کوشش کرتا ہے۔ انسان چاہے تو غالب ہو سکتا ہے جذبہ ہونا چاہیے۔ میرا چلا

گیا غالب ہونا نام نہیں۔ دعا فرمائیں اللہ حبیب محمد الرسول اللہ [illegible] عادی کیا چیز ہو جاتا۔ زیادہ

[illegible] زیادہ ہے کیونکہ آپ کی خوراک بنت جائے۔ بالکل فنا ہو جاتی۔ [illegible] نے بہت کام خراب

کر دیا ہے۔ اللہ کریم علم حاصل کرنے میں میری مدد فرمائیں۔

[illegible] ختم کرنا ہو [illegible] تو [illegible]

[illegible] Methodology [illegible] Thesis [illegible] Research اور Proposal کی کلاسیں شروع

[illegible] ہو جائیں گی [illegible] کے علاوہ۔

میرے علاوہ ایک غیر مسلم خاتون بھی ہے جو Management پڑھ رہی ہے جسکو ملائیشیا کی ہے

اور ایک ترکی سے (Englishman) نے شادی کی ہے آج کل ان میں علیحدگی ہے۔ بہت پریشان تھی اسکو

ذکر بتایا ہے باقاعدگی سے یقین کرنا۔ اسکو قرآن کے ساتھ سمجھا کر رہا جا سکتا ہے یا صرف بتا دینا

کل ہے رات کو گھنٹہ بھر اس سے بات چیت ہوتی رہی کہ Creator کے بارے میں کہنے لگی میں

تو نہیں مانتی میں نے 25 سال کے بعد [illegible] بھی اسی لیے چھوڑا کہ ہر کوئی اپنے مفادات

کے لیے کام کر رہا ہے ہر کوئی دوسرے کو Blame کر رہا ہے۔ اس سے انسان کے اختیار

پر بات ہوتی رہی۔ بہت غور سے سنتی رہی۔ اپنا Thesis لکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے

اس سے کہا کہ تم اپنا کام کرو وقت ضائع ہو رہا ہے کہنے لگی نہیں تم بات کرو مجھے باتوں میں

زیادہ مزا آ رہا ہے۔ الحمد للہ انشاء اللہ [illegible] مجھے توفیق دے [illegible] اسی کی عنایت ہے

مجھے اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی زندگی واپس آ رہی ہے۔ محسوس ہو رہا ہے کہ آرام [illegible]

[illegible] زندگی [illegible] سے [illegible] ہے۔ اسی طرح توانائی سے کام کرنے کا جو سلسلہ

کٹ گیا جو طاری ہے کوشش سے ہی ہو گا تو انشاء اللہ [illegible] کے دن تھوڑے ہیں۔

میں نے آج خواب میں دیکھا آپ کو میدان حشر میں دیکھا۔ اعمال بہت تھوڑے ہیں اللہ

نے آپ کو منبر دیے ہوئے ہے۔ آپ مجھے کہتے ہیں درود شریف سناؤ میں اللھم صلی علی سیدنا محمد [illegible] وعلی آلہ

و اصحابہ و بارک وسلم سناتی ہوں مگر آپ فرماتے ہیں درود ابراہیمی سناؤ [illegible] تو آپ ایک [illegible] میں سے 14 نمبر

[illegible] پھر بات [illegible] اسکی وجہ سے [illegible] تھوڑے سے [illegible] ایک طرف جا کر بیٹھتی ہوں جہاں

کچھ جو اپنی دوست لڑکیاں ہیں ان کے نمبر دیکھتی ہوں تو مجھ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے ایک خاتون کے تو نمبر بہت ہی زیادہ ہیں۔ سخت ترین افسوس ہوتا ہے کہ میرے نمبر کیوں کم ہیں میں Average میں نہیں رہنا چاہتی مگر کچھ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔

جب سے لکھ رہی ہوں تو یہ حال ہے اللہ کریم زیادہ کرنے کی توفیق دے کہ ہمارا اور زیادہ بھی کچھ نہیں اپنی رحمت سے ہمیں ان اعمال کی توفیق عطا فرمائے جو اسے محبوب ہیں۔

آج میں ابھی Faunbrough جا رہی ہوں۔ ایک خاتون کو فون نمبر دے کر کہا گیا تھا ہو سکتا ہے ان سے ملاقات ہو جائے تو تفصیلی بات ہو سکے گی۔ پاکستان سے ایک فیملی کے لیے سلسلے کی کتابیں اور میری ہمشیرہ اپنے گھر سے لے کر آئی ہے وہ بھی ان کو دیں۔ اللہ تعالیٰ ادھر بھی چند لوگ ساتھی بنا دیں دعا فرمائیں کہ حلقہ ادھر بھی قائم ہو۔ ادھر کافی مسلمان ہیں۔ جمعہ کی نماز میں کچھ خواتین نے اپنے گھر متعلق مطالبہ کیا ہے ان شاء اللہ ان مواقع کو بھی وقت خوبی سے استعمال کرنے کی کوشش کروں گی۔ پڑھائی سے جو وقت بچے گا ان شاء اللہ استعمال کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔

حضرت جی! ایک بات سے بہت پریشان ہوں جب اپنی پچھلی زندگی کو دیکھتی ہوں کہ میرے ماں باپ نے مجھے دین اور دین داری کی نسبتیں اور فرائض تک نہیں بتائے تو بہت اندر سے دکھ ہوتا ہے۔ کبھی نماز سیکھنے کا مسائل کے بارے میں پڑھنے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ خود انہیں یہ باتیں ازبر تھیں تو ان سے محبت محسوس نہیں ہوتی۔ حالانکہ میری امی کی سب سے زیادہ دوستی مجھ سے ہے لیکن مجھے اپنی یہ خامی بہت تکلیف دیتی ہے کہ مجھے ان سے محبت محسوس نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی ہے۔ ان کے اتنے احسانات ہیں مگر اس کے لیے مجھے کچھ بتا دیجئے میں سخت پریشان ہوں۔ بہت کم مواقع پر میں نے محبت محسوس کی تھی۔ باقی بہن بھائیوں کا حال دیکھ کر اندر دوری محسوس ہوتی تھی۔ اللہ کریم کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے اب بھی سمجھ مرنے سے پہلے تو توفیق عطا فرما دی کہ سمجھ کر کچھ حاصل کر سکیں۔ میری ماں مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے اور مجھے ویسا جواب نہ دے سکنے پر شدت سے تکلیف ہوتی ہے اور بہت محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے پتہ نہیں میں کیا کروں۔ جب بھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر دم ہمیں دنیا کے ڈھول سے ڈرایا کبھی اعتماد سے نہیں رہنے دیا تو پھر دماغ گھوم جاتا ہے۔ میں اس بات سے سخت پریشان ہوں یہ تو قرآن حکیم کی تعلیمات کے سخت خلاف ہے۔ مجھے اسکا کوئی علاج بتائیے مجھے اس بات سے سخت تکلیف ہوتی ہے مجھے اس بات سے بہت خوف آتا ہے۔ آپ کو لکھتے بھی ڈر رہی ہوں کہیں آپ ہی ناراض نہ ہو جائیں۔

(4) (16)

کر چھوڑ ۔ بیمار سمجھو لیں ۔ امراضِ دل کی شفا کے لئے ہی تو طبیب کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ مجھے میرا دل
[illegible] معلوم ہی نہیں کب یہ کھلے گا ۔ ڈر ہی ہو رہا کہیں وقت گذر نہ جائے اور میں بدنصیب رہ جاؤں
اللہ مجھے معاف کرے ۔

اس وقت تو میرا دماغ بھی بند ہو گیا ہے اس لئے [illegible]
آپ کو تنگ کرنے کی معافی چاہتی ہوں ۔ اب اجازت دیجئے ۔ دعاؤں کی طالب

والسلام آپکی حقیر سی بیٹی

عائشہ سعادت

حضرت جی مجھے معلوم ہے کہ کسی سے توقع نہیں رکھنا چاہیئے ۔ جو گذر گیا اسے بھول کر نئی زندگی شروع کرنا چاہیئے ۔ مگر یہ بہت مشکل ہے ۔ دل کو بہت تکلیف پہنچی ہے ۔ میں جتنی ہوں پوری قوم کا یہ حشر ہے بلکہ پوری ملت کا تو اور تکلیف ہوتی ہے ۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے بھی کوئی perfect زندگی نہیں گذاری اور مجھے بھی اللہ توفیق نہ دیتا تو ابھی دلدل میں ڈوب گئی ہوتی ۔ اللہ نے انھیں بھی اپنا نام لینے کی توفیق اب دی ہے وہ لوگ بھی شاید بے بس تھے مگر دل کیوں نہیں مانتا ۔ اپنے نقصان پر صبر نہیں کرتا میں کیا کروں ۔ اللہ سے صبر کی دعا کرتی ہوں مگر بہت تکلیف میں ہوں ۔ نقصان بہت بڑا اپنے ازالے کے لیے ہو ۔ سمجھ نہیں آتی ~~اور جب~~ ۔ معاف کیجئے ہو کر شروع ہو گئی ہوں ۔ شاید یہ بھی میری بے صبری ہی ہے ۔ ان باتوں سے میری توانائیاں ضائع ہو جاتی ہیں ۔ میرے دماغ کا حال پتہ چل رہا ہو گا ۔ لکھنا کچھ چاہتی ہوں لکھتی کچھ اور ہوں ۔ میری صحت کے لیے دعا ضرور فرمائیے ۔ انشاء اللہ بہتر ہوں گی

[illegible]

قابل صد احترام شہزادہ حضرت مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے اللہ کے کرم سے آپ اچھے ہوں گے۔ اللہ کریم آپ کو ہمیشہ ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھیں۔ آپ سے بات کر کے دل کو سکون ہوا۔ مگر اداسی بڑھ گئی۔ اللہ جلدی آپ کو یہاں لے آئے۔

پچھلے تقریباً دس دن سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے زاہد بھائی میرے سامنے ہیں نہیں ان کو [illegible] ہوں۔ پھر ابھی میر بھائی کے معاملے ایسا لگتا ہے کہ وہ ترکیب رکھتے ہیں۔ پھر کرنل نسیم صاحب [illegible] احساس ہوا اور اتنا قریب اور واضح لگ رہے تھے جیسے سامنے [illegible] بہت [illegible]۔ پھر اپنے آپ کو آپ کے پاس محسوس کیا۔ بہت قریب۔ بہت مرتبہ

گذشتہ ہفتے مسلسل تین دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روضہ اطہر میں بھی اور مسجد نبوی میں [illegible] بہت واضح زیارت ہوئی۔ آپ صلعم کا لباس مبارک ایسا سفید چمکدار [illegible] نظر نہیں ٹھہرتی۔ جیسے جو ہیولے کے لباس ہیں بہت سی جیبیں اور بیلٹیں لگی ہوتی ہیں [illegible] دیکھا آپؐ کے دائیں جانب حضرت ابوبکر صدیقؓ اور بائیں جانب حضرت عمر فاروقؓ [illegible] ان کا لباس فوجی نہیں تھا مگر بہت سفید چمکتا لباس پہنے تھے۔ پھر [illegible] دیکھا کہ آپؐ نے ان کے سینے پر کوئی بیج لگایا۔ بیج لگاتے وقت آپ صلعم کی [illegible] میری طرف اٹھتی ہے۔ پھر کرنل نسیم صاحب کے سینے پر بیج لگائے ہیں پھر دوبارہ [illegible] آپ کی انگلی مبارک مسلسل جسم میں محسوس ہوئی۔ یہ بیج اس طرح کے ہیں جیسے کسی [illegible] (پہچان کے لیے) الگ [illegible] عطا ہوتا ہے اس کے بجائے بیج عطا ہوا ہے [illegible] دیکھا۔ میرے بھائی اور کرنل صاحب کی وردی تو فوجی تھی مگر زاہد صاحب سادہ کپڑوں میں [illegible] اور اس قدر روشنیاں پھوٹ رہی تھیں کہ نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔

آپؐ کی دائیں جانب ایک میدان دیکھا جس میں نوجوان فوجی دستہ اتنی تعداد میں [illegible] جتنا کہ [illegible] جیسے سنیل کے فوجی ہوں۔ ان کو دیکھ کر رعب طاری ہوتا تھا۔ پھر آپ کو دیکھا [illegible] ان کی صف بندی فرما رہے تھے۔

کل شام [illegible] دیکھا کہ سفید گھوڑے پر بیٹھ کر طواف شروع کر دیا ہے اور ایک اور [illegible] ساتھ جس کی لگام میں نے پکڑ رکھی ہے اور وہ خالی ہے۔ اچانک کرنل نسیم صاحب [illegible] اس کے اوپر سوار ہو جاتے ہیں اور ہم دونوں اکٹھے طواف کرتے ہیں۔ پھر خانہ کعبہ کی [illegible] دونوں دعا کرتے ہیں اور اس کے بعد کرنل نسیم مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور [illegible] ہو جاتے ہیں۔

آج دوپہر میں بازار سے خریداری کر کے واپس آ رہی تھی۔ سیٹ پر بیٹھی۔ تو گنبد مسجد نبوی سامنے ہے۔
اور آپ رحمۃ اللہ علیہ مسلسل مسکرا کر میری طرف دیکھ رہے ہیں پھر ایک جانب دانش صاحب
آپ کے قریب ہو گئے اور ہانیہ صاحب، کرنل نسیم صاحب اور انجینئر ان کا رخ میری طرف تھا اور
وہ بھی مسکرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بہت دیر تک یہ حال ایسا ہی رہا پھر آپ کے
دائیں جانب ... اور بھائی اور آگے کرنل نسیم صاحب کے بائیں جانب منیر بھائی آ کر کھڑے ہو گئے۔
اور سب کا رخ مسلسل میری جانب تھا۔ میرے دل میں بہت خوشی اور سکون بھر گیا
یہ حال ختم نہ ہو۔ میرا دل نہیں چاہا کہ یہ سب غائب ہوں۔ پھر تھوڑی دیر بعد گھر پہنچی
تو یہ ختم ہو گیا۔ پھر مسلسل مسجد نبوی پر توجہ بھی محسوس ہوئی۔ آپ کو سامنے دیکھا۔
لمبی دیر تک رہی

2 بجے کے قریب ڈیپارٹمنٹ جانے کو نکلی تو حضرت اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے سامنے
دیکھا۔ ... ہاتھ میں لئے فرما رہے ہیں کسی جگہ اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں

حضرت مدظلہ العالی میری سمجھ سے تو سب کچھ باہر ہے۔ آپ سے راہنمائی کی درخواست ہے
اللہ مجھے دین حق پر استقامت عطا فرمائے۔ ہمیشہ آپ کے ساتھ رکھے اور منازل علمی اور قوت مشاہدہ
بے انتہا راہ میں کام کرنے اور خوب کام کی توفیق بخشے۔ آمین۔ اللہ کے فضل سے ذکر مناسب ہے اور بہت
... اور قوت محسوس ہو رہی ہے ذکر میں توجہ کا احساس ہے۔ الحمدللہ
ارحام ماشاءاللہ ... بہن بھائیوں کو ذکر سکھا رہی ہے۔ اس کے بھائی نے اپنے ماموں کے
نوجوانوں کی دینی تربیت کا سنٹر بنایا ہے جو ان کے والد کی خواہش تھی۔ اس کے بھائی نے دریافت
کیا تھا کہ صرف طلب پر ذکر سکھایا جائے یا آگے بھی۔ اللہ انہیں استقامت اور ترقی عطا فرمائے
اس کا ارادہ ہے کہ دینی تربیت کے ساتھ کچھ عرصے بعد ان لوگوں کو ذکر سکھا دے گا۔
اس کے بھائی نے بلا سود بینکاری کا کمپیوٹر سسٹم ترتیب دیا ہے اور دین اور اسلامی
نظام کے لئے کام کرنے کا خواہاں ہے۔ ارحام کی Ph.D تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ امید ہے انشاءاللہ
پاکستان آ جائے گی۔ خوبصورت دل لڑکی ہے۔ آپ کو سلام کہتی ہے۔ اور دعاؤں کی طلبگار ہے۔

حنیفہ بھی ماشاءاللہ ٹھیک ہے اور بہت محبت سے ذکر کرتی ہے۔ اس کے شوہر نے بھی
ذکر شروع کر دیا ہے۔ اور نمازیں بھی کچھ تہجد پڑھنا شروع کی ہیں۔ آپ سے ملنے کی بہت مشتاق
ہے۔ ہر ملنے والے کو ذکر سکھاتی ہے۔
حضرت جی ... لڑکی کا رشتہ ڈھونڈ لیا ہے اللہ تمام کی توفیق دے۔ انڈونیشیا کی ایک لڑکی
... سکھا دیا ہے اسے دعا فرمائیں اللہ ہم سب کو استقامت عطا فرمائیں
حضرت جی ... آپ کے پاس دینوں کی انشاءاللہ
حضرت جی اللہ کا کتنا خوبصورت نظام ہے پاکستانی وقت کے گھنٹے پر نماز کا وقت ہے
تو یہ ... ہو گی تمام جہاں۔ سبحان اللہ۔ انشاءاللہ یہ جلدی ہو گی۔ اللہ سب کی حفاظت فرمائے
اجازت حضرت جی۔ آپ کی دعاؤں اور توجہ و شفقت کی ہمیشہ طالب
آپ کی بیٹی عائشہ سعود

مکان نمبر D-286
سٹریٹ نمبر 27 اسلام آباد
F-11/2

جناب پیر صاحب - آداب عرض!

میرا نام جاوید الحسن قریشی ہے اور میں وزارت تجارت اسلام آباد میں ڈپٹی سیکرٹری ہوں۔ کینیڈا میں میرے ایک دوست نے مجھے امریکہ فون کر کے آپ کے بارے میں بتایا تھا اور کچھ عرصہ قبل کرنل بشیر صاحب چکلالہ سکیم III راولپنڈی کے توسط سے جناب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ میری ایک بھابی جو بنیادی طور پر یونانی ہے اور اب امریکہ میں رہتی ہے، کینسر کے مرض میں مبتلا ہے۔ جناب نے مجھے چند نقش (تعویذ) اُس کے لئے عطا فرمائے تھے جو کہ ہر ہفتہ پانی میں رکھ کر، پانی پینے رہنا تھا اور ہفتہ کے بعد ایک نیا تعویذ استعمال کرنا تھا۔ اُن تعویذوں کے استعمال سے میری بھابی کو بہت فائدہ ہوا ہے۔

اُس نے مجھے امریکہ سے فون کیا ہے کہ اب اُس کے پاس صرف پانچ ہفتوں کے لئے تعویذ رہ گئے ہیں۔ اس لئے جناب سے التماس ہے کہ کچھ مہینوں کے استعمال کے لئے مزید تعویذ عنایت فرمادیں تاکہ میں اپنی بھابی کے پاس بھیج سکوں۔ اور وہ پہلے والے تعویذ ختم ہونے سے پہلے پہلے ان مزید (اضافی) تعویذوں کے ساتھ اپنا علاج والا عمل تسلسل کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ جناب کی کمال مہربانی ہوگی۔

آپ کا تابعدار
جاوید الحسن قریشی
4 مارچ 1999ء

Yusuf Ferguady
3402 N. 15th St
Arlington, VA 22201

Dear Beloved Shaikh:

Assalam-o-alaikum How are you? I've recently been reading The Koran and my life and job have improved dramatically. I'm very much interested in following it more. I work Tariq Nicholson and he informed me about the Taweez. I'm a diabetic and would deeply appreciate a blessing of Taweez for my diabetees, I would also deeply appreciate the blessing of sitting in your company for as long as you could spare. I'm not a fully practising Muslim as of yet but I'm learning the Zikr and reading the Koran and of course I believe in Allah. Please prey for me and my family and may Allah be with you.

Assalaam-o-alaikum

[signature]

Sept. 2, 1992

Dear Shaikh,

Assalom Alaikum. I hope this letter finds you in very good health.

Please forgive me for not writing but I am not the greatest in correspondence.

I am very happy and contented living in Whitestone with my new family, Rashid, Asif, Faiz and Rubi. I feel as though we have always been together. My leg is improving and I think that my environment along with the blessings in the water is very beneficial. This house as you know is full of spiritualism. Now if only I can understand and speak your language. →

Three doctors told me there was something wrong inside my knee and I needed corrective surgery. I had an MRI of my knee taken 3 weeks ago. When I went to the doctor yesterday he told me my knee was normal and even though he would still like to do the surgery he can't because the MRI report didn't show anything except some fluid on the knee. I told him that for the past week my leg had been feeling good and I was walking better. He wants to see me again in 3 months. Achchaa!

Assalam Alaikum

Love,

Bareerah

Tariq Nicholson
4711 Berwyn House Road
College Park, Maryland 20770 apt#616
September 19, 1993

Dear Beloved Shaikh:

Assalaam-o-alaikum wa rahmatullahi wa barakatahu. I love you very much and I am looking forward to seeing you there in Dar-Ul-Irfan. I will have all of my finances together before the end of October insha Allah. Can I come to Dar-Ul-I in January?

By Allah's mercy and grace three more Americans have taken shahadah. Insha Allah they will stay on the right path. Enclosed is a letter from a former white American co-worker of mine. He has realized the Barakah of the Koran and he has sent a letter for you.

My biological father's condition of cancer has miraculously improved. Would you please send some taweez for about four or five persons. Two of which will go to (aids) patients one of whom is a muslim woman. Please give my salaams to everyone, Dr. Buttar, Col. Matloob, Col. Naseem, Abdul Jalil, Abdur Rahman and all.

I love you - from your son Tariq

Assalaam-o-alaikum

School of Infantry & Tactics
Quetta
22 September 96

مکرمی جناب شیخ صاحب

السلام علیکم - [illegible]

خداوند کریم آپ کے درجات بلند فرمائے - میں بھی آپ کے
ان ساتھیوں میں سے ہوں - جو کہ امید رکھتے ہیں
کہ آپ کے طفیل ہم بھی شاید نیک لوگوں کی راہ پر
گامزن ہو جائیں گے - سب سے پہلے تو میں آپ کا شکرگزار
ہوں - کہ خداوند کریم کے فضل و کرم سے آپ کے تعویز سے مجھے
تقریباً مکمل آرام آ گیا ہے - مجھے الرجی تھی - سانس
کی تکلیف رہتی تھی - سائنس بھی جس سے شفا نہ تھی - ٹوٹ
نے ... کی ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا - لیکن اللہ کا
شکر ہے کہ آپ کے مشین تعویز مہربانی ... معمول
کے مطابق پہنے - بالکل آرام آ گیا - جیسا کہ آپ نے فرمایا تھا کہ
تعویز معمول کے مطابق پہنیں - میں نہ ... سکا - ...

آپ نے جو مسودات کا ذکر کیا تھا۔ میں نے کہا ہے [illegible] باہر
ہو چکی ہوں گی۔ مگر وہ بار بار مشکل میں ہو رہا ہے۔
ہر دو مشفق محسن بزرگ حضرت سالک رہے ہیں۔ انہی کی کتابیں
چھینکے آتی ہیں۔ لیکن بغیر ان سب حضرات کی خواہش
[illegible] ہے
میری دعا ہے کہ خداوند کریم آپ کے درجات
بلند فرمائے۔ آمین۔
اگر فرصت ہو۔ تو تحریر فرمائیں۔ ضرور تشریف لائیں۔
مدت سے نہیں آئے آپ کے منتظر ہیں۔

آپ کا خادم رنجیدہ
[illegible]

ہو سکے تو ۱۷ ربیع الاول [illegible] اگر مناسب سمجھیں تو اس بیان کی ذات [illegible]
[illegible] دعا دیں۔ اگر مناسب سمجھیں [illegible]

(بعد فوش رہیں) آمین ثم آمین . . . .

السلام علیکم!

فرمائیے. مزاج گرامی: آپکی صحت کیسی ہے ۔

آپکا جرابی نامہ مل گیا ہے ۔ ہمیشہ کی طرح آپکا ہر خط محبت و شفقت اور ہمدردی و اخوت کا سبق دیتا ہے ۔

آپ بہت یاد آرہے ہیں ۔ دل چاہ رہا ہے اڑ کر آپ کے پاس آجاؤں ۔ امی جی کی صحت اللہ کا شکر ہے پہلے سے بہت بہتر ہے اور یہ صرف اور صرف آپکی دعاؤں کی وجہ سے ہے کہ اللہ کریم نے میری امی جان کو دوبارہ زندگی عطا فرمائی ہے ۔ میری امی جی نے آپ کیلئے speciality سے پیغام دیا ہے کہ حضرت جی کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا اور انہیں کہو کہ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ آپ پر خدا کا بڑا کرم ہے کہ بہت رحمت ہوئی ورنہ جتنا بڑا operation ہوا اور پھر اسکے بعد جتنے مشکل ہوئے تھے آپکو رب العالمین کی کرم نوازی سے ان میں سے ایک بھی نہیں ہوا ۔ اور یہ صرف اور صرف اللہ کا کرم اور حضرت جی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے ۔

اب میری امی جی کافی بہتر ہیں لیکن کمزوری ابھی دور نہیں ہوئی ۔

حضرت جی میرے ساتھ ایک بڑا عجیب سا مسئلہ ہے ۔ کہ مجھے کسی فون پر جانا ہے لیکن پھر مجھے بہت ڈر لگتا ہے ۔ جیسے کوئی میرے سر پر [illegible] مار رہا ہو اور میرے جسم سے جان نکل جاتی ہو اور میں بے ہوش ہو جاتا ہوں ۔ حضرت جی میں آپکو بتا نہیں سکتی کہ میں کتنا تو کیا ہو جاتا ہوں ۔ بلکہ سخت ڈر لگتا ہے کیا [illegible] ایسے میرے جسم میں جان نہیں رہتی

[illegible] میرا چھوٹا بیٹا ہے ۔ اسکی عمر تقریباً دس سال ہے ۔ اسکو بھی بے تحاشا ڈر لگتا ہے ۔ بلا اسکا وہ فون سے [illegible] پڑ جاتا ہے ۔ یہ مسئلہ کہ مجھے بہت شدت

اعتبار ہو گیا ہے۔

حضرت جی آپ میرے اور اسکے لیے گلاب لگوانا مناسب فرمادیں۔ میں آپکو اس بات کی تکلیف دے رہی ہوں کہ مجھے اسکے بغیر آرام نہیں آئے گا۔

حضرت جی میرا اجتماع میں آنے کا بڑا سخت دل چاہ رہا ہے اگر اس بیمار تو میں کسی بھی صورت آجاتی۔ آپ دعا ضرور فرمادیں کہ مجھے اجتماع کے آخری دنوں میں ہی سہی مگر آنے کی سعادت ضرور نصیب ہو (آمین) حضرت جی میں تو سمجھتی رہی کہ مینارہ میں دوران اجتماع گزارے ہوئے صرف 3 دن باقی سال کیلئے کافی ہوتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کے پاس رہتے ہیں۔ ہر روز آپکے دیدار کرتے ہیں۔ آپکی آواز سنتے ہیں اور آپکے پیام پڑھتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی محبت و صحبت میں اپنے اصل مقام تک جا پہنچتے ہیں۔ اللہ کریم کی ذات سے محبت و عشق کرتے اپنے نبی کی محبت میں گم ہو جاتے ہیں۔

میرا سخت دل چاہتا ہے کہ میں بھی آپکے پاس آکر رہوں As a doctor انشاءاللہ۔

اللہ پاک آپکا انتہائی نرم سایہ ہمارے سروں پر تا قائم و دائم رکھے۔ (آمین ثم آمین)۔ اللہ کریم مجھے میرے گھر والوں کو میرے دوستوں کو اور رشتہ داروں کو آپ کی صحبت میں روز آخرت میں نبی پاک کے قدموں میں جگہ دے دے (آمین ثم آمین)۔ اور ہم سب کو انقلاب میں صف اول میں جگہ دے آمین ثم آمین

اللہ حافظ

آپکی دعاؤں کی طلبگار۔ آپکی بیٹی

[redacted]

[illegible]

محترم برادر

السلام علیکم

آج عزیز بھائی جان کی زبانی پتہ چلا کہ آپ لاہور تشریف لائے تھے اور آپ کو میرا ارسال کردہ دوسرا خط وصول نہیں ہوا۔ لہذا میں تفصیل دوبارہ لکھ رہی ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ [illegible] چیزیں خواب میں [illegible] ہم [illegible] کرتی ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے [illegible] صاحب نے ذکر کرنا شروع کیا ہے [illegible] کوئی جواب نظر نہیں آیا۔

[illegible] ہمارے [illegible] میں [illegible] اول میں [illegible] بیٹا [illegible] آپ کو [illegible] دیکھنا [illegible] جو [illegible] آتی ہیں [illegible] میں [illegible] شکر ادا [illegible] نے [illegible] اپنے [illegible] لگایا ہے [illegible] ہے۔ انشاء اللہ آپ کی دعا [illegible]

[illegible] رہتا ہے [illegible] میں [illegible] ساتھ [illegible] بھی ہوتا [illegible] رہتا ہے۔ اب [illegible] کہ [illegible] دعا [illegible]

[illegible]

[illegible] والسلام

آپ کی بہن [illegible]

بہت پیارے حضرت جی!

السلام علیکم!

عرض ہے کہ میں بالکل ہی ٹھیک نہیں ہوں کیونکہ ابو کے بعد سارا بوجھ مجھ پر آ رہا تھا۔ لہذا میں آپکے دیدار سے محروم رہ گئی۔ اسمیں میری اپنی ہی کوتاہی شامل ہوگی مگر انسان جس سے اتنی محبت کرتا ہو اس سے نہ مل سکنے پر اتنی خفگیاں یہ محمول ہو۔

آپکی صحت کیسی ہے۔ مجھے آپ بہت یاد آتے ہیں۔ آپکے تعویذ مل چکے ہیں۔ میں نے اپنے اور بہن کے گلے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن حضرت جی وہ مسئلہ جوں کا توں ہے۔ آپ بتا دیجئے شاید بالکل سنبھال نکلوں۔

یہی مسئلہ میری امی کے ساتھ رہا ہے (شادی سے پہلے)۔ انکا تو ہر ذکر کے بعد ٹھیک ہوا تھا۔ اب کبھی کبھار ڈر لگتا ہے۔ لیکن میرے ساتھ بہت برا ہوتا ہے۔ حضرت جی میرے پورے وجود پہ وزن پڑ جاتا ہے کوئی ان دیکھی شے میرے اندر گھسنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور برائی کرنا چاہتی ہے۔ اسکا کوئی وجود میں نے نہیں دیکھا۔ میں تقریباً نیم بے ہوشی کی حالت میں ہو جاتی ہوں۔ جذبات شدت اختیار کر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ بہت پہلے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ہونے لگا ہے لیکن بیچ میں نبی پاک کا نام مبارک آ گیا ہے تو پھر وہ چیز مجھ سے بہت دور چلی جاتی ہے۔ لیکن اب مسلسل کچھ عرصے سے لگاتار میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ نیند میں لگتا ہے برائی ہونے لگی ہے۔ جیسا ایک دم ہوش میں آتی ہوں تو جسم بہت کمزور لگتا ہے یعنی weakness محسوس ہوتی ہے۔

ورنہ کبھی بیداری میں تصور میں لگتی ہوں تو وزن ہو جاتا ہے ۔
پھر میں صرف قلب پر توجہ کرتی ہوں اور آپ کا نام مبارک ذہن
میں ہوتا ہے ۔ اور حضرت جی ڈر لگتا ہے کہ اگر میں نے قلب
سے توجہ ہٹائی تو جیسے میں فنا ہو جاؤں گی ۔ پھر کچھ دیر کے
بعد جا کر مجھے ہوش آتا ہے ۔

اس کے ساتھ ہی same پہلی شکل تھا ۔ اب میرا ماہ
تقریباً کئی دفعہ ایسا ہو جاتا ہے ۔ پہلے چھ سال پہلے ایسا
ہوتا تھا پھر Gap پڑ جاتا ۔ لیکن وقفہ وقفہ سے ہوتا رہتا
مگر اب جو یہ ~~شدید~~ شدت اختیار کر چکا ہے ۔ اس کے بعد مجھے
کمزوری کی تکلیف بھی ہو جاتی ہے ۔ حضرت جی بہت مصیبت میں ہوں ۔
مجھے نیند سے خوف ... آنے لگتا ہے ...

دوسرا میں دن بدن بہت ... موٹی ہوتی جا رہی ہوں ۔ اصلی وجہ
سمجھ سے بالاتر ہے ۔ خوراک بھی نارمل ہے ۔ گردوں کی تکلیف البتہ
مجھے رہتی ہے ۔ کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ Bladder Stone
ہے ۔ لیکن الٹرا ساؤنڈ کے مطابق بائیں گردے میں ریت کے چند ذرات
تھے ۔ میں نے اپنا سارا مسئلہ تفصیلاً" آپ کو لکھ دیا ہے ۔ اور یہ ایسا مسئلہ
تھا کہ مجھے لکھتے ہوئے شرم آتی تھی ۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ سوائے آپ
کے اس مسئلہ کا حل کوئی اور نہیں کرے گا ۔ آپکی دعاؤں ہی سے میں
ٹھیک ہوں گی انشاءاللہ ...
خداوند کریم آپکا شفیق اور ہمدرد سایہ ہمارے سروں پر تا دیر قائم
رکھے آمین ثم آمین ۔

والسلام !
آپکی دعاؤں کی طلبگار
[illegible]

911

یا شیخ ثانی

گوجرانوالہ
۱۳ فروری ۱۹۹۶

واجب الاحترام جناب شیخ الکرم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
طالب خیریت بخیریت۔

اس وقت رات کے ایک بج کر دس منٹ ہو گئے ہیں۔ مگر نیند یوں لگتا ہے جیسے روٹھ گئی ہو۔ تراویح سے فارغ ہو کر سونے کی لاکھ کوشش کی مگر بے سود سوچا کیوں نہ یہ اوقات مطالعہ میں کام زندہ کر دوں شاید نندیا مہربان ہو کر پاس آ جائے۔ طور مطالعہ کر کے اپنی لائبریری میں سے کسی کتاب کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا کہ "آس جزیرہ" ہاتھ لگ گئی۔ پہلے شعر نے ہی نہاں خانہ دل کے تار یوں چھیڑے کہ شب ہجراں کی لذتوں کا گویا زندگی میں پہلا بار احساس ہوا ہے

"اس جزیرہ ڈوب چلا ہے مگر آثار ترہات ہے
بچھڑے ملیں تو خندہ ہاروں کو بوسہ کر کے دیکھلائے"

اور جب اس شعر پر پہنچا تو تڑپ کر رہ گیا

"آج جی جاؤ کہ ڈھل رہا ہے دن
دشت ہجراں میں شب نہ ہو جائے"

مگر کھوئی ہوئی عظمتوں، روایتوں اور برکتوں کا خزانہ جو کہ دل میں چھپا پڑا ہے اور جس محسن نے یاد دلبر میں دل کو تڑپنے کا سلیقہ سکھا دیا ہو ان سے معذرت کے ساتھ میں شعر کو یوں گنگنا رہا ہوں

"آج جی جاؤ کہ ڈھل رہی ہے شب
دشت ہجراں میں سحر نہ ہو جائے"

نیند نے دور ہو کر کتنا بڑا احسان کیا ہے مجھے "اس جزیرہ" میں مقید کیفیات کی لذتوں سے آشنا کر دیا۔ آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی کے اثرات سے اس جزیرہ کے اوراق بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو واقعی تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ......

وہ قید ہونا مبارک سعادت ہے
اپنی زنجیروں میں تم اگر کر لو!
بھول جاؤں گا جو ہوا اب تک
کر لو مجھ پر مبارک نثار کر لو
دل کی وادی حسین وادی ہے
تم جو چاہو تو اس میں گھر کر لو

اور آخری پیغام نے تو تڑپا کر رکھ دیا

* زمانے کو دے تیرا پیغام سحاب
یہ تمام زمانے پہ اللہ کی شاہی۔۔

اب نیند کیسے آئے۔ کاغذ قلم نکالا اور اب آپ سے مخاطب ہوں۔

یہ بھی ایک المیہ ہے جب سے آپ سے نسبت ہوئی ہے آپ سے بذریعہ خط مخاطب ہونے کی جرأت * کے فقدان کی شدت سے احساس رہا ہے۔ کئی بار ناکام کوشش کی مگر کاغذ قلم کو تھوڑی دیر پکڑتا تو عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی گویا کہ تحریر کے آداب سے نابلد ہونے کی شدت سے احساس ہونے لگتا۔ اور دل کی دھڑکن بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

پیرول سے

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یاد آیا

اور کچھ عرصہ سے تو عجیب سی کیفیت ہے جس کا نامعلوم شاعر نے یوں اظہار کیا ہے

"پتلی کی طرح آنکھ میں بٹھا لوں تجھ کو
نہ کسی غیر کو دیکھوں نہ دکھاؤں تجھ کو۔"

عارض نمبر

آج کل میری ڈیوٹی راولپنڈی میں لگی ہوئی ہے اور ایک بڑی کٹھن ذمہ داری دی گئی ہے۔ ڈیفنس فنڈز میں اربوں کا گھپلہ ہوا ہے اور کئی ایجنسیاں تحقیق کے بعد تھک ہار کر بیٹھ گئیں یا یوں سمجھئے کہ معاملہ ٹھپ کر لیا۔ بالآخر Head of the Deptt کی نظر انتخاب مجھ ناچیز پر پڑی اور صاحب نے کہا "مرتا کیا نہ کرتا" رخت سفر باندھا اور 28/1/97 کو جا کر راولپنڈی ڈیرا لگا لیا۔ اپنی ٹیم کو دو ساتھیوں تک محدود رکھا اب اپنے حلقے کا ایک ساتھی بھی شامل ہو گیا ہے جو جیسے میرے ہی محکمہ سے منسلک ہے۔ جس دفتر کا آڈٹ کرنا تھا انہوں نے کاغذات دینے سے تحریری طور پر انکار کر دیا۔

میں نے صورت حال سے حکام بالا کو آگاہ کر دیا مگر وہ لغیہ تھے کہ یہ کچھ بھی نہیں گھپلے کی نشاندہی فراہم کرتا ہے۔ اب جہاں جہاں کاغذات ملنے کی توقع تھی بسیار کوشش کے بعد یہ تلخ حقیقت واضح ہوئی کہ بڑی ہیرا پھیری ہے۔

نشاندہی کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہے اور یہ کام
پوری تیزی سے جاری ہے۔ اس کامیابی پر بجائے خوش
ہونے کے زیادہ پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے رہ رہ کر احساس
ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی رہنمائی کی بجائے کاوش میں ساری
انسانیت کی ہدایت کا سوال کرتا [illegible] تو کتنا
اچھا ہوتا گویا میں نے اتنی قیمتی چیز کا واسطہ دے کر بڑی
کم قیمت چیز مانگنے پر اکتفا کر لیا ہے مگر اب یہ کوتاہی ہو گئی
ہے سوائے پچھتاوے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

ان شاء اللہ آج لاہور جانے کا ارادہ ہے اپنے کنٹرولر سے
میٹنگ ہے امید ہے کہ آپ کی واسکٹ بھی تیار ہو گئی ہوں گی
آج شام کو واپسی پر لے آؤں گا۔ رات کو گوجرانوالہ تیاری کے لیے
کل راولپنڈی روانگی ہو گی اور ان شاء اللہ جمعۃ المبارک کو آپ کی
قدم بوسی کے لیے حاضری کا ارادہ ہے۔

ماجد حسین نے آپ کی واسکٹ ناپ کے لیے دیتے وقت
بار بار اس فقرے کو دہرایا کہ یہ امانت ہے اس کو واپس ضرور
کریں مگر میں امانت میں خیانت کے جرم کی سزا سے نابلد ہوں
اور یہ جرم ہی عجیب ہے اس کی سزائیں اور ہی ہیں۔
اب سونے کا وقت ہو رہا ہے اس لیے اجازت چاہتا ہوں

والسلام
طالب دعا احقر فضلاً آپ کا خادم
محمد خان جونیجو

تمیزہ کا کیا حال ہے۔ بڑی خوش نصیب ہے
بس یہ وقت شیخ کی صحبت نصیب ہے
[illegible] دیر ہو رہی ہے اس کو سلام

تمام نشانات مٹ چکے ہیں۔ اب میری کیفیت یہ تھی کہ
جیسے بند گلی میں مجبور و بے بس کھڑا ہوں۔

قتیل عاجز

بند گلی میں آ کے کیوں واپس اب تم جانا سیکھو گے
رستے ہیں مسدود یہاں سب جو رستہ تم اب پانا سیکھو گے

بڑا سوچا کچھ سمجھ نہیں آتا تھا۔ بالآخر رات کے ایک بجے رب کریم کی باعظمت ذات کا دروازہ کھٹکھٹایا اور میرے پاس اسوقت جو سب سے قیمتی چیز موجود تھی اس کا واسطہ دیا۔ اور وہ تھی اپنے شیخ کی واسکٹ"۔ ہوا یوں ۲ فروری کو جمعہ کی نماز کے بعد آپ سے ~~شیخ~~ اجازت لے کر جب واپس گوجرانوالہ آنے لگا، تو تھا ماجد بھی میرا ہمسفر ہوگیا۔ گوجرانوالہ پہنچ کر اس نے مجھے دو واسکٹ کا کپڑا اور ایک واسکٹ ناپ کے لئے دی کہ میں کسی اچھے سے درزی سے سلوا کر آپ کو بھجوا دوں۔ گوجرانوالہ تو میری نظر میں کوئی خوش ذوق درزی نہ تھا لہذا لاہور انار کلی میں اسحاق ٹیلرز کو یہ ذمہ داری سونپی۔ کپڑا درزی نے رکھ لیا اور ناپ کے بعد واسکٹ مجھے واپس دے دی جو میں راولپنڈی ساتھ ہی لے آیا۔ چنانچہ اس واسکٹ کا واسطہ دے کر جب رب سے گڑگڑا کر درپیش مسئلہ میں رہنمائی کی درخواست پیش کی تو جیسے دل و دماغ میں ایک بجلی سی کوندی اور الجھی ہوئی ڈور کا ایک سرا میرے ہاتھ لگ گیا۔ جس سے میں نے اپنی تحقیق کا آغاز شروع کر دیا اور اب تک گویا ۲ ارب

بابِ عکسِ تحریر

WILLS WORLD CUP 1996

حضرت اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ

حضرت کے ساتھ میری رفاقت زندگی کے پچیس طویل سالوں پر محیط ہے میں نوجوان تھا
مگر خاندانی اور ماحول کے اثرات قبائلی جھگڑوں اور بے سکون زندگی کے پریشان
کن دور نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا مجھے بنیادی طور پر سکون کی
جستجو تھی جہاں زندگی میں ٹھہراؤ ہو اور ایک حسن آ جائے جہاں کرب و الم کا
گزر نہ ہو تھا مگر یہ کہ حالات عالم کو بدل دینا تو ممکن نہیں دکھوں کو چھپاؤں
مگر کیا ایسا ہو سکتا کہ دکھ کا ازالہ ہو جاتا ہے اور یہ سب ہو رہا ہے کہ انگ
انسان بعض حالات کے دھارے میں بہنے کے لیے نہیں ہے بلکہ اسے بہت زیادہ
ملے ہیں کہ حالات کا مقابلہ کرے اپنا تحفظ کرے اپنے لیے گھر
بنائے جو طوفانوں اور بارشوں سے اس کی حفاظت کر سکے اور یہ سب کچھ
تو میرے پاس تھا مگر صرف جسم تو انسان نہیں اس کے اندر ایک انسان ہے جو زیادہ
حساس اور زیادہ نازک ہے جیسے بعض الفاظ بھی تیروں کی طرح چبھتے
ہیں اور بعض باتوں سے اس پر آندھیاں چلتی ہیں کوئی گھر اس کے سکون

سے ہوتی ہے معیار اسکی خاطر سکون کا کوئی لمحہ موجود ہے میں دیر آید کہ مگر یہ سب

وقتا فوقتا تھا زمانہ قرآن پاک کو سمجھنے کیلئے تیار نہ تھا اور مجھ کو ابھی

کسی شدید ترین محبت سے آگے ابھی عرفان سے دور مگر شاید وہ

ان احساسات سے بھی عاری تھے

حالات اور وقت ایک محفل میں لے جانے کا سبب بن گئے وہاں

میر مجلس حضرت جی ؒ تھے ایک سادہ دیہاتی مگر بلا کا سلیقہ الاسکن

میں شخصیت کے ساتھ دوست سے ایک ماننے والا گٹھیلا بدن گندمی رنگت

گھنی داڑھی کشادہ پیشانی روشن آنکھیں مگر بلا کی ہمت کا سمندر

ہر بات معلوم کا قرآن کا ہر ہر لفظ میں ادب کی چاشنی اور ہر ادا میں

درد دل

تب وہاں دل اٹک سا گیا اور الحمدللہ کہ اٹک گیا دھوکے پلٹ کے بیٹھے

ذہنی قدموں میں میری زندگی میں انقلاب آیا اب اس بات کو لکھنے

ضرورت ہوتے کو آگاہی ہے کہ حضرت کے ملنے کی خوشی چھپی کبھی نہ رکھی گو

یونہی واسطہ انبیاء علیہم کو رہا ہے اور آپ کے قلب کی تنویر سے بھی حضرت کو حق پہنچا

چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے لیکن نہ برکات اور ختم ہو سکتی ہیں

یہ جو دامن سے وابستہ ہوا اسے آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے

دامن کمال سے وابستہ کر دیا اور وہاں خزانہ رب کریم کا ہے

اللہ کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم رہا ہے نہ صرف مجھ جیسے کو ہزاروں کو

وجود کے اندر گھر اور اندر سے انسان بنا دیا ہر کسی جو جسم اور

دماغ کا رخ الیہ پھیر دیا کہ دنیا کے مصائب اپنا تمام

تر سختی اور درشتی کے باوجود تو کچھ ذکر نہیں بگاڑ سکے۔ اللہ کریم

آپ کے درجات ہمیشہ بلند فرماتا رہے اور آپ کے عالی قدر کو سلامت رکھے، یہ فیض آپ کا

زمانہ کو رہے۔ آمین

احقر محمد اکرم اعوان عفی عنہ

WILLS WORLD CUP 1996

کبھی دوست کی سرکشی سے ڈرنے نہیں دیتا
جینے نہیں دیتا مجھے مرنے نہیں دیتا
جو چپکے سے لکھا کر شاید یادوں کا صحیفہ
وہ ہاتھ میری زلف سنورنے نہیں دیتا

چاندنی شب رنگ زیور کا سمٹ
خالی محمل ساربان تیرے بغیر

درد کا عالم ہے عجب معلوم نہیں
آج اداسی کا سبب معلوم نہیں

WILLS
WORLD CUP
1996

ان سے ملنا حیات ہے لیکن
یاں بچھڑنے کی بات ہے لیکن

میں اکیلا ہوں دشتِ ہجراں میں
غم تمہارا بھی ساتھ ہے لیکن

درد دل نازؔ شکوے میں
اس میں میرا بھی ہاتھ ہے لیکن

سلسلے منتشر ہیں کرب و بلا میں بیتا ہوں
دل میں میرے فرات ہے لیکن

قافلے میں حسین ہو کر بھی
سر کٹانے کی بات ہے لیکن

یہ بتا مجھ کو جینے کی
جینا مرنے کے ساتھ ہے لیکن

جو سر دار بھی وہی قصہ
عشق و مستی کی بات ہے لیکن

جرم ہے آرزوؤں کی شعلہ گری
خواہشوں پہ عتاب لازم ہے
حسرتوں کا شمار ناممکن
اِن خطوں کا حساب لازم ہے

پیرہن خوشبو کا اوڑھا تمہاری یاد نے
ہر کسی کا بھی زنجیر اسے تمہاری یاد نے
دیکھنے افکار ذہن کی قوسِ قزح میں جتنے خواب
لشکروں کو جیسے چھوڑا اسے تمہاری یاد نے

پیار میں خوشی کا اوڑھا ہے تمہاری یاد نے
یوں کہیں کا بھی نہ چھوڑا ہے تمہاری یاد نے

اس حیاتِ بے رنگ میں تقدیر بنے ہو
اب لگے یہ رشتہ توڑا ہے تمہاری یاد نے

کتنے افکارِ زمانہ کتنے سر جیں کتنے خواب
لشکروں کو کیسے موڑا ہے تمہاری یاد نے

یہ ہے بیکار سلجھے تقدیر قسمت پا گیا
دل کا رشتہ تم سے جوڑا ہے تمہاری یاد نے

من آمد

انکار سے اقرار تک!

وہ گڑیوں سے کھیلنے' تتلیوں کو پکڑنے اور جگنوؤں کو مٹھی میں لے کر خوابوں کی پریوں سے آنکھ مچولی کھیلنے کی عمر تھی۔

وہ پھولوں کی کیاریوں میں خوشبوؤں کی دھنک بونے اور ماما کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں روشنیاں اوڑھ کر سونے کی عمر تھی۔ وہ عمر بڑی معصوم' بے خبر اور بے دھیان عمر تھی۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے' دکھ جو تمام کے تمام' گھر ماں' اسکول اور بہن بھائیوں سے جڑے ہوئے تھے۔ اس عمر کی ایک اپنی ہی سنہری دنیا ہوتی ہے' جس میں' میں بڑی موج سے جی رہی تھی۔ کانونٹ اسکول تھا۔ بہت سی ہمجولیاں تھیں' اسمبلی سے Singing Period تک' اور مس منان سے سسٹر مارتھا تک' کی مصروفیات میں' یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی کہ اسکول کی لال اینٹوں کی اونچی دیوار کے باہر ایک تارکول کی سیاہ سڑک بھی بچھی ہوئی ہے جس پر ہمہ وقت رنگ رنگ کا ٹریفک گزرتا ہے۔ گاڑیوں اور بسوں کے ہارن کی تیز آوازیں بھی گونجتی

ہیں۔ تانگوں کے پہیوں کی چرچراہٹ اور گھوڑوں کے سموں کا ردھم بھی بہتا ہے۔ سائیکل سواروں کے تیز تیز پیڈل چلانے کی آوازیں بھی ابھرتی ہیں۔ ٹھیلوں اور خوانچے فروشوں کی صدائیں بھی چلنے والوں کے قدم روک لیتی ہیں۔ جہاں بہت سارے لوگ ڈھیروں خواہشوں' خوشیوں محبتوں' نفرتوں اور دکھوں کی پوٹلیاں باندھے 'ہمہ وقت زندگی کے ساتھ مکالمہ کرتے ہیں۔ جہاں زندگی سوتی ہے تو لوگ جاگتے ہیں۔ زندگی جاگتی ہے تو لوگ سونے لگتے ہیں۔ تارکول کی وہ سیاہ سڑک Singing Hall سے صاف نظر آتی تھی۔ مگر میرے لئے اسمیں کوئی اٹریکشن نہ تھی۔ بلکہ بڑی بور لگتی تھی وہ مجھے۔ مجھے ساری اٹریکشن تو Singing Hall میں نظر آتی تھی۔ جہاں ایک پرانے شاندار پیانو کو سسٹر مارتھا کی ماہر انگلیاں جب چھیڑتی تھیں تو اس کے سر سیمنٹ کی دیواروں کے مساموں سے جھرنوں کی طرح پھوٹنے لگتے تھے۔ ہم سب وجد میں آکر باآوازبلند' سر میں سر ملا کر

Twinkle Twinkle little Star
How I wonder what you are

Humpty Dumpty Set on a wall

گانے لگتے۔

گاتے گاتے ہماری آواز مدہم پڑنے لگتی تو جرمن Singing Teacher اپنی پاٹ دار آواز میں' ہماری کمزور پڑتی آوازوں کو سہارا دینے کے لئے ہم میں شامل ہو جاتی۔ اور ہم جوش و خروش سے یوں گانے لگتے کہ ہال سے باہر سیمنٹ کی اونچی مضبوط دیوار اور اس کے آگے بچھی ہوئی سیاہ تارکول کی سڑک تک کو معلوم ہو جاتا

کہ "اسکول میں Singing Period چل رہا ہے۔

میرا بے نیازانہ خو بو رکھنے والا زمیندار باپ اور حد درجہ حساس اور مہربان ماں' ہمیں بہتر انسان بنانے کی جدو جہد میں پورے جان و دل سے لگے ہوئے تھے۔ بھلوال کے کوٹ فضل احمد سے سرگودھا کے سیٹلائٹ ٹاؤن تک کا راستہ انہوں نے اپنی محبتوں کی کہکشاؤں سے ہمارے لئے یوں روشن کر رکھا تھا کہ کبھی کسی اندھیرے سے سابقہ ہی نہ پڑا۔

پیانو کے سروں سے گھر کی پر تحفظ دیواروں تک پہنچنے کا یہ سفر بڑے مزے اور سہولت سے طے ہو رہا تھا۔ کہ ایک عجیب مسئلہ پڑ گیا۔ اس مسئلے کو عجیب میں اس لئے کہوں گی کہ "گیارہ برس کی عمر' ذہنی فراغت اور خوشحالی کا دور' بچپنے کی معصوم بے فکری اور خارجی طور پر بے پناہ آسانیاں' ان تمام عوامل کی موجودگی میں 'ایسے مسئلے کے پیدا ہونے کا بظاہر تو کوئی امکان نظر نہیں آتا' مگر شاید بعض چیزیں ہوتی ہی ہمارے امکان سے باہر ہیں اسی لئے وہ عجیب اور ناقابل فہم لگتی ہیں۔ اب بھی سوچوں تو حیرت ہوتی ہے کہ آخر وہ سب کیا تھا' کیوں ہوا تھا' جس نے پانچویں درجے کی ایک عام سی بچی کو' حسی' ذہنی' قلبی اور روحانی طور پر ہلا کر رکھ دیا۔۔۔۔۔۔ وہ لڑکی اس وقت اپنے بھائیوں کے ساتھ صحن میں وکٹیں گاڑے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھی۔ سامنے جامن کے پیڑ تلے چولہا رکھے' بابا رشید رات کا کھانا بنا رہا تھا۔ خدمت خلق اور غریب رشتہ داروں سے محبت کی دلدادہ اسکی ماں' حسب معمول محبتوں کی ریت نبھانے کسی بیمار رشتہ دار کو ہسپتال لے کر گئی ہوئی تھی۔ اسکا اپنی ذات کے اندر گم رہنے والا بے نیاز باپ' گرم دھسے کو تمبو کی طرح اپنے گرد تانے اس کے حصار میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس اثناء میں چھوٹے بھائی کی گیند سیدھی وکٹ کی طرف بڑھی' بیٹ پکڑ کر مستعد کھڑی لڑکی یکایک ڈھیلی پڑ گئی' بال روکنے کے بجائے'

اس نے اسے یوں انجان نظروں سے دیکھا' اسکی جگہ جیسے کوئی اور کھیل رہا ہو' میں نہیں کھیلوں گی اچانک بیٹ کو زمین پر پھینک کر وہ بھاگتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی بھائیوں کو ششدر چھوڑ کر 'کیا ہوا' کچھ بتاؤ تو سبھی پیچھے سے پوچھتے ہی رہ گئے۔

خدا کیا ہے ؟ ایک سوال تھا' جو آندھی کی طرح اٹھا اور سارے پر غبار کی طرح چھا گیا۔ وہ اس میں خشک پتے کی طرح اڑنے لگی۔ وہ سوال بڑا مشکل ٹیڑھا اور ان سنا تھا۔ اسے تو وہ ان کہا بھی لگتا تھا۔ اس لئے کہ وہ تو ابھی اس بنیادی سوال سے بھی قطعاً انجان تھی کہ "وہ خود کیا ہے" کجا یہ کہ خدا کیا ہے" جیسا پر ہیبت سوال۔ یہ کہاں سے آیا' کیوں آیا اور کیسے حل ہو گا' یہ مسئلہ بعد کا تھا۔ ابھی تو مشکل یہ تھی کہ اس گُنجلتا کا کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا جو ذہن پر کوڑیالے سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔

--------وہ ساری شام' ڈریسنگ روم کے ٹھنڈے فرش پر اس نے بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ رات گرم رضائی کی حرارت سے لپٹتے ہوئے' کمرے کے واحد روشن دان سے آنے والی اجالے کی ننھی لکیر کو دیکھتے ہوئے' چھت کے کونے سے پھڑ پھڑاتے مکڑی کے جالے کے تار و پود گنتے ہوئے' وہ بار بار اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔ خدا کیا ہے ؟ کدھر ہے' کیسا ہے' ہے بھی کہ نہیں' اگر ہے تو دکھائی کیوں نہیں دیتا' اگر ہے تو سنائی کیوں نہیں دیتا۔ ہم اندھے اور بہرے تو نہیں' پھر کیوں ؟ آخر کیوں ؟ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اسکا منہ چڑانے لگتا۔ وہ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ دن اسی ادھیڑبن میں گزر گیا۔ دوسری رات آگئی۔ وہ رات بھی پچھلی رات کی طرح روشنی کی ننھی لکیر' رضائی کی حرارت اور مکڑی کے جالے کے تار و پود گنتے تمام ہوئی۔

--------اگلی صبح اس سوال سے لڑتے لڑتے وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ کلاس میں انگریزی کا پیریڈ چل رہا تھا۔ مس چاند ڈکٹیشن لے رہی تھی۔ ساری کلاس کا پیاں

کھولے ان پر جھکی پڑی تھی' اسکے سامنے کھلی کاپی پر لفظوں اور نقطوں کا جال سا بچھ رہا تھا۔ خدا کیا ہے' ہر نقطے سے آواز آ رہی تھی۔ خدا کیا ہے' ہر لفظ بول رہا تھا۔ خدا کیا ہے کوئی اس کے اندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دہائی دینے لگا۔ مس چاند کی آواز پاتال سے آنے لگی۔ لکڑی کے براؤن ڈیسک کے پائے جھنجھنا رہے تھے' کلاس روم کی کھڑکی سے باہر دسمبر کی ٹھنڈی میٹھی کندنی دھوپ رنگ بدل رہی تھی۔ کوئی نادیدہ ہاتھ روشنیوں کو سیاہی کے برش سے پینٹ کر رہا تھا۔ سارے منظر پر دھندلی سی سرمئی چادر تن رہی تھی۔ عین اسی وقت اس لڑکی نے سینے پر ہاتھ رکھا' وہ بے اختیار اپنی سیٹ سے اٹھی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑائیں" "مس میرا دل" اس کے مونہہ سے نکلا اور وہ ڈیسک اور کرسی کے درمیان اوندھی ہو گئی۔

---------لو بلڈ پریشر ہے' اس کی ڈائیٹ کا خیال رکھیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ جرمن ڈاکٹر کی اردو ترجمان اور اسٹنٹ مقامی کرسچن سسٹر ٹریسا نے ماں کو تسلی دی۔ شاید آج آپ کی بیٹی نے ناشتہ نہیں کیا اسی لئے' حد درجہ متفکر کھڑی ماں نے سسٹر کی بات سنی تو انہیں خیال آیا کہ پچھلے دو دن سے وہ کچھ کھا نہیں رہی تھی۔ جب یہ خیال آیا تو ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ دو دن سے صحن میں گڑی وکٹوں کے گرد خاموشی ہے۔ بیٹ برآمدے کے ستون کے ساتھ رکھا ہے۔ اور بال کہیں نظر نہیں آیا' اور تو اور اس باتونی لڑکی کی آواز کی گونج بھی کہیں سنائی نہیں دی' جسے وہ ڈانٹ کر بمشکل چپ کرایا کرتی ہیں۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کریں ذہن پر کوئی بوجھ ہے۔ سسٹر ٹریسا نے مسکن دوائیاں پکڑاتے ہوئے چپکے سے ماں کو کہا تو ان کے چہرے کی لکیروں میں ایک چھپے ہوئے دکھ کی پرچھائیں سلگ اٹھی' محبتوں کے سائے میں پروان چڑھتی' پانچویں جماعت کی بچی کو کیا دکھ ہو سکتا ہے بھلا' جیپ میں اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں۔

وہ دکھ گیا تھا۔ اس کی حقیقت کیا تھی' ماں ہوتے ہوئے بھی وہ جان نہیں سکی تھیں۔ اس لئے کہ وہ کچھ اتنا ناقابل فہم 'انوکھا اور ان کہا تھا کہ اس سے اس کی شرح ممکن ہی نہ تھی۔ دوائیاں باقاعدگی سے دی جاتی رہیں۔ ڈائیٹ کا بھی خصوصی خیال رکھا گیا۔ اسے خوش رکھنے کے بھی ممکنہ طریقے اپنائے گئے۔ مگر اس کی حالت میں بہتری نہ ہوئی۔ بیٹھے بیٹھے دل سے تلاش انجی اندر خالی پن کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا۔ منظر پر ایک دم سے غبار چھانے لگتا۔ اور وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر دوہری ہو جاتی۔ سورج ڈوبنے کے بعد کا وقت اس پر بہت بھاری ہوتا' سینے کی گھٹن اور سوالوں کی اندھی بازگشت اسے بے حال کر دیتی۔ پیشانی سے پسینہ پھوٹتا تو پاؤں کی ایڑیوں تک بہنے لگتا' آنکھوں کے سامنے زمین کی گردش کے سارے زاویے واضح ہونے لگتے۔ اور بے بسی کے عالم میں 'ہائے میرا دل' ہائے میرا دل کہتی ہوئی برآمدے کے ستونوں سے سر ٹکرانے لگتی۔

لو بلڈ پریشر کو بیماری سمجھ کر پوری تندہی سے علاج کرنے والی ماں نے بچی کی یہ کیفیت دیکھی تو پریشان ہو گئی۔ اسے لگا معاملہ وہ نہیں جو نظر آتا ہے بات کچھ اور ہے۔ کہیں اس پر آسیب کا سایہ تو نہیں ہو گیا۔ یہ خیال آیا تو وہ کچھ اور الجھ گئیں۔ ان دنوں انہیں ایک اور بھی مسئلہ درپیش تھا۔ وہ چند ماہ پہلے اپنی گیارہ سالہ بچی کا رشتہ بھی طے کر بیٹھی تھیں۔ اس سلسلے میں اس کی منگنی کی رسم کا اہتمام بھی دھوم دھام سے ہو چکا تھا۔ اگر اس کے سسرال والوں کو ان دوروں کی خبر ہو گئی تو کیا ہو گا۔ یہ خیال ان کے لئے سوہان روح تھا۔

پھر ایک شام ماں نے بیٹی کو سامنے بٹھالیا۔ وہ بڑا عجیب وقت تھا' جب سینتیس سالہ مدبر ماں اپنی گیارہ سالہ ناسمجھ بیٹی سے Conversation کر رہی تھی۔ تمہیں ہے کیا مجھے یہ تو بتاؤ' ماں بیٹی کے بکھرے بالوں اور پیلے چہرے کو

تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ بھی تو نہیں' بیٹھی دسمبر کی سرد شام بھیگی ہوئی ہتھیلیوں کو قمیص کے دامن سے خشک کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ کچھ تو ہے بیٹا جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو' کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اپنی منگنی سے ناخوش ہو۔ ماں کے سینے کے اندر دہشت کرتا ہوا سوال لب پر آ گیا۔ تو نم آنکھوں والی اس چھوٹی سی لڑکی کے ہونٹ پھیل گئے۔ نہیں ماں' ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ تو پھر کیا ہے۔ کیوں پریشان ہو تم' تمہیں خبر ہے تمہاری وجہ سے مجھ پر کیا گزر رہی ہے' ماں پھٹ پڑی۔ تو سامنے بیٹھی بیٹی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ لال پھولوں والی شموز کی قمیص کا دامن ان قطروں سے بھرنے لگا مجھے کیا پتہ مجھے کیا ہے' لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلے اور کمرے میں پتنگوں کی طرح اڑنے لگے۔ وہ روئے چلی گئی' اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ ماں اسے پریشان نظروں سے دیکھتی اٹھ گئی۔

اگلی دوپہر اسکے دوست بھائی نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ تو احساس جرم جیسے ایک وزنی لمحے کے نیچے دبی ہوئی اس لڑکی نے آنکھیں بند کر کے لرزتے ہوئے کہا۔ بھائی مجھے ڈر لگتا ہے' بہت گناہ کی بات ہے یہ۔ گناہ کی بات' بھائی چونکا' اس نے اپنی چھوٹی سی بہن کی طرف حیرت بھری پریشانی سے دیکھا۔ کیسا گناہ' کیا کہہ رہی ہو تم۔ میں نے کچھ نہیں کیا بھائی یہ خود بخود ہو گیا ہے' چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دوسروں کو یہ مصیبت کیوں نہیں لگی' صرف مجھے ہی کیوں' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی' کیا ہو گیا ہے' کچھ بتاؤ تو سہی' بھائی اس کے ناقابل فہم رویئے سے الجھ گیا تھا۔ خدا کیا ہے؟ ایک چیخ سی اس کے مونہہ سے نکلی اور اعتراف گناہ کے تند آرے نے اس کا وجود دو ٹکڑے کر دیا۔
بھائی ایسی عجیب و غریب سچویشن کے لئے کب تیار تھا' وہ گھبرا گیا۔ خدا کیا

ہے "اگر یہ سوال غور طلب تھا بھی تو ابھی قبل از وقت تھا۔ پھر یہ گیارہ سالہ لڑکی کیوں ہلکان ہو رہی ہے' وہ پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس سوال کا جواب تو نہیں پتا تھا کیا جواب دینا ہے، جانتا تھا یا نہیں مگر اس نے بہن کو اس ذہنی اور قلبی الجھن سے نکالنے کی کوشش ضرور شروع کر دی۔ وہ جب سنبھلی تو اسے سامنے بٹھا کر اس نے کہا۔ میری ایک بات مانو' تم سوچنا چھوڑ دو کیسے ؟" اس نے پلکوں کے کناروں پر جم جانے والی نمی کی برف کو انگلیوں سے چھوا "بس ایسے کہ جب بھی ذہن میں سوچ آئے اسے جھٹک دو اور کاغذ قلم پکڑ کر اس پر لکھنا شروع کر دو۔ سوچے سمجھے بغیر لکھتی جاؤ" بس لکھتی جاؤ" پھر اس نے ذیل کارنیگی کی کتابیں لا کر دیں "انہیں پڑھو گی اس طرح میں ٹھیک ہو جاؤں گی" لڑکی کے چہرے پر پل بھر کو چمک لہرائی۔ امید تو ہے' بھائی نے صدق دل سے جواب دیا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ اس ناقابل بیان تکلیف سے لڑنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ بہتر ہوتی چلی گئی۔ ماں نے دواؤں اور وظیفوں کا اثر سمجھا۔ بھائی نے اپنی کوششوں کا نتیجہ جانا اور اس نے خود جب اس موضوع پر سوچنا چاہا تو ذہن خالی تھا' دل کے اندر جھر جھر بہنے والی والی تکلیف کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ سینہ خالی زمین کی طرح بج رہا تھا۔ سڑک کی راس رچانے والا اپنا اکتارہ اٹھائے کہیں دور جا چکا تھا۔ اب وہ اکیلی تھی۔ صحت مند تھی ۔ نارمل تھی۔

---- پھر بہت سارا وقت گزر گیا' زندگی زمانی طور پر آگے بڑھتی رہی' عمر بڑھی' شعور پنپتا ہوا' آنکھوں نے کئی اونچ نیچ کے منظر دیکھے' ہوش نے خبر اور بے خبری کے درمیان کئی کروٹیں بدلیں' اس دوران مجھے دو دفعہ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ بیت اللہ کی حاضری کے دوران تمام وقت اک ایسی گم کیفیت تھی' جس نے میری روح کو پوری طرح اپنے زیر اثر رکھا ہوا تھا' پاؤں رکھتی کہیں تھی۔ پڑتے کہیں

تھے۔ دیکھنے کی کوشش میں آنکھیں اپنے مرکز سے کٹنے لگتی تھیں۔ اک ایسا چشمہ میرے اندر پھوٹ بہا تھا' جس کا ایک سرا نمکین پانی والے گہرے سمندروں سے کہیں جا ملتا تھا۔ جو مجھے ہر وقت غرق کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ وہاں جا کر میں اپنے آپ سے کٹ گئی۔ کچھ اس طرح کہ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ کس منطقے سے آئی ہوں' اور میرے پیچھے کن خوابوں کی پرچھائیاں رقص کرتی ہیں' کون زمین ہے۔ جہاں کبھی ریت کے گھروندے میں کچھ سیپیاں چن کر رکھی تھیں جواب صدف اگلنے کے لئے تیار تھیں۔ مگر میں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

کالے کوٹھے کی اونچی دیواروں کی طرف دیکھتے ہوئے میرا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا' کوئی وہاں میری چوری پکڑنے کے لئے بیٹھا ہے' وہ چوری جو پہلے آنکھیں کرتی ہیں اور بعد میں دل مجرم بن جاتا ہے۔ میں چپکے چپکے چادر کی اوٹ سے رب کے اس گھر کی طرف دیکھتی جو اک عرصہ میرے خوابوں سوچوں اور دعاؤں میں میرے ساتھ ساتھ رہا تھا' تو مجھے محسوس ہوتا' کسی نے ایسی ان دیکھی ڈور سے باندھ رکھا ہے' جسے نہ تو میں کاٹ سکتی ہوں' نہ توڑ سکتی ہوں' جو مجھے اندر ہی اندر کھینچتی رہتی ہے' میں دیکھنا چاہتی ہوں' مگر دیکھ نہیں سکتی۔ جب نہیں دیکھتی تو کوئی میرے اندر جھاتیاں مارتا ہے۔ اکساتا ہے' دیکھو مجھے دیکھو' عجیب جلوؤں اور جلوں کا دور تھا۔ میں کٹی پتنگ کی طرح حرم کے برآمدوں' چوباروں' گلیاروں' محلوں اور صحنوں میں چکراتی پھرتی' ستونوں سے لپٹ لپٹ کر زاریاں کرتی' کہاں ہے' کہاں ہے' وہ جو مجھے نیم لب دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔

کہاں ہے وہ کہاں ہے' جو کٹھ پتلی کے اس رقص کا عینی شاہد ہے۔ کہاں ہے جس نے تلاش کا بھانبڑ میرے اندر جلا کر سارے ٹھنڈے میٹھے پانیوں کے چشموں کے رخ دوسری طرف موڑ دیئے ہیں۔

میں کیا کروں؟ خدا کے گھر میں خدا کو ڈھونڈنے کا مرض لگ گیا ہے۔ مجھے دوا کی تلاش ہے' مگر میرا طبیب تو پردے کی اوٹ میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ تو اس کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا کہ میری ساری سمتیں بند کر کے' میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر' چار دیواروں سے سر ٹکرانے کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ جاؤ' ڈھونڈو' ڈھونڈ بھال کے مجھے پاؤ' اور پھر گنوا دو' یہی بس یہی۔

------------ دونوں دفعہ حج کے دوران ایسی ہی کیفیت سے مکالمہ چلتا رہا۔ دونوں دفعہ مدینے کی ہواؤں نے اس جلن کو اپنے نم جھونکوں سے مٹھانے کی کوشش کی' وقتی تسکین بھی ملی' مگر مدینے کو چھوڑتے وقت' پھر وہی دلدار لمحوں سے دوری کا مسئلہ آجاتا' پھر وہی خانہ بدوشی کا عذاب شروع ہو جاتا' رب اور اس کے حقیقی محبوب کی جدائی آپس میں گھل مل کر ایک ایسے ہجر کو جنم دیتی' جس کا علاج کم از کم مجھ سے تو ممکن نہ تھا۔ مجھے یاد ہے' جب حج سے واپس آتی تو میرے اندر خالی پن کا شور کچھ اتنا زیادہ ہو جاتا کہ بعد میں اک عرصہ لگتا' اس کیفیت سے سمجھوتہ کرنے میں' مجھے اس وقت بھی سمجھ نہیں آتی تھی اور آج بھی سمجھ نہیں آتی کہ آخر حج ہے کیا؟

محض مناسک کی ادائیگی یا عشق کی وارفتگی' محبوب کی گلیوں کی گدائی یا لاکھوں نمازوں کے ثواب کی خود نمائی' دیدار محبوب کی سرخوشی یا جنت میں داخلے کا سرٹیفکیٹ' کیا ہے؟ اسے میری کم ظرفی کہیں یا ناشکری' مجھے تو ہر بار وہاں سے واپسی پر اک نئی پیاس کا سامنا کرنا پڑا' ایسی پیاس جس میں لب چاہے تر بھی ہوں' یخ آب کوثر بھلے دسترس میں ہو' وہ ان حیلوں بہانوں سے بجھتی نہیں۔

میں بدلنا چاہتی تھی۔ نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مگر کس سے؟ اس تلاش سے جس کی چنگاری ایک گیارہ سالہ ناسمجھ لڑکی نے بہت پہلے میرے اندر سلگائی؟

تھی' یا اس انکار سے جو اس لڑکی کے اور میرے درمیان پچھلے دو عشروں سے ناقابل عبور خلیج کی طرح سے موجود تھا اور مجھے کہیں ملنے نہیں دیتا تھا۔

--------- پھر یہ ہوا کہ میں کھوج میں رہنے لگی اس کی' جو مجھے میری تلاش کا ماخذ بتا دے یا پھر اس انکار کے سپرد کر دے' جس نے میری زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔ کچھ تو ہو' درمیان میں لٹکنے کی اذیت سے تو نجات ملے' ایک دفعہ کسی نے پروفیسر رفیق اختر کا بتایا' انہیں کشف ہوتا ہے' کہے بغیر دوسرے کی بات سمجھ لیتے ہیں' مسئلوں کا حل بتاتے ہیں۔ رب کی طرف جانے والے راستے سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ان سے ملو۔

سنگ میل پبلی کیشنز کا دفتر تھا' شہر کے چیدہ چیدہ نکھاری جمع تھے۔ رائل بلیو شلوار قمیض اور نیوی بلیو جدید بلیزر میں کلین شیو ڈگریس فل پروفیسر صاحب بڑے سلجھے ہوئے انداز میں لوگوں کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھی ان کی باتیں بغور سن رہی تھی۔ الجھنیں تو میری بھی بہت تھیں' سوال تو میری ہتھیلی پر بھی کھدے تھے مگر کوئی دیکھتا تو ------! اور جب تک کوئی دیکھتا نہیں دکھانا اپنی خو نہ تھی۔ لہٰذا چپکی بیٹھی رہی۔

چائے کے بعد پروفیسر صاحب آئے اور میرے قریب والی نشست پر آ کر بیٹھ گئے اور اپنے مخصوص انداز میں چند چونکا دینے والی باتیں میرے بارے میں کہیں۔ میں سنبھل گئی۔ میں نے آس پاس محتاط نظروں سے دیکھا' سبھی چائے کی میز کے گرد کھڑے باتیں کر رہے تھے' کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میرے متعلق کی جانے والی اندر کی باتیں' شکر ہے میں نے ہی سنی تھیں۔ آپ وظیفہ کر لیں گی۔ انہوں نے پوچھا۔ جی کیوں نہیں۔ تو پھر ایسا کریں' یہ مختلف اسم الٰہی ہیں' سب کو تین تین سو مرتبہ روزانہ پڑھ لیا کریں۔ انہوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر مجھے لکھ

کر دیا۔ اس سے کیا ہوگا' میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹکڑا بھر کاغذ پر لکھے اسم الٰہی کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ یا رحمٰن' یا رحیم' یا کریم۔ کاغذ بول رہا تھا۔ ہتھیلی بھیگ رہی تھی۔ اس سے زندگی آسان ہو جائے گی۔ پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا 'بس' میرا دل چاہا' میں پہلے زور زور سے ہنسوں اور پھر دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ زندگی تو پہلے ہی آسان ہے پروفیسر صاحب 'اس کی آسانی ہی تو میری مشکل ہے 'آپ کو کیا بتاؤں۔ میں نے اسم اللہ والے پرزے کو مٹھی میں دباتے ہوئے سوچا۔ چھوٹا مونہہ اور بڑی بات میں قدرت اللہ شہاب نے بھی زندگی کو آسان بنانے والے وظائف کا بتایا' مگر ان وظائف کو اپنے معمول کا حصہ بناتے ہوئے کبھی بھی میرے پیش نظر زندگی کی آسانی نہ تھی۔ اس لئے میں نے کبھی بھی آسانی کی دعا نہ مانگی' اس لیئے کہ ایسی دعا مجھ سے مانگی ہی نہ جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہوں تو زیادہ ٹھیک ہوگا کہ مجھے تو سرے سے علم ہی نہ تھا کہ دراصل میری دعا ہے کیا' زندگی کی آسانی' یا آخرت کی نجات' آسائش دنیاوی یا حقیقت دینی' کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کیا مانگنا چاہئے کیسے مانگنا چاہئے؟ میں تو ابھی اسی الجھن میں تھی۔ میری مشکل تو میری بھی سمجھ سے باہر تھی۔ پھر میں کیا مانگتی؟

------- گرمیوں کی جلتی ہوئی دوپہر تھی۔ جس کے مارے دم نکلا جاتا تھا۔ جب میری دوست قیصر نے مجھے فون کیا' میں نے ایک بزرگ بی بی کے پاس جانا ہے' کار گھر میں نہیں ہے تم اپنی کار میں میرے ساتھ چلو۔ قیصر کے سامنے انکار ممکن نہ تھا۔ سو میں اس کی ڈرائیور بن کر اس کے ساتھ ہولی' والٹن کے قریب ایک قدرے پسماندہ محلے کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہم اس بزرگ خاتون کے گھر جا رہے تھے۔ جنہیں تمام لوگ خالہ جی کہتے تھے اور جو اپنی بزرگی تقوے اور روحانیت کی وجہ سے لوگوں میں خاصی مقبول تھیں۔

اب اس سے آگے راستہ نہیں ہے گاڑی یہیں پارک کر لو' قیصر نے کہا' تو گلی کے کنارے کار پارک کر کے ہم باہر نکلیں۔ تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے قیصر ایک نیم خستہ مکان کے سامنے رک گئی۔ جس کے دروازے پر ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ لٹک رہا تھا' وہ آگے تھی اور میں اس کے پیچھے' چھوٹے سے صحن میں داخل ہوتے ہی گوبر کی تیز بو نے استقبال کیا اور ایک بنی کٹی بھینس نے سبز چارے پر مونہہ مارتے ہوئے شان بے نیازی سے ہمیں دیکھا' جو اس چھوٹے سے کچے صحن کے آدھے سے زیادہ حصے پر حقوق ملکیت کا دعویٰ عملی طور پر ثابت کر رہی تھی۔ سامنے برآمدہ تھا جس کے ٹوٹے ہوئے شیڈ کے سامنے ایک بیمار سا گرد آلود دھریک کا درخت ایستادہ تھا' جس کے نیچے مہندی لگے سرخ بالوں والی ایک عمر رسیدہ عورت ہاتھ میں کھجور کی دستی پنکھی پکڑے بیٹھی تھی' قیصر نے سلام کیا اور اس خاتون کی پائنتی بیٹھ گئی۔ میں ان کے سامنے رکھی چارپائی پر ٹک گئی۔ انہوں نے ایک چنچناتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر قیصر کی طرف متوجہ ہوگئیں' جو دھیمی آواز میں ان سے بات کر رہی تھی۔ میں پیشانی سے بہتے پسینے کو دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے قیصر کے جلدی فارغ ہونے کی منتظر تھی کہ وہاں گرمی اور دھوئیں کی بدبو سے میرا جی متلا رہا تھا۔ وہ بزرگ خاتون جنہیں قیصر خالہ جی کہہ رہی تھی' انہوں نے باتیں کرتی قیصر کو دفعتاً ہاتھ کے اشارے سے چپ ہو جانے کا کہا۔ میری طرف بغور دیکھا اور اس سے پوچھا۔ یہ کون ہے تمہارے ساتھ۔ یہ میری دوست ہے خالہ' بشریٰ نام ہے اس کا' اچھا اچھا تم بی بی ایسا کرو' ادھر دوسری چارپائی پر بیٹھو' یہاں اسے بیٹھنے دو۔ انہوں نے میری طرف اشارہ کیا اور ہاتھ سے جیسے چارپائی کی نادیدہ شکنیں نکالنے کی کوشش کی' پھر خود سرہانے کی طرف کھسکتے ہوئے میرے لیے جگہ بنائی۔ آؤ بیٹھو۔ میں گھبرائی گھبرائی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ کیوں آئی ہو

یہاں ؟انہوں نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر لکیروں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ جی میں قیصر کے ساتھ آئی ہوں' کیوں تمہیں ہم سے کوئی کام نہیں تھا۔ لکیروں پر نظریں جمائے جمائے وہ عجیب آواز میں بولیں۔ جی نہیں' سچ کہنے میں مجھے قدرے تامل ہوا۔ مگر مجھے تو نظر آرہا ہے۔ کیا خالہ جی ؟ میرے بجائے قیصر بول پڑی۔ قیصر کی آواز سن کر خالہ جی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک تو مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی' میرے پاس آخر کیا لینے آئی ہو' قیصر کے چہرے پر حیرت ہی حیرت تھی' خالہ جی میں تو دعا کے لئے' اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے ادھورے لفظ بھی حیران تھے۔ تو کون کہتا ہے' دعا کے لئے میرے پاس آؤ۔ جب یہ تمہارے قریب موجود ہے تو اس سے دعا کراؤ' یہاں فضول میں بھاگی بھاگی آتی ہو۔ خالہ جی کس کیفیت میں تھیں' مجھے یہ نہیں پتہ' قیصر کس خیال میں تھی' میں اس وقت یہ بھی نہ جان سکی' اسلئے کہ مجھے اپنے وجود پر عرق ندامت کے ٹپ ٹپ بہنے والے قطروں' آنکھوں کے پردوں پر چھا جانے والی نمی' اور کانوں میں سائیں سائیں کے شور کے علاوہ کچھ سنائی ہی نہ دے رہا تھا۔ ہاتھ خالہ جی نے پکڑ رکھا تھا اور دل پر کسی قدیم گناہ کی بڑی پکی گرفت تھی۔ میں کہاں تھی ؟ شاید کہیں بھی نہیں۔ تلاش کا روگ دینے والے نے اک اور تماشہ اسٹیج کر دیا تھا۔ میری تھوڑی لٹک کر سینے سے لگ گئی اور میں کسی پچھلے دکھ کے سوگ میں پوری کی پوری ڈوب گئی تھی۔ بیٹا' یوپی سے تعلق رکھنے والی اہل زبان بزرگ بی بی نے میرا کندھا ہلایا۔ اپنی خامیوں کو ٹھیک کر لو' وہ تم پر اچھی نہیں لگتیں۔ ان کی آواز تھی کہ دسمبر کی برفیلی تیز ہوا تھی' جس نے میرے وجود پر لرزہ طاری کر دیا' ان کے کچے صحن کی چار دیواریں اونچی آواز میں مجھ پر ہنسنے لگیں' کھلے سے بندھی بھینس نے جگالی کرتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں میری طرف دیکھا۔ اور دھریک پر بیٹھی ہوئی ننھی چڑیوں نے چوں چوں کرتے ہوئے ترحم

بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں خالہ جی سے ہاتھ چھڑا کر، وہاں سے بھاگی، جب کار تک آئی تو میرا سارا وجود بھڑ بھڑ جل رہا تھا' اور دماغ میں پٹاخے چھوٹ رہے تھے' واپسی میں کار قیصر نے ڈرائیو کی۔ وہ بار بار میری طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی' اور میں کسی ایسے جہاں میں تھی جہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خالہ جی سے دوبارہ ملاقات نہ ہوئی' چاہنے کے باوجود میں ان کی طرف نہ جا سکی' انہوں نے بار بار بلوایا۔ مگر میں تو آئینہ خانے میں خود کو بے حجاب دیکھ کر ڈر گئی تھی' کیسے جاتی۔ اک خوف بھری ندامت نے مجھے یوں گھیر رکھا تھا کہ میں کہیں ملنے کے قابل ہی نہ رہی تھی!!

اس واقعہ کے بعد' ایک دن ڈاکٹر اجمل نیازی کا فون آیا' وہ کہہ رہے تھے' ایک بہت بڑی روحانی شخصیت سے ادیبوں کو ملوانے کا اہتمام کیا ہے' شیزان میں دو روز کے بعد تشریف لائیں۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تقریب وقت پر شروع ہوئی' ڈاکٹر اجمل نیازی نے سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ ملک محمد اکرم اعوان کا تعارف' روحانی شخصیت کے طور پر کرایا' تو میں نے دھیان سے اس شخص کو دیکھا جس کا تذکرہ' اگرچہ میں پہلے بھی سن چکی تھی۔ مگر اس سے قبل ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دیکھا تو میں ٹھٹھک گئی' یہ کیا' روحانی شخصیت ایسی ہوتی ہے کیا۔ بہترین کپڑے کا سلا ہوا بے شکن و بے داغ لباس۔ سیاہ ویسٹ کوٹ' ہاتھ میں Solitaire کی خیرہ کن چمک والی پلاٹینم کی انگوٹھی۔ چہرے پر فراغت اور اطمینان کا رنگ' اور سپاہیانہ آن بان اور طریق۔ یہ کسی فوجی جرنیل کا تو حلیہ ہو سکتا ہے۔ روحانی شخصیت کا نہیں' بالکل نہیں' اور مجھے یقین ہے وہاں بیٹھی ہوئی اکثریت کا بھی یہی خیال تھا' اس لئے کہ خانقاہی نظام کی پروردہ

روحانی شخصیات کا جو تصور میرے ذہن میں تھا' وہ اس سے قطعی برعکس تھے۔ میرے پاس تو صوفی کا تصور ہی کچھ اور تھا۔ موٹا اونی لباس' کم کھانے' کم بولنے اور کم سونے کی وجہ سے وجود سے چھن چھن کر باہر آتی ہوئی پراسرار سی نقاہت' جس سے گاہے گاہے ٹھنڈے نور کے چھینٹے اڑتے رہتے ہیں۔ ہجوم سے کتراتا اور لوگوں سے کھلم کھلا ملنے سے گریز' اور تیاگ کے بنیادی سبق کا ہمہ وقت گیان۔ یہ سوچتے سوچتے میری نگاہ اٹھی تو اک اور حیرت میری منتظر تھی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر' تمام ادیبوں سے پرتپاک انداز میں مل رہے تھے۔ ایسے میں ان کے چہرے پر ایک سادہ سی معصوم مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں دوستی کا خلوص ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

پھر انہوں نے مختصر سا خطاب کیا اور اس کے بعد ان سے کافی دیر مکالمہ چلتا رہا۔ میں اکتاہٹ بھری نظروں سے اس سارے ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ میری گھڑی آٹھ بجا رہی تھی اور میں وہاں سے اٹھ جانے کی خواہش کو بڑی مشکل سے دبا کر بیٹھی تھی۔ اسی دوران اشفاق صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا' حضرت آپ نے جو فرمایا بجا' اس سے انکار کی مجال نہیں مگر عرض یہ ہے' ہمیں اور کچھ نہیں' شفا کی وہ پڑیا چاہئے جو اندر کی حالت بدل دے۔ یہ سن کر روحانی شخصیت کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک جاگی' ان کے چہرے پر روشن کیفیت کا نور پھیل گیا۔ انہوں نے دھیمی مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلایا' میں جو بار بار بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک دم سے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ حکائیوں اور قصوں میں وہ جو مرد کامل کی اک نگاہ سے دل کی دنیا بدل جانے کا ذکر ہے۔ پل میں چور کو قطب بنانے کا تذکرہ ہے۔ کچھ ایسا ہی جادو ہونے والا تھا۔ میں دم خود تھی۔ حاضرین محفل پر سکوت طاری تھا۔ مگر جب انہوں نے تصوف کی پٹاری سے شفا کی پڑیا نکالی تو میں نے دیکھا تعویز گنڈوں' ٹونے ٹوٹکوں اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لئے ہر قسم

کے شارٹ کٹ کے عادی مجھ جیسوں کے مونہہ لٹک گئے۔ یہ کیا' تزکیئے کے لئے اتنی مشقت' اتنا مجاہدہ' تنہا بیٹھ کر اللہ ہو کا ذکر' یعنی سانس کی اندر باہر مارا ماری۔ بھلا فی زمانہ اتنا وقت کس کی پاس ہے' جو اس مشقت سے گزرتا پھرے' ڈسپوزیبل رشتوں اور اشیاء کے دور میں' گھڑی کی سوئیوں سے تیز بھاگتے انسان کو اتنی فرصت کہاں۔ سب کی خاموش رائے سے میں بھی متفق تھی۔ انہوں نے اللہ ھو کے ذکر کی مشق کرائی۔ تو بظاہر سبھی آنکھیں بند کر کے پاس انفاس میں مصروف تھے۔ مگر در حقیقت کوئی کہاں تھا' اسکی خبر نہیں۔ شام ڈھلے جب میں شیزان سے نکلی تو خاصی مایوس تھی۔ اللہ والے کے متعلق میرے تخیل کے کینوس پر جو تصویر تھی' یہ اس سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ماورائی نور کا ہالہ' جو میری بنائی ہوئی تصویر کا لازمہ ہوتا تھا' ان کے گرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود کہیں نظر نہ آیا۔ نہ بظاہر کوئی کشف نہ کرامت' بس لے دے کے اک مشقت بھری اللہ ھو۔

بقول اشفاق صاحب' ہمیں تو ایسی شفا کی پڑیا چاہئے جو پل میں تزکیہ نفس کر دے۔ جو ہمارے جھوٹ منافقت' ریاکاری' بے عملی اور بے دلیلی کے گندے برتن کو پل میں چمکا دے۔ ہمیں دھو دے۔ بس جس میں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے۔

..........میں بھول گئی کہ کبھی شیزان میں کسی اللہ والے سے ملی تھی۔ یہ بھی بھول گئی کہ وہ اللہ والا دوستانہ خوب بو رکھتا تھا۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس نے قرب الٰہی کا ایک لطیف طریقہ بتایا تھا اور یہ بھی میرے حافظے سے محو ہو گیا کہ اس اللہ والے کے ارد گرد ماورائی نور کا ہالہ نہ سہی مگر اک ایسی بے پناہ کشش ضرور تھی' جو اس کے وجود سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی اور جس سے دیکھنے والی آنکھ کو خوبصورت نظاروں جیسی تراوٹ ملتی تھی۔ بعد میں سوچا تو ان باتوں کا پتہ چلا' اس وقت تو اک ایسی اکتاہٹ تھی' جو ایسی کسی خوبی کی طرف دیکھنے یا سوچنے کی اجازت ہی

نہ دیتی تھی۔

تصوف کی کتابوں اور صوفیاء کے احوال سے 'صوفی کا جو تصور میرے ذہن میں بنا تھا۔ وہ کچھ کچھ دنیا سے بیزار' زیادہ نوری تھوڑا خاکی' عامیوں سے دور بھاگنے والا' خاصوں سے دوستی رکھنے والا' ہجوم سے کترانے والا اور خود چل کر کہیں نہ آنے والے کا تھا۔ ایسے کا جو اک نظر سے قلب ماہیت کر دے۔ شر میں لتھڑے ہوئے ہاتھ' خیر کے صحیفے لکھنے لگیں۔ لکیریں بدل جائیں۔ تدبیریں دیکھتی رہ جائیں اور تقدیریں مغلوب حال ہو جائیں۔ شاید یہی وہ خاکہ تھا' جس میں رنگ بھرنے کی شعوری اور لاشعوری کوششوں میں' میں اپنے تصوراتی کینوس کے سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔

پھر کہیں پڑھا۔

خداوند وں کو پکار پکار کر بلاتا ہے۔

لیکن بندے دور بھاگتے ہیں

اور جب بندے دور بھاگتے ہیں تو اس نے اپنے رسول اور پیغمبران کے پاس بھیجے۔ کہ وہ ان کو بلائیں اور سنائیں'

اور اپنا عہد اور معاہدہ ان رسولوں اور پیغمبروں کے ساتھ بھیجا کہ ان کے سامنے پیش کریں۔

اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ وہ خود نیچے اتر کر بندوں کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے۔

مجھ سے کون مانگتا ہے۔۔۔۔۔۔ میں اسے دوں

مجھ سے کون مغفرت چاہتا ہے

میں اس کی مغفرت کروں۔

اور کہتا ہے

میں تجھے وصل کے لئے بلاتا ہوں ٗلیکن تو انکار کرتا ہے ٗ

تجھے بلانے کے لئے رسول اور پیغمبر بھیجے

میں خود اتر کر تیرے پاس آیا

نیند میں تجھ سے ملاقات کی!!

آہ میرے رب! تھر تھراتے ہوئے میں پڑھ رہی تھی۔ لفظوں کو آنکھوں سے لگا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ اے محبت کرنے والے ' تو اگر اپنی مخلوق سے اتنی ہی محبت کرتا ہے تو پھر کہاں ہے 'کیا قصور ہوا ہے مجھ سے 'جو پچھلے دو طویل عشروں پر پھیلے ہوئے اک ایسے ہجر سے دوچار ہوں 'جو آج بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اے کائنات کے ذرے ذرے کی پرواہ کرنے والے 'کیا تجھے یہ کمتر نظر نہیں آئی 'جسے نہ تو خواب میں ملا نہ جاگ میں۔

یہ تیرا کیسا بھید ہے 'جس نے امکان کے سارے راستے یوں بند کر دیئے ہیں۔ کہ کوئی بھی راہ اپنی راہ نہیں لگتی۔ یا تو مجھے انہی راستوں کا یقین دے دے۔ یا پھر وہ راستہ بتا جو تجھ تک جاتا ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک دفعہ اللہ کے کسی نیک بندے سے ملاقات ہوئی تو میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ میں اس محبوب کی تلاش میں ہوں 'جو مجھے محبوب سے ملا دے۔ اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میری بات سن کر وہ دھیرے سے مسکرائے 'اور بولے کثرت سے سورۂ کوثر پڑھا کرو۔ اس سے کیا ہوگا۔ میں نے استفسار کیا۔ محبوب مل جائے گا۔ وہ لاپرواہی سے بولے۔ اور میں نے ان کے بول پلو سے باندھ لئے جب سورۂ کوثر پڑھ پڑھ کر ہف گئی اور محبوب کے ملنے کے کہیں آثار نظر نہ آئے 'تو واصف علی واصف کی ایک کتاب ہاتھ لگی جس میں لکھا

تھا۔

---------ایک آدمی کو مدت ہوئی انتظار کرتے کرتے کسی بزرگ کا' دریا کے کنارے مایوس ہونے لگا۔ بزرگ تشریف لے گئے 'اس کو بتایا' اس نے سلام کیا' آپ وہ ہی ہیں جی۔ ہاں وہی ہیں۔ آئندہ ملنا ہو تو میرا ایڈریس ہے آجانا۔ بزرگ نے فرمایا۔ اس آدمی نے کہا' جس نے پہلے آپ کو بھیجا ہے اس نے دوبارہ بھی آپ کو بھیج دینا ہے۔ میرا کام ہے یاد کرنا۔ میرے پاس آجانے کا ٹائم نہیں ہے کہ آپ کو یاد کروں یا آپ کو تلاش کروں۔ ایک اور کنفیوژن۔ ایک اور الجھن۔ تسبیح طاق پر رکھ دی۔ تلاش کو دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا اور خود ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ اب نہیں' اب کوئی خود ہی آئے گا۔ اب تلاش میں بھاگا نہیں جاتا۔

---------تمام عبادات میں افضل عبادت ذکر ربی ہے۔ خدا کو آسمان کی چھت تلے 'اپنا ذکر کرنے والے بہت محبوب ہیں۔ مگر ذکر کے لئے مرد حق کا ہونا ضروری ہے۔ جو قرب الٰہی کے مدارج طے کرانے میں تمہارا معاون ثابت ہو۔ اور تمہیں راہ حق سے بھٹکنے نہ دے۔

سلطان العارفین کی کہی گئی یہ باتیں 'کبھی بھی نظر انداز کرنے والی نہ تھیں۔ مگر چونکہ کسی بھی اچھے یا برے کام کا ایک وقت مقرر ہے' تمام خیر اور شر کا تعین اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ لفظ او جھل رہے۔ چھپے رہے اور جب کھلے تو بھید بھید نہ رہا۔ اس کے بعد روزانہ پڑھی جانے والی سورۂ مزمل کی یہ آیت بھی اپنے پورے مطلب کے ساتھ آنکھوں سے دل کو جانے والی اندھیری گزرگاہ پر روشنی کی کلید کی طرح کھلنے لگی۔

"اپنے پروردگار کا ذکر کرو اور ہر طرف سے بے تعلق ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ" یہ تو سمجھ آگئی 'اللہ ھو کا ذکر قرب محبوب کا خاص وسیلہ ہے۔ مگر کیسے؟

یہ پتہ نہیں تھا۔ جب سوچنے بیٹھی تو کئی سال پہلے کی ایک سرمائی شام حافظے پر اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ ابھرنے لگی۔ جب ایک مہربان مسکراہٹ اور کھلے لہجے والے اللہ والے نے تصوف کی پٹاری سے شفا کی پڑیا نکالی تھی' جسے دیکھ کر مجھ جیسے بے عمل جلدبازوں کے چہرے لٹک گئے تھے۔ اسی لئے توذکر رلی بے فائدہ بھی لگا تھا اور بور بھی۔ تصوف کو محض رنگارنگی اور کشف و کرامات کی دنیا سمجھنے والے مجھ جیسوں کو تو وہ مرد حق چاہئے تھا۔ جو پل میں چور کو قطب بنادے۔ اس لئے کہ شاید ہمیں در حقیقت قطب کے نام اور گدی کی ضرورت تھی' اللہ کی نہیں۔ مرتبے کا لالچ تھا۔ جاہ کی طلب تھی۔ ہماری خواہش بھی محدود تھی اور فکر بھی۔ ہمیں تو یہ بھی نہ پتہ تھا کہ جسے ایک نظر میں قطب بنایا جاتا ہے' وہ دراصل ہوتا ہی قطب ہے۔ اس کی اصل قلب ہے۔ چور تو محض وقتی طور پر یا دکھاوے کے لئے اسے بنایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ جب یہ یاد آیا تو دل سے اک ہوک اٹھی' جس کی رسائی عرش منور تک تھی یا نہیں' مگر اس نے میرا وجودی و روحانی جغرافیہ ضرور درہم برہم کر دیا۔ دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی قدیم تلاش ابل ابل کر باہر آنے لگی۔ اور میں اسے روک بھی نہ سکی۔ اب مجھے اس مرد حق تک پہنچنا تھا' جو اپنے اندر عرش منور تک رسائی کی کلید چھپائے ہوئے تھا۔ جس نے عامیوں کی ایک محفل میں اک عامی کی طرح بیٹھ کر' بڑی سہولت اور محبت سے ذات حق سے قرب کا طریقہ بڑے سہل انداز میں بتایا تھا۔

بقول ابوالحسنؒ

تصوف نہ کسی اسم کا نام ہے نہ علوم کا

بلکہ یہ اخلاق ہے!

اور کچھ ہو نہ ہو' اس اللہ والے کا اخلاق بہت بلند تھا۔ اس بات کی گواہی میرا دل دیتا تھا۔ نہ پتہ نہ ایڈریس' مگر ملنا تھا' اور اللہ والے نے خود ملنا تھا۔ جس نے پہلے اسے

بھیجا تھا وہ دوبارہ بھی بندوبست کرے گا' مجھے یقین تھا۔

پورے پندرہ دن گزر گئے' کہ اک شام ڈاکٹر اجمل نیازی کا فون آیا منیر نیازی کی پرائڈ آف پرفارمنس کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر صاحب کے ہاں چھوٹا سا فنکشن ہے آپ کو ضرور آنا ہے۔ منیر نیازی کا پروگرام تھا انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی' جانا پڑ گیا۔۔۔۔ یہ اتفاق نہیں تھا' اس لئے کہ محترم شیخ کے مطابق' اس کائنات میں کوئی بھی واقعہ اتفاقی نہیں ہوتا۔ سب کچھ ایک طے شدہ پلان کے تحت ہوتا ہے۔ اور جو ہوتا ہے اسے ایسے ہی ہونا ہوتا ہے سو یہ اتفاق نہیں تھا۔ مگر میرے لئے یہ اتفاق سے بھی بڑا کوئی واقعہ تھا۔ وہ ہستی میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ جسے میں پچھلے پندرہ روز سے مسلسل سوچ رہی تھی۔ اندر ہی اندر کھوج رہی تھی۔ جس کی تلاش بعض وقت زندگی سے بھی بڑی اور اہم لگنے لگتی تھی۔ جب ہم حرکت کے بغیر شکم کو سیر نہیں کر سکتے' تگ ودو کے بغیر رزق نہیں کما سکتے۔ کوشش کے بغیر عمل کی راہ پر اک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تو کیا قرب الٰہی ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جائے گا۔ دنیا میں افرادی قوت کے لحاظ سے مسلمان پہلے نمبر پر ہیں۔ دنیا کی چھ ارب کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد دو ارب ہے۔ چار ارب ایک سو بائیس اقوام ہیں۔ مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ حج کے لئے ہر سال اتنی درخواستیں وصول ہوتی ہیں کہ قرعہ اندازی کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تو پھر کیا بات ہے مسلمان ترقی میں اقوام عالم سے اتنا پیچھے کیوں ہیں۔ مجھے تو اسکی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور وہ ہے ذکر الٰہی کی کمی۔ میں سمجھتا ہوں اگر ہم ذکر کو زندگی کا حصہ بنا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دین و دنیا میں ترقی نہ کر سکیں۔ منزل مراد تک نہ پہنچ سکیں" صوفی اپنے مخصوص سادہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ درمیان میں کئی سالوں کا ملبہ پڑا تھا جسے ہٹانے کی شدید خواہش میرے اندر تڑپ رہی تھی۔

---------ڈاکٹر چیمہ کے ہاں چیدہ چیدہ اہل ادب اپنے استفسارات کے ساتھ موجود تھے۔شاعری بھی چل رہی تھی۔ سوالات بھی جاری تھے 'کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔اللہ کا وہ بے مثل بندہ اپنے مشن میں روز اول کی طرح پر جوش تھا۔اور ہم اپنی بے عملی میں حسب سابق سرگرم تھے۔ماحول میں وہی عقل والوں کی ٹھنڈی جامد خاموشی تھی۔مگر سینے کے اندر دل کے مقام پر اللہ ھو کا تیز نشتر چبھ رہا تھا۔میں پلکوں کے اندر تیر جانے والی نمی کو چھپائے ان سے ملاقات کا وقت مانگ رہی تھی۔اور وہ چہرے پر روشن سی مسکراہٹ سجائے مجھے جب جی چاہے آنے کا مژدہ سنا رہے تھے۔

-----میں جب اللہ والے کے پاس پہنچی تو اندر سے گھائل تھی۔چور چور تھی۔ پچیس طویل برسوں کی تلاش 'اور اس تلاش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تشنہ سوالوں کی گٹھڑی میرے سر پر دھری تھی جسے اٹھائے اٹھائے میں تھک گئی تھی۔اب ایک قدم چلنا بھی مشکل تھا۔مجھے شفا کی اس پڑیا کی سخت ضرورت تھی۔جو مرد حق کی ایک نگاہ کا جوہر ہے۔درد دل تو مالک کی دین ہے جس کو جتنا چاہے عطا کر دے۔ہم تو اس کی توفیق سے بانٹنے کے لئے بیٹھے ہیں۔جس کی جتنی استعداد ہے آئے اور لے جائے۔

-----محبت میں کوئی کسی کا شریک نہیں 'یہ ایک ایسی بے آب و گیاہ تنہائی کا نام ہے جس کا نوحہ خود رب کریم نے لکھا ہے۔محبت کے آخری درجہ کا نام تعبد ہے۔ تعبد کی خاصیت ہے کہ خضوع وانکساری کے ساتھ محبوب سے محبت کی جائے اور محبوب کے سامنے اپنے کو ذلیل و حقیر اور بے قدر و بے توقیر کر دیا جائے۔آدمی جب کسی سے محبت کرتا ہے 'محبوب کے سامنے خضوع وانکساری ظاہر کرتا ہے تو اس کا قلب اسکی عبادت کرتا ہے۔

محبت کے ابتدائی درجہ کو علاقہ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں قلب کا محبوب سے تعلق قائم ہوتا ہے۔

بقول شاعر

لیلیٰ سے میری ابتدائی محبت اسوقت ہوئی جب وہ ابھی تعویزوں والی تھی۔ دوسرا شاعر کہتا ہے۔

اب تم ام الولید سے عشق کرنے چلے ہو۔ جب تمہارے سر کی زلفیں سفید ثقام کی طرح ہو چکیں۔

علاقہ کے بعد الصبابہ کا درجہ ہے' الصبابہ میں قلب پوری گرویدگی کے ساتھ محبوب کی طرف جھک پڑتا ہے۔ محبت کرنے والے صبابة کی شکایت کرتے ہیں۔ کاش کہ محبت کرنے والوں کا سارا بوجھ میں اکیلا ہی اٹھالیتا۔ تو محبت کی ساری لذت میرے ہی دل کے لئے ہوتی۔ کوئی محبت کرنے والا اس لذت کو نہ مجھ سے پہلے پاتا نہ میرے بعد۔ اس کے بعد الغرام کا درجہ ہے۔ الغرام نام ہے قلب کی اس محبت کا جو قلب کے اندر ہمیشہ کے لئے لازمی طور پر جاگزیں ہو جاتی ہے۔ جو کسی بھی وقت قلب سے الگ نہیں ہوتی۔

اس کے بعد عشق کا درجہ ہے

یہ افراط محبت کا درجہ ہے

پھر درجہ شوق کا ہے

اور شوق نام ہے قلب کے اس سفر کا' جو پوری تیزی سے محبوب کی طرف شروع کیا جائے۔

----- محترم شیخ کی باتیں انوکھی تھیں۔ جھم جھم جھم دل کی اندھیری گزرگاہ پر جگنوؤں کی قطاریں اتر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ لغت کے اعتبار سے

تصوف کی اصل خواہ صوف ہو اور حقیقت کے اعتبار سے اس کا رشتہ چاہے صفا سے جا ملے' اس میں شک نہیں کہ یہ دین کا ایک اہم شعبہ ہے۔ جس کی اساس خلوص فی العمل اور خلوص فی النیت پر ہے۔ اور جس کی غایت، تعلق مع اللہ اور حصول رضائے الٰہی ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور آثار صحابہ سے اس حقیقت کا ثبوت ملتا ہے۔ پھر انہوں نے تصوف کی مزید تشریح کرتے ہوئے بتایا۔ تصوف کے لئے نہ کشف و کرامات شرط ہے نہ دنیا کے کاروبار میں ترقی دلانے کا نام تصوف ہے۔ نہ تعویز گنڈوں کا نام ہے نہ جھاڑ پھونک سے بیماری دور کرنے کا نام تصوف ہے۔ نہ مقدمات جیتنے' قبروں پر سجدہ کرنے' ان پر چادریں چڑھانے اور چراغ جلانے کا نام تصوف ہے۔ اور نہ آنے والے واقعات کی خبر دینے کا نام تصوف ہے۔ نہ اولیاءاللہ کو غیبی ندا کرنا' مشکل کشا اور حاجت روا سمجھنا تصوف ہے۔ نہ اس میں ٹھیکیداری ہے کہ پیر کی ایک توجہ سے مرید کی اصلاح ہو جائے گی اور سلوک کی دولت بغیر مجاہدہ اور بدون اتباع سنت رسولؐ حاصل ہو جائے گی۔ نہ اس میں کشف والہام کا صحیح اترنا لازمی ہے۔ اور نہ وجد و تواجد اور رقص و سرود کا نام تصوف ہے۔ یہ تمام چیزیں تصوف کا لازمہ بلکہ عین تصوف سمجھی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک چیز پر بھی تصوف اسلامی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ساری خرافات اسلامی تصوف کی ضد ہیں۔

-----دھڑ' دھڑ' دھڑ' دھڑام' زمین ہلنے لگی اور ذہن میں بہت مدت کی تعمیر شدہ تصوف کی شاندار خود ساختہ عمارت کی بنیادیں ہل گئیں' وہ ڈولنے لگی اور پھر پورے زور سے زمین بوس ہو گئی۔ میں ملبے کے قریب کھڑی اس رنگین و پرشکوہ عمارت کی تباہی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ جس کی اک عمر میں نے تزئین و آرائش کی تھی۔ میری حالت بالکل اس غریب بچے والی تھی' جس نے مشکلوں سے

پیسہ پیسہ جمع کر کے ایک رنگین کھلونہ خریدا ہو۔ اور اس سے اس ڈر سے نہ کھیلا ہو کہ کہیں خراب نہ ہو جائے۔ اور پھر اچانک اسکا پسندیدہ کھلونہ اس سے چھین لیا جائے۔

محترم شیخ نے شاید میرے چہرے پر اس کیفیت کے آثار دیکھ لئے تھے۔ جو اندر اس عمارت کے ٹوٹنے سے برپا ہوئی تھی۔ انہوں نے بڑی ملائمت سے شاید مداوے کے طور پر مجھے ذکر قلبی کا طریقہ بتایا۔ آیئے میں آپ کو ذکر کی مشق کراتا ہوں' میں نے سنا' مگر میں تو اور ہی الجھن میں تھی' اسی لئے کہہ رہی تھی۔ دوران نماز وساوس سے ابھی تک نجات نہیں ملی' حالانکہ میں خاصی پرانی نمازی ہوں۔ اس تجربے کی بنا پر دل میں یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ اگر اب تک نماز میں خشوع کی کیفیت نہیں ملی تو چند گھڑیوں کے ذکر سے بھلا کیا مل جائے گا۔ جبکہ پاس انفاس کی یہ مشق تو بظاہر مشکل بھی ہے اور بور بھی۔

دیکھئے وصل وصال کی کیفیت جب دلوں کا رخ کرتی ہے تو دل کی سنسان حویلی میں روشنی کی شمعیں جلنے بجھنے لگتی ہیں۔ گو ہمارے سامنے عذابِ علم سے بچنے کی ساری راہیں کھلی ہیں۔ مگر ہماری بد قسمتی کہ کتابی علم نے ہمارا راستہ روک رکھا ہے۔ ہم سنی سنائی پر آنکھیں بند کر کے صاد کر لیتے ہیں' کیونکہ عملی تجربے کی جرآت ہم میں نہیں ہوتی۔ آپ اللہ کا نام لے کر ذکر شروع کیجئے۔ اگر میرے قلب میں انوارات الٰہی ہیں تو خود بخود آپ تک منتقل ہوتے رہیں گے' آپ کو ارتکاز کے لئے محنت کی ضرورت نہیں پڑے گی' اپنے آپ مل جائے گا۔ ان کی بات سن کر قدیم صوفیاء کے طریق پر چلتا ہوا زمانہ سامنے آنے لگا' گو اب وہ ہمارے انفس و آفاق کا حصہ نہیں ہے' مگر بعض شخصیات کے قرب کی برکت سے' اب بھی ہمیں اپنا انفس و آفاق لگتا ہے۔ بتیاں گل ہو گئیں۔ ذکر شروع ہو گیا۔ پہلا لطیفہ' شیخ کی آواز سیدھی آسمان سے آئی اور میرے قلب میں جا اتری۔ تصور شیخ کے ہمراہ سانس کو قلب میں

اتارنا' اور سانس باہر نکالتے ہوئے ھو کی چوٹ' قلب پر محسوس کرنا' ذکر ہے----ساتوں لطائف ہوگئے' رابطہ بھی ہوگیا' آواز بند ہوگئی' بتیاں جل اٹھیں مگر میں محبوب کے ساتھ پہلے رابطے میں ہجر کے پانیوں میں نمک کی طرح گھلنے لگی۔ خدا جانے وہ دکھ تھا' شرمندگی تھی' محبت تھی فرقت تھی' کیا تھا' مجھے نہیں معلوم' بہت وقت کے بعد اپنی خبر لی تو دیکھا' شیخ رائٹنگ ٹیبل پر رکھے کاغذات میں گم ہیں۔ مجھ جیسی چند ضرورت مند کمرے میں جمع ہیں۔ اور میں چادر کے پلو میں چہرہ چھپائے نجانے کس سے باتیں کر رہی ہوں۔ اس لڑکی سے' جس نے بالپنے کی سنہری نیندوں کے زمانے میں' خوابوں کی جگہ رت جگے آنکھوں پر بار کیے۔ اور تلاش کی گٹھڑی سر پر اٹھا کر اک طویل راستہ تن تنہا طے کیا۔ وہ لڑکی جس نے سوال کی حیرت کو اذیت میں بدلتے دیکھا' اور اک ایسے گناہ کو ہنسی خوشی شانوں پر رکھا جو دراصل اس کا تھا ہی نہیں۔ یا پھر اس محبوب سے' جو محبوب حقیقی ہے مگر ہمیشہ حقیقت کو دبیز پردے کی طرح درمیان میں تانے محب سے آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔ نہ سامنے آتا ہے۔ نہ سامنے سے ہٹتا ہے' عجب لک چھپ کا تماشہ ہے۔ عجیب مصیبت ہے۔

----میں حضرت جی سے گاہے گاہے مل رہی تھی۔ جب بھی جاتی ان کی توجہ کو اپنے اردگرد روشنی کی طرح پاتی۔ ذکر ہر رابطے یا ملاقات کی اہم کڑی ہوتا۔ "لطائف" کے بعد جب "رابطہ" کا وقت آتا تو ایک آسمانی آواز میرے وجود کے آر پار ہو جاتی۔ "اللہ کو اندر اتاریں اور سانس معمول کے مطابق لیں۔ آپ کا وجود مٹی کا ڈھیر تھا جل کر راکھ ہوا' اب بس اللہ باقی ہے۔ ھو کو باہر نکالیں' دیکھئے ھو کا ایک مینارہ سا بن رہا ہے جو عرش عظیم کو ٹکر مار رہا ہے"۔

ھو کی ٹکر عرش عظیم سے' رابطے کا یہ تصور ہی اتنا انوکھا تھا کہ میرے روئیں روئیں میں لرزہ طاری ہو جاتا۔ 'لطائف" کے دوران ٹپ ٹپ بہتی

آنکھیں۔"رابطہ" پر چھما چھم برسنے لگتیں۔اور کچھ ایسے برستیں کہ بعد میں کمرے کی بتی جلنے' جناب شیخ کا کمپیوٹر آن ہونے یا ملاقاتیوں کے اندر آنے پر بھی' اس بے موسم برسات کو روکنا مشکل ہو جاتا۔اور میں قبلہ رو کرسی پر بیٹھی' نجانے کتنی کتنی دیر بھیگی ہوئی آنکھوں اور سوجی ہوئی لال ناک کے ساتھ اس تصور سے نہال سوچے چلی جاتی۔ہو کی نکر جب عرش عظیم سے لگی ہو گی تو کیا' اس عظمتوں والے بڑے عرش کی مالک نے سنی ہو گی۔اگر سنی ہو گی تو زمین کے فرش پر بیٹھی اس عاصی پر نظر بھی پڑی ہو گی' رابطہ جس کی تلاش کا ثمر ہے۔

-----یہ سوچ کر وہ ہستی اور بھی عزیز لگنے لگتی جو رابطے کا وسیلہ تھی۔میں تو بھٹک رہی تھی۔پریشان حال تھی۔مجھے تو زندگی کی آسانیوں نے وہ مار دی تھی کہ مشکلیں نجات نظر آتی تھی۔مجھے تو ان آسانیوں سے سمجھوتہ کرنے' یا اس انکار کے سپرد ہونے کا مسئلہ تھا۔جس کے بیچ میں عرصہ دراز سے لٹکی ہوئی تھی۔فیصلہ ہی نہیں ہو پاتا تھا۔تلاش پیچھا نہیں چھوڑتی تھی' اور ایک کچی عمر کی لڑکی انگلی نہیں چھوڑتی تھی۔میں جو فطرتاً میلہ گھومنی تھی۔مجھے منظر بھی پیارے تھے اور منظر والا بھی۔محبت کرنا بھی اچھا لگتا تھا اور بے محبت ہو کر بے نیازی کی خو بھی پسند تھی۔آنکھیں لگانے اور آنکھیں چرانے جیسی متضاد کیفیتیں بھی پیاری تھیں۔منزل کی تلاش میں عمر بھر کی پونجی پلو سے باندھ کر نکلنا اور پھر منزل نظر آجانے پر' واپسی کی شدید خواہش کرنا' سفر پھر سے شروع کرنے کی آرزو رکھنا بھی بھاتا تھا۔الف سے دور رہنا اور

الف دا انت و پارنی مائے
جانا ازلوں پار نی مائے
"ب" دی مینوں سار نہ کوئی

کہنا بھی اچھا لگتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام اچھے لوگ' اچھے جذبے اور آسائشیں
کسی بھی ایسے سکھ کو جنم نہ دیتی تھیں' جسے سکون قلب کہتے ہیں' قلب جو یار کا گھر
مانا جاتا ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں' کوئی ایک علاقہ یار کے لئے مخصوص کیسے ہو سکتا
ہے۔ وہ تو سارے پر قابض ہوتا ہے۔ جہاں چاہے پھیرا لگائے' جہاں چاہے ڈیرا
جمائے' اس سے پردہ کیسا!!

شروع میں مجھے اللہ والے کا اخلاق اچھا لگا تھا' بعد میں پتہ چلا یہی کرامت ہے'
یہی خوبی ہے یہی صوفیاء کا بنیادی وصف ہے۔ پھر مجھے شیخ کی چند اور خصوصیات کا علم
ہوا وہ دنیاداری جس پر سب سے پہلے میری تصوراتی عقیدت نے ناک بھوں چڑھائی
تھی۔ اس کے پیچھے پوشیدہ' ترک کا فلسفہ آہستہ آہستہ سمجھ آنے لگا۔ حقوق اللہ اور
حقوق العباد کا اتنا خوبصورت امتزاج ایک ہستی میں' میری آنکھوں نے شاید اس سے
پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ماورائی صفات اور کشف و کرامات کو صوفیاء سے وابستہ کر کے انہیں اپنے آفاقی
تصور کے فریم میں زبردستی ٹھونس کر ان کے سامنے عقیدت کے ہار پھول لے کر
پوجا کے انداز میں بیٹھنے والی روایتی سوچ سے باہر نکلی تو دیکھا' صوفیاء کا وصف تیاگ
نہیں' اسوۂ حسنہ اور اتباع سنت رسولؐ ہے۔ یہی وہ جمالیاتی پہلو ہے جو بالآخر کمال
سے جا ملتا ہے۔ شریعت مطہرہ کی خشک پگڈنڈی ہی درحقیقت منتہائے آدمیت ہے'
منتہائے تصوف ہے۔ جس پر چل کر منزل مراد ملتی ہے۔

شیخ اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہیں۔ دیوتا کہلانے سے سخت چڑ ہے انہیں۔ مسند
پر بیٹھ کر عقیدت مندوں کا ہاتھوں پر بوسہ دینا اور نذر و نیاز سے سخت کوفت ہوتی ہے
انہیں، پیر صاحبی انہیں بالکل نہیں بھاتی۔ ملنے کے لئے آنے والوں سے دور رہنا

انہیں اچھا نہیں لگتا۔ جب تک وہ سب سے مل نہ لیں تسلی نہیں ہوتی۔ گھر،بچوں، بیویوں، دوستوں، رشتہ داروں، سلسلے جماعت، ارکان سلسلہ، اور ارکان جماعت، کاروبار، لین دین، تصوف، روحانیت، دار العرفان، اویسیہ، خطابات، بیانات، ذکر الٰہی، نمازیں نثر پارے، تفسیر، شاعری، طب، سائیکالوجی، تعلیم، زراعت، بیٹھک، شکار، ایمانیات، اخلاقیات، معاملات! ایسے ہی ان گنت چھپے ہوئے اور ظاہر گوشے ایک ہستی میں، اور اسقدر توازن کہ کسی بھی شخص، شعبے، شوق اور فرض کو نظر انداز کئے جانے کا وہم تک نہیں ہوتا۔ سب پر یکساں توجہ، سب کا یکساں خیال، سب کی یکساں اہمیت، یہ ایسی حقیقتیں ہیں جو چند ملاقاتوں میں ہی مجھے معلوم ہو گئیں اور میں ایچ سی ہاپولڈ کے اس بیان کو مجسم دیکھنے لگی۔ "اگرچہ صوفیائے اسلام کے مشاہدات عام طور پر وہی ہیں جو دوسرے ارباب روحانیت کے ہوتے ہیں۔ لیکن صوفیا میں چند ایسے خاص عناصر ہیں جو روحانیت کے طالب علم کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ صوفی کے لئے ترک دنیا بہت ضروری ہے لیکن صوفی کا ترک اور قسم کا ہوتا ہے۔ صوفی طالب مولا ہوتا ہے۔ اور طلب مولا میں صوفی کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کو ترک کر کے پس پشت نہ ڈال دے۔ بلکہ دنیا کے اندر گھس کر اس کی حقیقت اور ماہیت کو پالے۔ یہ بات باقی ارباب روحانیت میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ صوفی کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ دنیا کے اندر گھس کر اس کی حقیقت معلوم کرے۔ اور اس بات کے لئے اسے تزکیہ نفس کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ تکبر سے بالاتر ہو کر رائے قائم کرے۔ اور نفسانیت سے بالاتر ہو کر لوگوں سے معاملہ کرے۔ اور اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھے۔

یہ بات دنیا میں رہ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ خدا تک پہنچنے کا یہی اور صرف یہی راستہ ہے"!!! اور اس راستے پر وہ صاحب حال ہستی بڑے خلوص سے چل رہی تھی۔

تعلق مع اللہ اور خلوص فی العمل اور خلوص فی النیت کے ساتھ۔ یہی چیز میرے لئے اچنبھے کا باعث تھی یہی چیز میری آنکھوں سے حیرت کے چھینٹے اڑاتی تھی۔ اس چیز کا ادراک مجھے اس محبوب کی طرف بلاتا تھا۔ جو محبوب سے ملاتا ہے۔ مجھے حیرتوں کو دو چند کرنے والے اس صوفی کی کشش کا اقرار اس انکار سے مانگنا تھا' جو میرے برسوں کی بغاوت تھی۔ وہ صوفی بظاہر ایک نہایا دھویا۔ کوچینا مانجھینا' ٹرانسپیرنٹ سا انسان لگتا ہے' جو کشف چھپاتا ہے۔ کرامات کو مخفی رکھتا ہے۔ عبادات پر زور دیتا ہے عمل کی پرزور تلقین کرتا ہے۔ تعویز گنڈوں کی مذمت کرتا ہے، اونچی کرسی پر بیٹھ کر جس کی طبیعت گھبراتی ہے۔ جو انسانی نفسیات کے انتہائی حساس حصے کو دیکھتا انسان کی آنکھ سے ہے۔ مگر سوچتا صوفی کی محبت سے ہے۔ اور علاج خدا جیسے پیار سے کرتا ہے۔ جس سے بات کرو تو کائناتوں کے اندر راستے کھلنے لگتے ہیں عرش امکان کی حدوں میں سمانے لگتا ہے۔ وہ نفی کرتا ہے ہر اس بات کی جو کرامت کے ضمن میں اس سے وابستہ کی جاتی ہے' مگر میں ہارون الرشید' حافظ عبدالرزاق' ثمینہ اعوان اور کرنل سلطان جیسے لاتعداد لوگوں کی باتوں پر کیسے دھیان نہ دوں' جو قرب کی انتہائی منزلوں پر بیٹھے اس صاحب حال صوفی کے بارے میں اپنے ایسے تجربات بیان کرتے رہتے ہیں۔ جو فہم کی حد میں نہیں آتے' جنہیں ادراک کی ہوائیں چھو نہیں سکتیں' جنہیں روز مرہ کے خانے میں فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلئے کہ انہیں وہی جان سکتے ہیں جو انہیں جاننے کی مصیبت سے گزرنا جانتے ہیں' کشف المحجوب میں' حضرت حصری علیہ رحمہ کے حوالے سے لکھا ہے۔

-----"یہ باتیں سالکین کے سمجھنے کی ہیں۔ جن لوگوں کو عملی طور پر مقامات و منازل سلوک پر عبور نہیں' وہ ہرگز نہیں سمجھ سکیں گے۔ ان کو چاہئے کہ خواہ مخواہ کے اعتراضات سے پرہیز کریں۔ روحانیت بھی باقی فنون کی طرح ایک فن

ہے اور اس کے دقائق ماہر فن ہی سمجھ سکتا ہے۔ جیسے علم طب یا انجینئرنگ کی کتابوں کو صرف ماہرین فن طب اور ماہرین انجینئرنگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسروں کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ہاں الی اللہ میں کوشش کی جائے تو تزکیہ نفس کے بعد یہ مقامات آسانی سے حاصل بھی ہو سکتے ہیں اور دقائق سمجھ میں بھی آ سکتے ہیں۔ بلکہ دیگر علوم و فنون سے زیادہ فن روحانیت میں کمال حاصل ہو سکتا ہے"۔

-----مگر یہ ایسے ہے جیسے کوئی آرائش خود طلب کرتا ہے' کسی کو وہ خود آراستہ کر دیتا ہے۔ یہ تو دینے والے کا کمال ہے۔ یہ تو لینے والے کا بخت ہے۔ جو آتا سائل بن کر ہے اور لوٹ کر چلا جاتا ہے۔ لٹنے والا دونوں جہاں لٹا کر بھی خوش کہ شکر ہے آیا تو!!

-----ایک روز شیخ سے ملاقات کے دوران میں نے سوالات والی گٹھڑی کھولنے کی جسارت کی پوچھا۔ شکر کیسے ادا کیا جاتا ہے۔ نوٹ بک پر جھکے ہوئے شیخ کے چہرے پر کیفیت کے چھینٹے اڑے' ان کی آنکھوں سے یقین کی پھوار گرنے لگی' اسی طرح لکھتے لکھتے وہ بے نیازی سے بولے۔ "جب بندے کو یقین ہو جائے کہ وہ شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اس کیفیت کو مقام شکر کہتے ہیں"۔ بس اتنی سی بات۔ "جی اتنی سی بات باقی سب فسانہ ہے"۔ وہ مسکرائے۔ اور مجھے ممتاز مفتی جی کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی' جب ان سے پوچھا تھا کہ اللہ کا شکر کیسے ادا کیا جائے۔ تو وہ شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بلا توقف بولے تھے' بس کہہ دو' تھینک یو اللہ میاں جی! بس اتنی سی بات' میں نے حیرت سے پوچھا۔ جی اتنی سی بات' انہوں نے کھلکھلاتے ہوئے جواب دیا۔

-----مگر درحقیقت یہ اتنی سی بات نہیں تھی' بہت بڑی بات تھی' مولوی نے جسے مصیبت بنا دیا' ناقابل عمل بنا دیا' اور صوفی نے سوئی کی نوک پر جیسے دنیا نام کا

پیپہ رکھ کر بڑی سہولت سے گھمادیا' جنت دوزخ کا جھگڑا چھوڑو' محبوب سے قرب کی بات کرو' یہ تو کچھ بھی نہیں' جیسے جیسے چلو گی معلوم ہوگا۔ آسانیاں مشکلوں میں' اور مشکلیں اصلی آسانیوں میں کیسے بدلتی ہیں۔ تو میں جو' آسانیوں کی سوختہ تھی' مشکلوں کی طرف چل نکلی ہوں۔ اس لئے کہ بر دست تو یہ اطمینان ہی بہت ہے کہ اس انکار سے تو نجات ملی' جو کچھ بھی کرنے نہیں دیتا تھا' کہیں دیکھنے نہیں دیتا تھا۔ سوچنے نہیں دیتا تھا۔ چلنے نہیں دیتا تھا۔ اب کم از کم آنکھیں تو پٹ پٹا سکتی ہوں۔ کچھ نہ کچھ سوچ بھی سکتی ہوں' اور چلنے کی کوشش بھی کر رہی ہوں' اسی لئے اب وہ لڑکی میری انگلی نہیں چھوڑتی' میلوں ٹھیلوں میں' سفر حضر میں' جاگ خواب میں' میرے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ اور میری دعا ہے' اسکا ہاتھ مجھ سے نہ چھوٹے کہ وہی تو اس محبوب تک پہنچانے کا سبب ہے جو محبوب حقیقی تک پہنچاتا ہے!

O..........O..........O

اجتماع اور دارالعرفان کے حوالے سے باتیں!!

آسمان کے آنچل میں

میں اس کو دیکھتی ہوں۔ روشنی اس کے لہجے کا زیور اور راستی اس کے وجود کا گھر ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ مگر محفلوں جیسی رونق کا امین ہے۔ اس کی آنکھوں میں زمانوں کی آہٹیں کروٹیں بدلتی ہیں۔ اور سورج اس کی پلکوں کے پچھواڑے سے طلوع ہوتا ہے۔ وہ لہجے کی آسائش سے' روح کی آلائشوں کو دھونے کا فن جانتا ہے۔ اسے دلوں کی آرائش گاہوں کا خیال ہے۔ جن کی تزئین میں اس نے عمروں کا سفر لمحوں میں طے کیا ہے۔ تھکن اسکے پاؤں کی گرد ہے۔ اور مسافت تلوؤں کے نیچے روندی جانے والی وہ زمین' جس کی گواہی اس کے پورے وجود پر لکھی ہے۔ وہ لفظوں کا جادوگر نہیں' لفظ اس کے جادو سے مسحور رہتے ہیں۔ کھنکتے ہیں' ڈھلتے ہیں اور چمکتے ہیں۔ وہ لفظوں کو نئے اعتبار اور پرانے یقین دیتا ہے۔ وہ جذبوں کو مثالی مقاموں جیسا رتبہ عطا کرتا ہے۔ وہ ناقابل تسخیر ہے۔ ہاں..............................!!

مگر ایک چیز'-----محبت۔

بس محبت سے اسے جب چاہو جیت لو' تسخیر کرلو۔ یہی ایک نسخہ کیمیا ہے' اور میں حیرت بھری خاموشی سے سوچتی ہوں! اس بلند مینار جیسی ہستی کو محبت کی بھلا کیسی کمی؟ وہ جو یقین کے روشن لمحوں میں' وجود کی پوری کائناتوں کے ساتھ زندہ ہے۔ ایسا کون ہوگا جس نے اس سے محبت نہ کی ہوگی' یہاں تو سب اسی کی محبت کے رازوں میں بھیگے نظر آتے ہیں۔ سبھی چہروں پر محبت کا فسانہ لکھا ہے۔ سبھی آنکھوں میں یار سے نبھ جانے کی دعاؤں کا چرچا ہے۔ سبھی اپنے دلوں کی کتابوں میں قصہ دلدار رقم کرنے کے لئے سرگرداں ہیں۔ تو پھر؟

اسے محبت کی کیسی کمی!

وہ جو اپنی باتوں سے سننے والوں کو چور چور کر دیتا ہے۔

لوگ اسکی قربت میں شیشے کے گلاس کی طرح تڑخنے لگتے ہیں۔ ہجر کی ضربیں چہروں پر کئی کچی پکی لکیریں کھینچ دیتی ہیں۔ پھر باقی عمر انہی کی نگہداشت میں گزر جاتی ہے۔ اس لئے کہ محبتوں میں ملنے والا ہجر اور فراق۔ وصل اور وصال ہی تو متاع عزیز ہوتا ہے۔ باقی سب تو منڈی کا مال ہوتا ہے۔ سچ چورا ہے رکھا اور لشتم پشتم گاہکی میں نبیڑ دیا۔ شام کو لوٹے تو خالی چھابا بھی وزنی لگا' اسے بھی دے آتے تو اچھا ہوتا' ایسی سوچ بن جاتی ہے!!

-----منارہ کی اسٹڈی کے ریڈنگ روم' اس کی کھڑکی سے باہر ہوا کی ذرا سی شرارت سے' اپنے ہی بوجھ سے کانپتا سہمتا سفیدے کا سیدھا شاداب درخت' دارالعرفان کی اونچی دیواریں' ان دیواروں کے ساتھ باہر کی طرف کھلی زمین پر بندھے فارم کے پالتو جانور' جانوروں سے آگے' وہ پکی سڑک جو سیدھی لکیر کی طرح دور تک بہتی چلی جاتی ہے۔ اور اس سڑک کے ارد گرد کہیں کہیں سبز' ٹیلے'

خشک اور اداس پہاڑ' پہاڑوں کے اوپر لاجوردی آسمان کے آنچل میں لشکتے ابرقی بادلوں کے ٹکڑے' دور پہاڑوں کی گود میں بکریاں چراتا ایک خاکی وجود والا چرواہا' اور چرواہے کے چہرے پر پھیلی ہوئی ازلی قناعت!

کھڑکی کے فریم سے وہ سارا منظر ایک عظیم پینٹنگ کی طرح میرے سامنے کھلا تھا۔ جسے میں پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ خوابوں جیسا سچ ٹوٹ نہ جائے! ایسے میں شہری ہوا سے آلودہ سانسوں کو اندر کھینچا' تو معطر' پاکیزہ اور مصفا ہوا نے میرے پھیپھڑوں کو تروتازہ کر دیا۔ میں نے کسی ماہر یوگی کی طرح بے اختیار دو تین لمبے لمبے سانس لیے۔ یوں جیسے یوگا کا آسن جمانے کی تیاری ہو۔ نروان کی طرف چلنے کا اشارہ ہو!!

منارہ' دارالعرفان کی پہلی صبح' جسے مہربان سورج اپنے ہمراہ کسی سوغات کی طرح لایا ہے اور ساری کی ساری اس نے میری جھولی میں الٹ دی ہے 'لو سنبھالو' اور میں اس کرن کرن اجلی صبح کو اپنی تنگ' جھولی میں سمیٹنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی ہوں۔ مجھے دارالعرفان' اسٹڈی' اجتماع' اجتماع کے روز و شب محترم شیخ سے انٹرویو اور ان کے گرد بھیدوں کی طرح پھیلے ہوئے لمحوں کے اندر سے اس نور بھری راستی کا پتہ لگانا ہے۔ جو پیشانیوں سے سچ کی طرح منعکس ہوتی ہے تو روحوں کو اندھیروں سے نجات مل جاتی ہے۔

----- کسی مذہبی اجتماع کے موقع پر میری پہلی حاضری ہے۔ حاضری کیا' شیخ کے روز و شب کے معمولات قریب سے دیکھنے' ان کے بنائے ہوئے ذکر اور فکر کے ماحول میں سانس لینے اور خود کو خدا اور بندوں کے درمیان پوری طرح محسوس کرنے کی خواہش وہاں کھینچ لائی ہے۔ بہت ہی اچھی ثمینہ' جو صفارہ اکیڈیمی کی پرنسپل ہے' مگر دیکھنے میں اکیڈیمی کی اسٹوڈنٹ لگتی ہے' مجھے اتنی توجہ اور پیار سے اٹینڈ کرتی

ہے کہ میں شرمندہ ہو جاتی ہوں۔ میں نے اسے کہا ہے' مجھے میرے حال پر چھوڑ دو' اتنی توجہ سے میں سکڑنے لگتی ہوں' میں اسے برداشت نہیں کر سکوں گی' مجھے وی آئی پی مت بناؤ مگر وہ مانتی کب ہے۔ اس کے لہجے میں خلوص کا اتنا گھیراؤ ہوتا ہے کہ بندہ دم نہیں مار سکتا' بس اس کی چھاؤں میں پڑا کراہتا رہتا ہے۔ دارالعرفان آتے ہی ثمینہ سے 'اجتماع کی عبادات کا خواتین کا شیڈول پوچھا ہے۔ اس نے پہلے تو خاصی ٹال مٹول کی ہے۔ ابھی بتاتی ہوں' ٹھہر کر دکھاتی ہوں۔ سبھی کچھ لکھا ہے۔ ابھی آپ تازہ دم تو ہو جاؤ۔ سانس تو لے لو' اتنی بھی جلدی کیسی مگر میں جو عبادات میں اپنے آپ کو بڑی سخت کوش سمجھتی ہوں' بصد اصرار اس سے 'ڈیلی عبادات کا روزنامچہ نکلوا لیتی ہوں۔ جسے وہ ہچکچاتی ہوئی میرے حوالے کرتی ہے۔ میں بڑے اطمینان سے اس پر نظر ڈالتی ہوں' اور پہلی ہی نظر میری فخریہ عبادات کا غبارہ پچکانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ میں اٹکتے اٹکتے پڑھ رہی ہوں۔

عبادات کا روزنامچہ کچھ یوں ہے۔

بیداری سحر	2.30
اذان فجر	3.30
اجتماعی ذکر	3.35
صلوٰۃ فجر	4.10
آرام	
ذاتی معمولات	6.00
تلاوت قرآن پاک	6.15

ناشتہ	7.00
اجتماعی ذکر	8.00
بیان (تصوف پر)	9.00
گروپ وار ذکر	9.30
درس قرآن شیخ المکرم	10.00
دوپہر کا کھانا	11.00
آرام	
صلوٰۃ ظہر	2.00
تیاری کورسز ہشت روزہ	2.15
چائے	3.00
گروپ وار ذکر	3.15
پیریڈ فقہ	4.00
اجتماعی ذکر	4.45
صلوٰۃ عصر	5.30
تیاری کورسز ہفت روزہ	5.45
اجتماعی ذکر	6.00
کھانا	6.15
صلوٰۃ مغرب واجتماعی ذکر	7.10
صلوٰۃ عشا	9.10

یااللہ اس پروگرام میں تو کہیں سانس نکالنے کی بھی فرصت نہیں، میرے منہ

سے بے اختیار نکلتا ہے اور ثمینہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے' کہا تھا نہ مت دیکھیں' مگر آپ مانیں بھی تو' بہر حال اب کیا خیال ہے' یار مجھے کچھ سوچنے دو میں فرش پر بچھی چٹائیوں کے اوپر بیٹھی آسودہ حال بیبیوں کی طرف چپکے سے نگاہ ڈالتی ہوں۔ جو اپنے معمولات میں پوری طرح مگن ہیں۔ اچھا آئیں پہلے کھانا کھالیں۔ پھر اس کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ ثمینہ بہت ٹائیٹ پروگرام ہے' کچھ گنجائش نہیں ہو سکتی کیا' ارے آپ کے لئے گنجائش ہی گنجائش ہے' فکر نہ کریں' ثمینہ بہادروں جیسی شان سے کہتی ہے' اور میں بزدلوں کی طرح عبادات کے روزنامچے کو آہستہ سے وہیں رکھ کر اٹھ آتی ہوں اسے فالو کرنا شاید ممکن نہ ہو' میں سوچ رہی ہوں۔ ثمینہ نے دوپہر کا کھانا' پورے بارہ بجے بھجوا دیا ہے۔ دار العرفان کے طعام خانے سے آیا ہوا سادہ کھانا' جس میں اچار سلاد کا اضافہ کر کے ثمینہ نے تھوڑا پر تکلف کرنے کی کوشش کی ہے' مزیدار ہے۔ دار العرفان کے تندور کی موٹی روٹی مکے کے محلے الجیاد کے تندور کی اس مثلث نما روٹی کی یاد دلا رہی ہے' جسے ہم تین بندے مل کر کھاتے تو بھی ختم نہ ہوتی تھی۔

کھانے کے بعد میں 'اسٹڈی دیکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں' جہاں بے شمار نادر تاریخی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں حدیث' فقہ' تفسیر' تصوف' اسلامی تاریخ' سیرۃ النبی' شاعری' ادب' سفر نامے' سیاحت اور دوسرے دینی اور دنیاوی علوم پر مشتمل فارسی' عربی' انگریزی اور اردو کی کتابیں شامل ہیں۔ لائبریری کا سارا انتظام ثمینہ کے ہاتھ میں ہے' اس نے بڑی محنت سے لائبریری کے وسیع ہال میں شیلفوں پر باقاعدہ سیریل نمبرز کے ساتھ تمام کتابوں کو ترتیب وار لگایا ہوا ہے۔ لائبریری آپ کے لئے ہے مگر ایک شرط ہے کہ جو کتاب جہاں سے اٹھائیں وہیں پر دوبارہ رکھیں' اس نے مسکراتے ہوئے تاکید کی۔ اسی لئے لائبریری کے مختلف حصوں میں پھرتے

ہوئے' میں اسکی تاکید کا بطور خاص خیال رکھ رہی ہوں۔ حرفوں' نقطوں کا غذوں کے اس میلے میں 'دانش اور حکمت کی دنیائیں بکھری پڑی ہیں۔
زرد پیلے جھر جھر کرتے صفحات کے اندر حقیقت کائنات اور راز حیات چھپا ہے۔ میں حریص نگاہوں سے دیکھتی ہوں۔ میرے اندر اس تمام علم کاست' اپنے اندر ایک ہی گھونٹ میں انڈیل لینے کی حرص جاگ رہی ہے۔ میرے علم کی ناتمامی بڑھ رہی ہے۔ لائبریری تو بہت بڑی ہے' کتابوں کی تعداد ہزاروں میں ہے' انہیں پڑھنے کے لئے ایک عمر چاہئے' اور عمر تو نفسا نفسی کے اک ایسے جہان میں پڑی ہانپ رہی ہے' جہاں نہ فرصت خیال ہے نہ فرصت دید۔ اس کے پاس پلکیں موندنے کی سہولت ہے نہ کھولنے کی سعادت' بس بھاگنے کی' ادھر ادھر نہ دیکھنے کی معیبت ہے۔ ایسے میں لائبریری کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر سوچنے اور سوچ کر کچھ کرنے کی فرصت کسے' باہر سڑک پر زندگی تیزی سے بھاگ رہی ہے' لمحے گھنٹوں اور گھنٹے دنوں کی ترتیب بدل رہے ہیں۔ بچے جوان اور جوان بڑھاپے کا چولا پہن رہے ہیں۔ پھر میں 'اس ذوق آگہی کا کیا کروں؟

میری بے عملی نے تو اندر حرص کا تماشہ لگا رکھا ہے۔ لائبریری کی کتابیں' پڑھنے' جاننے اور غور کرنے کی ترغیب دے رہی ہیں' میں شہدوں کی طرح تصوف کی پیلے صفحات والی ایک کتاب جلدی سے اٹھاتی ہوں۔ صفحہ الٹتی ہوں' چاہتی ہوں اک نظر دیکھ کر اسے ہضم کر لوں' مگر میرے سامنے سیاہ حروف والی ناقابل فہم تحریر ہے' میں جلدی جلدی صفحات پلٹتی ہوں' مگر ساری کتاب اسی تحریر سے عبارت ہے' عربی رسم الخط میں لکھا ہوا ان عربی کا وہ قدیم نسخہ میرے کسی کام کا نہیں۔ میں اسے دوبارہ اسی ریک پر رکھ دیتی ہوں۔ پرانی ترتیب میں۔ اب میرے ہاتھ میں مولانا مودودی کی تفسیر فہم القرآن کا پہلا حصہ ہے۔ مگر یہ تو میں نے پڑھ

رکھی ہے۔اس کے بعد جس کتاب پر میری نظر ٹھہرتی ہے۔وہ بہت بوسیدہ اور ضخیم کتاب ہے' جسے ثمینہ نے بڑی محنت سے مختلف کورز کے ذریعے Preserve کیا ہے۔مضامین حکمت پر لکھی کتاب کو میں بڑی احتیاط سے کھولتی ہوں'مگر فارسی میں کہی گئی حکمتیں میرے بے حکمت علم کا سینہ چڑاتی ہیں۔بددلی سے کتاب واپس شیلف میں رکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں۔انگریزی سکولوں میں Abc پڑھتے اور انگریزی نظمیں گاتے ہوئے ہم یہ کیوں بھول گئے کہ تمام اعلیٰ علوم'مسلم اسکالرز کی طرف سے آئے اور ان میں سے بیشتر عربی الزبان تھے'بعد میں جن کے تراجم دنیا کی دوسری زبانوں میں ہوئے اور ان پر عمل کر کے پسماندہ قومیں ترقی یافتہ کہلائیں۔ہم کہ جنھوں نے نہ تو تراجم پر دھیان دیا اور نہ ہی زبان کو قابلِ غور جانا'شاید اسی لئے ہم اتنا پیچھے رہ گئے ہیں۔

رہی فارسی تو اہلِ حکمت و دانش نے اس زبان میں ایسی ایسی تخلیقات چھوڑی ہیں کہ جو بجائے خود اپنے اندر کائناتوں کا علم سموئے ہیں۔پھر کس نے کہا' پڑھو فارسی بیچو تیل۔جو اس نعرے کا خالق تھا'میرے خیال میں وہی' درپردہ ان علوم کے فروغ کا مخالف تھا۔وہی آگہی'علم'حکمت اور دانش کا دشمن تھا۔وہ کوئی ایک شخص تھا سسٹم تھا یا زمانہ تھا'جو بھی تھا اس نے اچھا نہ کیا'انگریزی کی اے بی سی میں پھنسا کر ہم پر اصل حکمتوں کے راستے بند کر دیئے۔دارالعرفان کی لائبریری میں ارد گرد بکھری ہوئی دانش مجھ سے سوال کر رہی ہے اور میرے پاس اسکا کوئی جواب نہیں۔سوچتی ہوں۔درس گاہوں میں عربی اور فارسی کو متروک قرار دیئے جانے والے سسٹم سے انکار کیوں نہ کیا۔لائبریری کے ریڈنگ روم میں آتی ہوں تو میرے ہاتھ میں' تزکیہ نفس اور تفسیر کی دو کتابیں ہیں۔جن کے صفحات لش لش کر رہے ہیں۔تحریر تازہ ہے۔کورز اجلے ہیں۔اور جو اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی

ہیں۔ میں اپنی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ہی ان کتابوں کو اٹھا کر لائی ہوں' اسلئے کہ پہلے صفحات' مٹی ادھ مٹی تحریریں اور مختلف کورز میں ملفوف نادر قلمی نسخوں میں چھپی حکمتیں مجھ پر نہ کھل سکیں۔ اس لئے کہ میں نے ان تک جانے کے راستے کبھی خود ہی اپنے آپ پر بند کر دیئے تھے۔ یہ حکمتیں تو ان پر کھلتی ہیں' جو اے۔ بی۔ سی۔ میں نہیں الجھتے' بلکہ اسے علم کے شہر کا ایک موڑ سمجھ کر اس سے آگے چل نکلتے ہیں وہاں جہاں شہر کے مرکز میں عین الیقین کا زمزمہ بہتا ہے۔

صلوٰۃ عصر کا وقت ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی میرے کانوں نے بڑے سالوں کے بعد اتنے نزدیک سے 'روح میں اتر جانے والی اذان سنی ہے۔ کبھی ایسی اذان مکہ مدینہ میں نصیب ہوتی تھی۔ جو وجود کا رواں رواں جگا دیتی تھی' اس کے بعد ڈیفنس کے نازک مزاج موذنوں کی آواز نے کبھی ادھر کا رخ ہی نہیں کیا' جہاں میں رہتی ہوں۔ یہاں تک کہ رمضان شریف میں بھی ٹی وی پر مغرب کی اذان سن کر افطاری کی عادت پڑی ہوئی ہے .... لائبریری کی کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں تو دار العرفان کے زنانہ غسلخانوں کے سامنے خواتین کا آنا جانا لگا ہے۔ جو ابھی ابھی اجتماعی ذکر سے فارغ ہو کر' عصر کی نماز کی تیاری میں مصروف ہیں۔ عبادات کی ٹف روٹین کے باوجود وہ تازہ دم نظر آ رہی ہیں۔ سالانہ اجتماع کے ہشت روزہ میں شامل ہونے والی یہ خواتین' ملک کے طول و عرض سے بڑے شوق و ذوق کے ساتھ یہاں آتی ہیں۔ زنانہ حصے کے آہنی سیاہ گیٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد وہ مڑ کر ساتھ آنے والوں کی طرف نہیں دیکھتیں' بند گیٹ کے باہر' رہ جانے والے ساتھی اور چھم چھم کرتی رنگارنگ دنیا سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ شب و روز ذکر کی جا بجا سجنے والی محفلوں درس قرآن' تصوف' فقہ اور حدیث کے کارساز لمحوں کے بیانات اور اوقات صلوٰۃ میں' رکوع و سجود کی نرمی' انہیں آداب بندگی سے کچھ یوں آشنا کرتی ہے کہ تین

دنوں کے بعد جب وہ واپس آہنی سیاہ گیٹ کے باہر کھڑے ساتھیوں کے ہمراہ اپنی دنیا کی رنگا رنگی میں واپس جارہی ہوتی ہیں تو ان کی بھیگی ہوئی آنکھوں پر ذکر کا سوز ہوتا ہے اور سجود کی گرمی ان کے سینوں میں تڑپ بن کر دھڑک رہی ہوتی ہے۔ وہ پیچھے مڑ کر یوں بے قراری سے دیکھتی ہیں' جیسے ان کی گود کا بچہ وہیں رہ گیا ہو۔ اگر تین دن سے زائد رہنے کی اجازت ہوتی تو شاید چالیس روز سے پہلے وہاں سے کوئی نہ جاتا۔

-----محترم شیخ کی صبح' تین بجے شروع ہو جاتی ہے۔ پچھلے چالیس برس سے' ان کی راتیں' دنوں سے زیادہ روشن ہیں۔ شروع شروع میں جب وہ اپنے شیخ حضرت اللہ یار خان سے ملے اور انہوں نے باقاعدگی سے اللہ اللہ کرنا شروع کیا تو پھر' ان کی راتیں سمٹ کر ان کی اس مٹھی میں آ گئیں' جہاں دل کی لمبی گہری لکیر پر اللہ ہو کی تاثیر کا بھید کھل رہا تھا۔ جب قلب نے یار کی موجودگی پہلے پہل محسوس کی تھی۔

جب یار فرید کا جوبن کلکاریاں مار کر ہنستا تھا۔ اور ہجر کی ماری آنکھیں سراپا دید بن گئی تھیں۔ یہی وہ وقت تھا' جب راتیں راتیں نہ رہیں' دن بن گئیں۔ دن بھی ایسا جہاں سورج کبھی نہیں ڈھلتا' سائے کبھی نہیں بڑھتے زمانے کے مروجہ حسابوں کتابوں سے وہ راتیں باہر نکل گئیں۔ ان کا مفہوم بدل گیا صورت بدل گئی۔ سمت بدل گئی۔ ملک محمد اکرم اعوان' مشکل پسند' ضدی' نڈر' مکمل دنیادار' خود کو ناقابل تسخیر سمجھنے والا نوجوان' دنیا کو ایک انگلی کے اشارے سے چاک پر گھمانے والا' کچھ ایسا ہوا کہ خود گھوم کر رہ گیا کچھ اس طرح سے کہ اس کا سورج اور چاند بھی اس کی بکل سے نکل کر کہیں گھور تاریکی میں گر گئے۔ نابود ہو گئے۔ پھر سورج کی ڈھونڈ پڑی چاند کی تلاش شروع ہو گئی۔ اندھیرے کی چادر میں نقب لگانے کا خیال آیا' مگر کیسے! یہ ایک الگ قصہ ہے (جو حضرت جی کے حالات زندگی میں درج ہے) بہر حال تلاش کا

مرحلہ چونکہ مشکل بھی ہوتا ہے اور تکلیف دہ بھی۔ اس میں وجود کو بھی بار اٹھانا پڑتا ہے اور روح کو بھی۔ اس تلاش میں سرگرداں اس نوجوان نے ایک شب ٹہل ٹہل کرتے تاروں بھرے آسمان کو فسردہ نگاہی سے دیکھتے ہوئے سوچا!

رات کی رویئوں اور خیالوں کے درمیان' جب لوگ گہری نیند سوجاتے ہیں تو میں جاگتا ہوں۔ اور سوچتا ہوں۔

کیا کبھی یہ بچھونا میرے لئے آرام دہ ہوگا' جس پر پڑا میں کروٹیں بدلتا ہوں۔ کیا اس دل میں وہ راست باز لمحہ دوام پائے گا' جس کی مجھے تلاش ہے 'کیا اس رات کی تاریکی میں 'اپنے بے آرام بچھونے پر لیٹا' میں جسے پوری سچائی سے سوچتا ہوں 'کیا وہ بھی میری طرف دیکھتا ہے۔ وہ، صبح جس کے اشارے کے بغیر طلوع نہیں ہوتی اور رات جس کے اذن کے بغیر چادر نہیں پھیلاتی۔ کیا شب کے اس پچھلے پہر وہ بھی میری طرح جاگتا ہے اور سوچتا ہے۔ کیا اسے بھی میری طرح نیند نہیں آتی۔ کیا اس نے بھی محبوب کے ہجر کا ذائقہ چکھ رکھا ہے' جو شہد سے بھی میٹھا لگتا ہے۔ کیا اسے بھی معلوم ہے 'کوئی میری خاطر جاگتا اور کروٹیں بدلتا ہے۔ وہ جس کی پلکوں سے نیند کی خوشبو اڑ گئی ہے۔ وہ جو اپنے وجود کی مٹی دونوں ہاتھوں سے اڑاتا ہے۔ اور تماشہ دیکھتا ہے۔ دور جو اس تاروں بھرے آسمان کی بساط بچھائے بیٹھا ہے 'کب متوجہ ہوگا؟ کب دیکھے گا؟

-----یہی وہ وقت تھا' جب اعوانوں کے اس دلیر سوچ رکھنے والے نوجوان کی ملاقات 'ایک جلسے میں' مولانا اللہ یار خان سے ہوئی' اور اس نے اپنا ٹوٹا ہوا دل شیخ کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیا۔ ٹھہراؤ کو موت اور حرکت کو زندگی سمجھنے والا' رک گیا' ٹھٹک گیا' سوچ میں پڑ گیا' شاید یہی وہ سایہ ہے' جہاں مجھے رکنا ہے۔ قیام کرنا ہے۔ پھر دھوپ کے لمبے سفر کی تھکاوٹ میلے لباس کی طرح اس نے اتار کر

رکھ دی۔ اور خود کو حوالہ محبوب کر دیا۔ اپنا کلی اختیار اس محبوب کو سونپ دیا' جو محبوب حقیقی سے ملاتا ہے۔

-----پھر کیا تھا' اول و آخر ذکر یار تھا' دنیا لطیفہ قلب سے آغاز ہوتی تھی اور اس کے بعد جو تھا وہ شوق ہی شوق تھا۔ حافظ عبدالرزاق صاحب بتاتے ہیں۔ اس نوجوان نے وقت بتانے والی گھڑی کا طریق بھی بدل دیا۔ اور مزاج بھی۔ یعنی وقت کو بھی اس نے اپنا تابع کر لیا۔ منٹوں والی سوئی زائد تھی وہ نکال دی۔ گھنٹے باقی رہ گئے۔ جو لطیفہ قلب سے سلطان الاذکار تک اس کڑے مجاہدے اور تزکیئے والے انسان کا ساتھ دیتے دیتے ہانپ جاتے' مگر پانچ پانچ گھنٹے ایک ہی سانس میں مسلسل ذکر کے بعد بھی جو تازہ دم ہوتا' شاداب ہوتا!

-----یہی شادابی اب شیخ کا جزو لاینفک ہے۔ یہی ان تھک مجاہدہ اور کڑی ریاضت ان کا اصول حیات ہے' جس پر وہ بڑی دلجمعی سے کاربند ہیں۔ بات ان کی آخر شب بیداری سے شروع ہوئی تھی اور ذرا آگے نکل گئی' اب دوبارہ وہیں سے سلسلہ جوڑتی ہوں۔ تو پچھلے چالیس برسوں سے راتوں کو جاگنے والا سلسلہ اب کچھ یوں دوام پا چکا ہے کہ محترم شیخ کو اول شب کی سیاہی رات لگتی ہے' باقی سارا وقت سحر کے کھاتے میں شامل ہو جاتا ہے۔ پہلے نوافل تہجد اور پھر فجر سے پون گھنٹہ قبل اجتماعی ذکر کا اہتمام ہر صبح صادق یوں ہوتا ہے' جیسے کبھی روز اول ہوا تھا۔ سفر ہو یا حضر' یہ معمول بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد نماز فجر اور پھر گھنٹہ ڈیڑھ آرام' ساڑھے سات بجے ناشتہ کے لئے منارہ روانہ ہونے تک وہ اپنے صبح کے معمولات سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ ناشتہ منارہ کرنے کے بعد وہ دس بجے تک اپنے آفس میں موجود ہوتے ہیں ایک خوبصورت اور حیرت انگیز بات جو میں نے دیکھی وہ یہ ہے کہ تمام ٹیلی فون کالز اور میل وہ خود دیکھتے ہیں۔ کالز جوان گنت

ہوتی ہیں، اندرون ملک اور بیرون ملک سے آنے والی تمام کالز کو وہ بڑی خوش دلی سے اٹینڈ کرتے ہیں۔ میل جو بلا شبہ سینکڑوں میں ہوتی ہے 'بقول شیخ' اگر ایک دن بھی میل نہ دیکھوں تو اگلے روز کام کا بوجھ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ ان کاموں کے لئے کوئی سیکرٹری کیوں نہیں رکھ لیتے' میرے ہی جیسے کسی نے شاید پوچھا تھا۔ جس کا جواب دیتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔ مجھ سے رابطہ کرنے والے' جب کسی تیسرے کو درمیان میں پائیں گے تو شاید ان کے بے دھڑک رابطے میں کچھ تکلف آجائے' وہ جھجھک جائیں۔ اس لئے کہ جب بات وسیلوں کے ذریعے ہونے لگے تو براہ راست کا لطف اور اپنائیت جاتی رہتی ہے۔ رہی میل کی بات' تو مجھے اچھا لگتا ہے' میں اپنے ہاتھ سے ان تمام لکھنے والوں کو جواب دوں' جو کسی نہ کسی معاملے میں مجھ سے مشاورت چاہتے ہیں۔ چاہے میں ایک کاغذ کے پرزے پر چند حرف ہی لکھوں' انہیں اس طویل مکتوب سے بہتر لگیں گے جو میرا سیکرٹری لکھے گا۔

یہی نہیں' اس کے علاوہ تمام ذاتی کام اپنے ہاتھ سے کرنے کے عادی ہیں گھر کے اندر کوئی ملازم ان کے گرد نہیں ہوتا' بیڈ روم سے کھانے کے کمرے تک' اور کھانے کے کمرے سے آفس تک' تمام معمولات وہ کسی کی مدد کے بغیر سر انجام دیتے ہیں۔ سوائے کھانا بنانے اور سرو کرنے کے! اور یہ کام ثمینہ کرتی ہے۔ ثمینہ جس کا تزکیہ اور مجاہدہ شاید اس کی عمر سے بھی بڑا ہے' جو نہ صرف جسمانی طور پر ہمہ وقت باوضو رہتی ہے' بلکہ روحانی طور پر بھی اتنی ہی صاف اور شفاف ہے۔

-----اجتماع کے دنوں میں گیارہ بجے لنگر کا کھانا تقسیم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد آرام کا وقت ہے' دو بجے ظہر کی اذان اور پھر نماز۔ حضرت جی' نماز کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرتے ہیں اور پھر زمینوں کا چکر لگانے باہر چلے جاتے ہیں' جہاں سے

عصر تک ان کی واپسی ہو جاتی ہے۔ عصر کے بعد دونوں فیملیز دارالعرفان آجاتی ہیں۔ اور یہ روٹین اس وقت سے چل رہی ہے' جب سے حضرت جی نے دارالعرفان میں مستقل رہنا شروع کیا ہے۔

"پہلے وہ دارالعرفان میں مستقل شفٹ نہیں ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز' ذکر اور اس کے فوراً بعد کھانا لگ جاتا ہے۔ دارالعرفان کے اندر شیخ کی رہائش گاہ کا سونا پن' چند گھنٹوں کے لئے دور ہو جاتا ہے' خاموش درودیوار سے آوازوں کا تال میل' اس وقت بہت اچھا لگتا ہے۔ شیخ کا خاموش حجرہ' ایک دم سے بھرے پرے گھر میں بدل جاتا ہے۔ جہاں بیبیاں' بیٹیاں' بیٹے بہوئیں اور پوتے پوتیاں' اپنے اپنے طریقے سے ان کی توجہ مانگ رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ پوری ذمہ داری اور محبت کے ساتھ' سب کی سنتے ہیں' مانتے ہیں۔ اور ان کے درمیان توجہ کی خوشبو تقسیم کر رہے ہوتے ہیں۔ اور میں دیکھتی ہوں' وہاں ہر ایک ان کی محبت سے نہال ہے۔ ہر ایک سمجھتا ہے وہ صرف اسی کے لئے ہیں۔ سب کے رازو نیاز انہی کے ساتھ ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ وہ سنیں گے۔ اور یقین کریں گے۔ تمام مسئلوں کو حل کریں گے' اسی لئے جب ان کو مسئلہ بتایا جاتا ہے تو مسئلہ' مسئلہ نہیں رہتا' حل بن جاتا ہے۔ سارے جہان کا بوجھ اٹھا کر لے جاؤ اور وہاں جا کر الٹ دو۔ اٹھانے والا یوں اٹھائے گا کہ بوجھ کو خبر تک نہ ہو گی وہ کہاں منتقل ہو گیا۔

-----عشاء کی نماز کے بعد کا وقت' خاموشی اور تنہائی کا ہوتا ہے۔ دارالعرفان کے اندر اور باہر کسی آواز کی گونج سنائی نہیں دیتی۔ آپ کو جاننے والے بتاتے ہیں کہ وہ وقت جناب شیخ پر مراقبات اور انوارات کا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ اتنے خاموش اور گم ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ کچھ دیر قبل گھر والوں میں جذبوں کی رنگا رنگی بانٹنے والی شخصیت یہی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں!
"الصوفی اذا نطق بان نطقہ من الحقائق وان سکت نطقت عنہ الجوارح بقطع العلائق" صوفی وہ ہے کہ جس کا کلام بیان حقائق ہے اور جس کی خاموشی میں اسکے اعضاء زبان حال سے قطع علائق یعنی فقر کی بات کر رہے ہوتے ہیں!!
-----اسٹڈی کے ریڈنگ روم کے باہر سفیدے کے درخت کے عین نیچے جلتے ہوئے ساٹھ پاور کے بلب کی روشنی دارالعرفان کی دیوار پر پڑ رہی ہے۔ سفیدہ ہل رہا ہے' شاخیں جھوم رہی ہیں۔ منارہ کے معتدل آب و ہوا والے موسم کی ہلکی خوشگواریت کا اثر اس کے ماحول پر بھی نظر آتا ہے۔ دارالعرفان میں زندگی تقریباً سو گئی ہے' کمرے کی کھڑکی سے نیچے نظر آنے والا گھر' صقارہ اکیڈمی کی ٹیچر روبینہ کا ہے۔ جو ابھی تک جاگ رہی ہے۔ اس کے شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آرہی ہے' جسے وہ اللہ ھو کی لوری سنا کر بہلا رہی ہے۔
اللہ ھو کی لوری' جو ہمارے ہاں اکثر مائیں سوتے وقت بچوں کو سناتی ہیں۔ اس توقع سے کہ بچے بہل جائیں گے' سو جائیں گے' اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بچے بہل بھی جاتے ہیں اور سو بھی جاتے ہیں۔ شاید انہیں وہ سفید پروں والا فرشتہ نظر آتا ہے جو آنکھوں میں ریشمی پروں کے لمس سے نیند بھر دیتا ہے۔ اور معصوم خوابوں کا جوبن ان کی نیندوں کو سونپ دیتا ہے۔ تو اسطرح اللہ ھو' ہماری زندگیوں میں اس وقت شامل ہو جاتا ہے' جب ہم اللہ کو جانتے بھی نہیں ہوتے۔ بعد میں نجانے کیا ہوتا ہے۔ کہ ہم یہ بھول ہی جاتے ہیں۔ کبھی اللہ ھو کی گولی کا نشہ نیندوں کو پلکوں پر بھاری کرتا تھا' اور خوابوں کا جوبن آنکھوں کے اندر انڈیلتا تھا۔ اسی لئے بعد میں ہمیں نیند کے لئے ویلیم اور اس جیسی دوسری مسکن دواؤں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اور ہم اس ضرورت کو حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں' جو بعد میں تمام عمر ہمیں اپنے پیچھے بھگا

بھگا کر مارتی رہتی ہے!

اس رات کی خاموشی میں سکون کی نرمی ہے۔ میں جاگ رہی ہوں۔ کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والی پکی اینٹوں کی اونچی دیوار' دیوار کے اوپر لگی ہوئی لوہے کی خار دار تاریں' تاروں سے باہر جھانکتی مرکری لائٹوں کی روشنی' اور روشنی کے دائروں سے ہٹ کر زمین کے سینے پر بچھی ہوئی سیاہ سڑک' سڑک پر ٹریفک کا ہلکا ہلکا شور اور اس شور کی وحشت سے دور' زمین کے سینے پر صدیوں سے موجود پہاڑوں کی قدیم خاموشی' خاموشی کے اندر ان کے رازوں کی طرح سانس لیتی نباتات کی زندگی' جو خدا کے رازوں کے شریک ہیں۔ جو آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں' زبان رکھتے ہیں مگر بولتے نہیں! وہ زندہ ہیں۔ اسی لئے تو نیالے پہاڑوں کی گود آباد ہے۔ سینے مالا مال ہیں۔ چہرے شاداب ہیں۔ "ایک مرتبہ ایک پرندہ حضرت صدیق اکبرؓ کے سامنے لایا گیا' آپؓ نے اسے ہاتھ میں پکڑا اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر فرمایا' اس وقت تک کوئی جانور شکار نہیں بنتا' اور کوئی درخت کاٹا نہیں جاتا' جب تک وہ تسبیح الٰہی کو ترک نہ کر دے"۔

------رات کی تاریکی میں تاروں کی مدھم روشنی میں' مجھے پہاڑوں پر اپنے ہی بوجھ سے جھکے ہوئے' تسبیح الٰہی کے زمزمے میں بہتے ہوئے' پودے' جھاڑیاں اور درخت نظر آ رہے ہیں' جو آخر شب کی بیداری کا سبب جانتے ہیں' جو اللہ ھو کے راز میں حیات ہے' کا شعور رکھتے ہیں' جنہیں بقا کا یہ بنیادی سبق آتا ہے۔ اور خوب آتا ہے۔ جبھی تو خاموشی ان کی خو ہے اور شب بیداری ان کا شیوہ ہے!!

نیچے ہلکی ہلکی آوازوں کی سرسراہٹ ہے۔ لیڈیز کے حصے میں بتیاں آہستہ آہستہ جلنا شروع ہو گئی ہیں۔ دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔ میں کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی ہوں۔ سوا دو کا وقت ہے۔ آخر شب جاگنے

والوں نے 'حاضری کا اہتمام شروع کر دیا ہے۔ غسلخانوں کے سامنے جاگو جاگو کا میلہ لگا ہے۔ اجتماع میں چونکہ 'پورے اڑھائی بجے بیداری سحر کا قاعدہ ہے' لہٰذا اسی کا آغاز ہو رہا ہے۔ نوافل تہجد اور قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہو کر پورے ساڑھے تین بجے 'اجتماعی ذکر ہے۔ جو شیخ کرائیں گے۔ اور محترم شیخ کے ساتھ ذکر کی کیفیت ہی کچھ اور ہے۔ اہل ذکر کہتے ہیں 'اگر شیخ کے ساتھ ذکر کی ایک نشست بھی میسر آجائے تو وہ اس ایک سال کے ذکر سے اچھی ہے۔ جو اکیلے بیٹھ کر کرنا ہے۔ اور پھر اجتماع کے دنوں میں' جب شیخ انوارات الٰہی سے چور چور ہوتے ہیں تقسیم کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ اس وقت تو صلائے عام ہے۔ جس کی جتنی استعداد ہے آئے اور لے جائے۔

-----اس رات میں 'دن کو تین بجے طلوع ہوتا دیکھ رہی ہوں۔ پورے دارالعرفان میں روشنی ہے۔ آوازیں ہیں۔ حرکت ہے۔ حرارت ہے۔ رات جو بھی تھی' جتنی بھی تھی تمام ہوئی۔ جاگنے والوں کی آنکھوں میں صادق طلب کا اجالا ہے۔ سورج ان کی پیشانیوں پر چمکتا ہے۔ انہیں اس اندھیرے سے کوئی واسطہ نہیں جو دارالعرفان کی چار دیواری سے باہر پڑا کہیں ہانپتا ہے۔ اس نے بھی بالآخر صبح ہونا ہے۔ ان کا ایمان یقین کی آخری حدوں تک پھیلا ہوا ہے۔

-----ایک شخص فقط ایک شخص' جس نے اس زمین کی تقدیر بدل دی' جہاں اب اللہ ھو کا زمزمہ ہمہ وقت بہتا ہے۔ دارالعرفان سے قبل وہ بھی تو اسی بے تدبیری اور بے برکتی کا حصہ تھی' جو اس جیسی دوسری زمینوں کی تقدیر ہے۔ جہاں ظلم ہوتا ہے 'کفر کے کلمات کہے جاتے ہیں۔ جہاں دنیا' دنیا اور صرف دنیا بوئی' کاٹی اور بیچی جاتی ہے۔ مگر وہ کہ جسے سنوار دیا گیا۔

ایک شخص فقط ایک شخص' جس نے ہزاروں' لاکھوں راندہ درگاہ لوگوں کو راہ

مفتی پر کچھ اتنے پیار سے لگا کہ ان کی راتیں دنوں سے اجلی ہو گئیں۔ان کی سمتیں درست ہو گئیں۔ھو کا زمزمہ ان کی سانسوں سے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگا۔اور وہ اندر باہر سے سنورنے لگے۔ سجنے لگے۔ یہ سجے بنے اجلے لوگ 'آخر شب حاضری کا جس سج دھج سے اہتمام کرتے ہیں' وہ دیکھنے کے لائق ہے۔وہ محبوب جو محبوب سے ملاتا ہے۔اسکی محبت انہیں ہر دم بھگوئے رکھتی ہیں۔وہ جب کچھ نہیں کرتے تو بھی نہال رہتے ہیں۔اور جب کچھ کرتے ہیں تو بھی نہال رہتے ہیں۔ عجیب بے غرض' بے نیاز لوگ ہیں یہ' عشق الٰہی میں پورے کے پورے ڈوبے ہوئے۔میں دار العرفان میں نصف شب جاگنے کی روایت کو دیکھتے ہوئی سوچ رہی ہوں۔جو جناب شیخ کے ساتھ جڑتے ہیں۔وہ سو نہیں سکتے۔اس لئے نہیں کہ ان کے بچھونے بے آرام ہو جاتے ہیں۔بلکہ اسلئے کہ ان کو اپنی مرضی سے آرام دہ بچھونوں کی آراستگی چھوڑ کر اٹھنا ہوتا ہے۔بھاری پلکوں' بوجھل آنکھوں اور کچی نیند کی شکستگی سے چور بدنوں کے ساتھ۔کہ یہی نفس کی پامالی کا راز ہے۔یہی آداب دوستی ہے۔

ایک ہی انسان ہوتا ہے' ہمیشہ ایک ہی' جو قوموں کی تقدیر بدل دیتا ہے۔انہیں نام و نسب عطا کرتا ہے۔انہیں شناخت دیتا ہے۔

ایک ہی انسان ہوتا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی' جو انسانیت کو گمراہی کی تاریکیوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ قوموں کو اجاڑ دیتا ہے۔انہیں بے ننگ و نام کر دیتا ہے۔اور ایک ہی انسان ہوتا ہے ہمیشہ ایک ہی۔جو خطۂ دل سے خطۂ جہاں تک سبھی کو محبتوں کے رنگ میں رنگتے چلا جاتا ہے۔فلاح جس کا قرینہ اور دعا جس کا شیوہ ہوتی ہے جو روحوں کی عالی مقاموں تک رسائی کا اہتمام کرتا ہے۔اور امن کے اونچے اور سچے گھر تک رہنمائی جس کا مقصد حیات ہوتا ہے۔

-----انٹرویو کیا ہے دراصل تو وہ مسائل ہیں' جو حل نہ ہوں تو آہستہ آہستہ

ایسے سوالوں میں بدل جاتے ہیں جو ذہن کو کبھی ہلکا نہیں ہونے دیتے' اور دل کو کبھی آزاد نہیں ہونے دیتے۔وہ سوالات صرف میرے نہیں' مجھ جیسے ان سب کے ہوتے ہیں' جنہیں شعور کا نکیلا کانٹا چبھتا ہے۔جو سوچ کی اذیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔آگہی جنہیں کچوکے لگاتی رہتی ہے۔اور راستہ جن کے سامنے کھلا نہیں' بند ہوتا ہے' جو آگے جانا چاہتے ہیں' مگر جا نہیں سکتے اور جنہیں رکنا بھی نہیں ہوتا۔جب میں انٹرویو کے لئے محترم شیخ کے آفس گئی تو Questionaire میرے ہاتھ میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔اور منی ٹیپ ریکارڈر میرے پاس تھا' انہوں نے اپنے آفس میں خوشدلی سے مجھے ویلکم کہا۔ٹیپ ریکارڈر آن کر کے ان کے سامنے رکھتے ہوئے میں نے پہلا سوال کیا۔اور اس کے بعد سوالات کا سلسلہ چلتا رہا' اس روز کئے ہوئے انٹرویو سے دو سوالوں کے جواب یہاں لکھ رہی ہوں' باقی انٹرویو کتاب میں موجود ہے۔

ایک سوال یہ تھا۔

وہ کونسا رنگ ہے' جسے اللہ کا رنگ کہتے ہیں۔

اللہ کریم ہے' اللہ ستار العیوب ہے' اللہ غفور ہے۔اللہ جبار بھی ہے۔اللہ قہار بھی ہے۔اگر انسان دوسروں کے لئے کرم کا باعث بن جائے۔محبتیں بانٹنے والا بن جائے۔اگر انسان دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کرے' احساس ہو اسے' دوسروں کو خوشیاں دینا چاہے۔اور جہاں ظلم ہو۔وہاں اللہ کے جبر و قہر کی تصویر بن جائے' جب تک ظلم رک نہ جائے۔افراد سے نہ لڑے۔بیمار سے نہ لڑے' بیماری سے لڑے ظلم سے لڑے' ظلم کو روک دے۔اگر یہ صورتحال بن جائے۔اللہ نے کہا۔

صبغة الله۔ یہ اللہ کا رنگ ہے۔و من احسن من الله صبغة۔اور اللہ کے رنگ سے خوبصورت رنگ کونسا ہو سکتا ہے۔وہ اوصاف باری'

ان کی جھلک' ان کی اپنی حیثیت کے مطابق آجائے۔ دیکھیں سورج روشنیوں کا منبع ہے۔ اک چھوٹا سا ٹکڑا شیشے کا ہے۔ منعکس تو کرتا ہے۔ سورج کو نہیں اک چھوٹی سی کرن کو تو کرتا ہے۔ بندہ ایسے ہی آئینہ بن جائے جمال باری کا!! پھر سوال تھا۔ واصفی کی دنیا کیسی دنیا ہوتی ہے۔ اس دنیا کے لوگوں کی پہچان کیا ہے۔ یہ لوگ' اپنے سج دھج سے' اپنے کردار سے' اپنی باتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان سے بات کہیں سے چھیڑو ناں' یہ ختم وہاں جا کر کرتے ہیں۔ دنیا کے کسی گوشے سے انہیں چلاؤ' انہیں آپ دوسری طرف چلاتے ہیں ان کی نگاہ اسطرف رہتی ہے۔ جہاں واصفی ہوتی ہے۔ یہ عجیب طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بڑے قیمتی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ پر سکون اور ایک مرکز پر جمے ہوئے ٹھہرے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ عبدالحمید عدم نے خوب کہا ہے۔

یہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

بہت مزے کے لوگ ہوتے ہیں' ایک پورا جہان ہوتا ہے ایک بندے کے اندر' موسموں کا تغیر و تبدل' بجلی' بارش' پانی' برستا ہے' بجلیاں کڑکتی ہیں' پھر بہار آتی ہے۔ پھول کھلتے ہیں۔ عجیب لوگ ہوتے ہیں یہ' ایک وقت میں بیٹھے آنسو بہا رہے ہوتے ہیں۔ دوسرے وقت میں بیٹھے نغمہ گا رہے ہیں۔ تیسرے وقت میں بیٹھے ناراض ہو رہے ہیں۔ چوتھے وقت میں بیٹھے منا رہے ہیں۔ عجیب سا ایک جہان ہوتا ہے ایک آدمی کے اندر ایک دنیا اور اس کا ہر رنگ موجود ہوتا ہے۔ ایک فرد کے اندر۔ بڑے قیمتی لوگ ہوتے ہیں یہ!

محترم شیخ نے ہر سوال کا اتنا مکمل بھرپور اور تشفی بخش جواب دیا کہ وہ سوال جو در حقیقت مسائل انسانی تھے' آہستہ روی سے حل ہوتے چلے گئے۔ ان کے کھانے کا

وقت قریب تھا۔اسلئے میں نے آخری چند سوال روک لئے 'آپ کھانا کھالیں'اس کے بعد وقت ہوا تو بات کرلیں گے۔ارے نہیں بھئی۔ کھالیں گے کھانا بھی۔کوئی سوال روکو مت 'چلنے دو۔تو اسطرح انٹرویو مکمل ہوا۔اب تمام جواب میرے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ تھے۔اور میں سوچ رہی تھی کہ انھیں کس طرح ان تمام اپنے جیسے لوگوں تک پہنچاؤں' جو ان سوالوں کی ضربوں سے پڑے کراہتے ہیں۔پھر جناب شیخ کے آفس سے باہر نکلتے نکلتے'اک ایسا فیصلہ میرے ہاتھ میں تھا جو قطعامیر انہیں تھا۔اس لئے کہ اس سے پہلے اتنی عجلت میں'اتنا اہم فیصلہ کبھی مجھ سے ہوا ہی نہیں۔میں تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو گھنٹوں سوچتی ہوں'اپنے آپ سے الجھتی ہوں'ایسے میں اندر قوت فیصلہ کا فقدان پاکر پریشان بھی ہوتی ہوں۔مگر اسکے باوجود ہاں اور نہ کے درمیان لٹکی رہتی ہوں۔تاآنکہ قدرت خود ہی کوئی نہ کوئی حل میرے ہاتھ میں پکڑا دیتی ہے۔سوچ اتنی اچانک اور فیصلہ کن تھی۔ اس نے مجھے ''نہیں'' کی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہ دی'اور میں نے سنا'میں حضرت جی سے کہہ رہی تھی'اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ پر کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔اچھی بات ہے'آپ لکھیں۔کھانا کھاتے ہوئے انہوں نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔مگر یہ ارادہ آپ نے پہلے تو ظاہر نہیں کیا' ثمینہ ہکا بکا ہو کر میری طرف دیکھ رہی ہے۔اس سے پہلے یہ ارادہ میرے پاس تھا ہی نہیں' یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ بھی میری طرح حیران ہے۔وہیں بیٹھے بیٹھے ان شعبوں کے متعلق جن میں حضرت جی کام کررہے ہیں۔میں ثمینہ سے موٹی موٹی معلومات لیتی ہوں اور ڈائری پر کتاب کے متعلق رف اسکیچ بنانا شروع کردیتی ہوں۔

اگلا سارادن حضرت جی کے ساتھیوں سے بات چیت میں گزرتا ہے۔جو اجتماع کے لئے دارالعرفان میں موجود ہیں۔حافظ عبدالرزاق صاحب'کرنل مطلوب

صاحب کرنل ابراہیم صاحب اور کرنل بشیر صاحب سے بڑی دلچسپ اور معلوماتی باتیں ہوتی ہیں۔ مختلف کاموں کے بارے میں انفارمیشن لینا شروع کی تو پتہ چلا' اس شخصیت کا پھیلاؤ تو' محبت کے پھیلاؤ کی طرح ہے' اور یہ پھیلاؤ' اپنے اندر وسیع کائناتیں سمیٹے ہے۔

اگر ان کائناتوں میں داخل ہو گئیں تو واپسی مشکل ہو گی۔ سوچ لو۔ اب کیا سوچنا' فیصلہ تو ہو چکا' سوچا تو فیصلے سے پہلے جاتا ہے' اور اگر فیصلہ ہی اپنا نہ ہو' تو پھر کوئی سوچے بھی کیا؟

وہ جس نے مجھے عشق سے مرصع کیا
وہ جو مجھے سونے نہیں دیتا
جب میں سوتی ہوں تو
میرا دل جاگتا ہے
وہ جو دل کے اندر ٹھاٹھ سے رہتا ہے
اس کا پتہ رات سے پوچھوں
یا دن سے
اے باد جمال' اے باد ملال
یہ کوئی حکایت نہیں
کہ حکایت کبھی اتنی دلپذیر نہیں ہوا کرتی
یہ روایت بھی نہیں
کہ روایتوں کی نفی ہی اثبات کا تعین ہوا کرتی ہے
اے محبت اپنی آنکھیں میری طرف سے پھیر لے
کہ میں گھبرا جاتی ہوں' پھر مجھ سے کچھ دیکھا نہیں جاتا

سوچا نہیں جاتا
وہ جس نے کہا تھا آ میں تجھے محبت دکھاؤں
وہ منصور حلاج
جو خود محبت دیکھنے نکلا تو دید کے بیابانوں سے آگے نکل گیا
اے باد کمال' اے باد ملال
اب اسکا پتہ ہتا کہ اس سے کہوں
بھلا کبھی محبت دیکھی بھی جا سکتی ہے
محبت کا تپ تو نہیں چڑھتا ہے یا نہیں چڑھتا
جب چڑھتا ہے تو اترتا نہیں
تپ کو دیکھنا بھلا کیسے ممکن ہے
آ کہ مجھے نگین کی طرح سینے میں رکھ
اور تعویذ کی طرح بازو پر باندھ
کہ میں بھی کامل ہو جاؤں
کہ میں بھی نفی ہو جاؤں!!!

O……O……O

www.QuranTafseer.net

الحمدللہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو وڈیو بیانات کو آپکی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراسن سکیں۔ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ ایپلیکیشن بھی موجود ہے

آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ ایپلیکیشن سرچ کر کے انسٹال کر سکتے ہیں۔

اس ویب سائیٹ اور ایپلیکیشن سے آپ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

1-مفسّر، مترجّم ومفکّرِ قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔ 2-مشکوٰۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہیں آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہیں پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیوز دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔4-اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبدالباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیوز سن سکتے ہیں۔5-حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمتہ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6-ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔ 7-پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8-اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیوز وڈیوز۔

9-سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریبا تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیوز فورا ایپلیکیشن اور ویب سائیٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔ آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائیٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میسج کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ 03235205255

☆ اکرم اعوان صاحب کشادہ دل اور لوگوں میں ان کی سطح پر ان میں مکمل مل جانے والوں میں سے ہیں۔ ان کی علمیت سے مرعوب ہونے کی بجائے ان کی دانش سے اپنائیت کی خوشبو آتی ہے۔ (منیر نیازی)

☆ میرا شروع دن سے یہ غیر جانبدارانہ اور ٹھوس نظریہ رہا ہے کہ اگر سلسلہ عالیہ کے ہم ضمیر میں سے اس وقت حضرت جی مدظلہ کو اوجھل کر دیا جاتا تو ہوئے حضرت جیؒ کے پاس باقی صرف مسکینوں کا ٹمٹماتا ہالے کرتے ہوئے درویشوں کی کھیپ اور حضرتؒ کے اعصاب مبارکہ پر مسائل کا بوجھ لادنے والی جسموں میں ڈھکی چھپی چند سادہ روحوں کے علاوہ شاید کچھ کم ہی دیکھنے کو ملتا۔ (مقبول احمد کھوکھر)

☆ مولانا نے اپنے شیخ کے مشن کو جاری ہی نہیں رکھا بلکہ اس میں انفرادیت سے ترقی کر کے اجتماعیت کی روح بھی پھونک دی۔ (پروفیسر عبدالرزاق صاحب)

☆ اکرم اعوان نے نعت لکھتے ہوئے نبی آخر الزماںؐ کے ساتھ ایسا تعلق نہیں بنایا کہ ان کی سیرت کو کسی آمر کا کردار بنا دیں۔ اکرم اعوان کی نعت میں نبی کریم کو خیرات بانٹنے والے اس سخی پیر کی طرح نہیں پیش کیا گیا جس کی امت اس کے سامنے گداگر نظر آتی ہو۔ (زبیر رانا)

☆ جتنی محبت ہم شیخ سے کرتے ہیں وہ دراصل اس محبت کا عکس ہوتا ہے جو شیخ ہمارے ساتھ کرتا ہے۔ (کرنل نسیم ملک)

☆ جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے تصوف اور سلوک کے مقامات کے بارے میں حضرت جیؒ جتنے واضح، وسیع اور جامع ارشادات کسی بھی صوفی نے بیان نہیں کیے ہیں۔ سلوک کے بارے میں اتنی ہمہ گیر معلومات اور خاص کر مقامات کے بارے میں پہلی بار دی گئی ہیں۔ (عبدالودود شاہ)

☆ حضرت کی جس صفت سے میں حد درجہ متاثر ہوا وہ آپ کا قرآنی آیات کی تشریح کا ایک منفرد طرز بیان تھا۔ (کرنل سلطان)

☆ میں نے کوئی شخص ایسا اپنی زندگی میں نہیں دیکھا جو اس درجے پر فائز ہو کہ اتنی اتنے ہزار آدمی جس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں' (موت پر بیعت) جان دینے کے لیے تیار ہوں، [illegible] فدائین کی طرح جس کے پاس آتے ہوں اور وہ Hundred percent نارمل زندگی گزارے۔ (ہارون [illegible] رشید)

☆ عشق و علم کا اشتراک ان کے خاک و خون میں مکمل مل گیا ہے کہ جب وہ بولتے ہیں تو دلوں کے بند دروازے کھولتے ہیں۔ ان کی گفتگو سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے لہو میں آرزو اور جستجو کے کئی رنگ اکٹھے کر دیتی ہے۔ (اجمل نیازی)

شام کے بعد پبلی کیشنز ۱۳۔ اے بہاول پور روڈ۔ لاہور

7237592-7310172 Fax: 7310115